PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

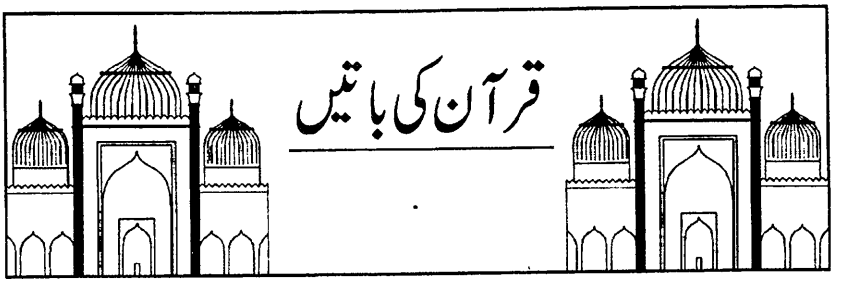

قرآن کی باتیں

☆ اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ سب ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں، سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوادے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تم کو ان کاموں سے باز رہنا چاہئے۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 90 سے 91)

☆ تو جس وقت تم کو شام ہو اور جس وقت صبح ہو اللہ کی تسبیح کرو یعنی نماز پڑھو اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی تعریف ہے اور تیسرے پہر بھی اور جب دوپہر ہو اس وقت بھی نماز پڑھا کرو۔ (سورۃ روم 30 آیت 17 سے 18)

☆ اے پیغمبر جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے اللہ ان سے خوش ہوا۔ اور جو صدق و خلوص ان کے دلوں میں تھا، وہ اس نے معلوم کیا۔ تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی اور بہت سی نعمتیں جو انہوں نے حاصل کیں اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (سورۃ فتح 48 آیت 18 سے 19)

☆ اور جس نے اللہ کی ہدایت کی رسی کو مضبوط پکڑ لیا وہ سیدھے رستے لگ گیا۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 101)

☆ اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے اور بری باتوں سے منع کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 71)

☆ جو اللہ کے اقرار کو مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جس چیز یعنی رشتہ قرابت کے جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو قطع کئے ڈالتے ہیں۔ اور زمین خرابی کرتے ہیں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 27)

☆ اور تمہارے لئے چارپایوں میں بھی عبرت اور نشانی ہے کہ جو ان کے پیٹوں میں ہے اس سے ہم تمہیں دودھ پلاتے ہیں اور تمہارے لئے ان میں اور بھی بہت سے فائدے ہیں اور بعض کو تم کھاتے بھی ہو اور ان پر اور کشتیوں پر تم سوار ہوتے ہو۔ (سورۃ مومنون 23 آیت 21 سے 22)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 22 شمارہ نمبر 2 نومبر 2020ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

مینجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/90 روپے

سالانہ قیمت -/1500 روپے

ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ڈر ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہوسکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

خالد شاہان — 18
شیطانی حویلی
دل دہلاتی ......اور تہلکہ مچاتی ......ایک عجیب وغریب آسیبی اور......خونی ......کہانی

خلیل جبار — 39
جنات کا بسیرا
خوف کے افق ......پر تہلکہ مچاتی اور دلوں پر سکتہ طاری کرتی ......خوفناک ......کہانی

ایس امتیاز احمد — 43
حویلی کا آسیب
حقیقت سے انکار کرنے والے ایک نوجوان کی داستان حیرت جو اچنبھے میں ڈال دے گی

رضوان علی سومرو — 49
بند دروازہ
اپنی من مانی کرتی ایک شخص کی دل گرفتہ دل شکستہ ......ناقابل فراموش ......کہانی

ایم اے راحت — 62
آسیب
کیا یہ حقیقت ہے کہ......جادو ٹونا سر چڑھ کر بولتا ہے، اپنی نوعیت کی شاہکار کہانی

صباشاہ بخاری — 86
بھیانک مخلوق
دل و دماغ پر ......سکتہ کرتی اور لرزہ بر اندام کرتی ہولناک ......خونی ......کہانی

مونا شہزاد — 91
آشنا
نوجوان سے پوچھا گیا مرنے سے پہلے تمہاری کوئی آخری خواہش ہے تو بتاؤ، خونی کہانی

راشد نذیر طاہر — 100
جہنمی دروازہ
رات کے اندھیرے میں جنم لینے والی داستان جو کہ پڑھنے والوں پر لرزہ طاری کردے گی

مریم فاطمہ — 121
قلعے کا بھوت
ایک بھوت کی کارستانی......رات کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ باہر نکلتا اور لوگوں کو دبوچ لیتا

عنیزہ فضل داد — 127
بھوت بنگلہ
خوف کے سمندر میں غوطہ زن ایک نادیدہ وجود کا شاخسانہ......جو کہ بہت......دلیر تھا

ایڈیٹر وپبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

سید محسن کاظمی — 131
جنات کا احسان
حقیقت پر مبنی ایک سبق آموز کہانی جو کہ اپنی مثال آپ ہے ...... پڑھ کر ...... دیکھیں

عثمان غنی خان — 134
ٹائم پاس
نئی نسل کی چاہت ...... کے عین مطابق دل کو خوش کرتی ...... خوبصورت ...... کہانی

رابعہ آفرین — 159
بھیانک حقیقت
اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے دل گرفتہ اور دل فریفتہ ذہن کو مبہوت کرتی کہانی

شہزاد خان — 162
نوبل کاز
حقیقت سے چشم پوشی ٹھیک نہیں اور جو ایسا کرتے ہیں وہ گھاٹے میں ...... رہتے ہیں

ناصر محمود فرہاد — 180
بددعا
ایک ایسی کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو حیران ہی نہیں بلکہ پریشان بھی ... کردے گی

حافظ مون بخاری — 189
آسیبی میمنا
ڈراؤنی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ناقابل یقین برسوں یاد رہنے والی کہانی

مظہر الحق علوی — 192
موت کی سرگوشی
ایک ایسے ...... شخص کی داستان حیرت جو مرنے کے بعد تابوت ...... سے نکل آیا تھا

شیخ معین اختر — 213
پرچھائیاں
ایک ایسی حقیقت جسے دل و دماغ کسی صورت قبول نہیں کرتا تھا، مگر یہ حقیقی واقعہ ہے

ادارہ — 221
قوس قزح
قارئین کے بھیجے گئے اشعار جنہیں قارئین بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں ......

ثناء شیخ — 226
تین پتی
ایک پراسرار لوک گیت جس سے آسمان لال اور آندھی طوفان کی صورت اختیار کرلیتی تھی

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

خطوط

اللہ رکھا چوھدری ہارون آباد سے،السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،امید ہے ڈرڈائجسٹ کی انتظامیہ سمیت سب خواتین و حضرات خیریت سے ہوں گے اور خوب زندگی کو انجوائے کررہے ہوں گے۔شمارہ ہاتھ میں آتے ہی پہلی نظر سرورق پر پڑی اور جہاں سالگرہ نمبر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ پیارے سے ڈرڈائجسٹ کو میری طرف سے بھی سالگرہ مبارک ہو میں دو تین سال سے خاموش ہوں لیکن اس بار سوچا کہ سالگرہ کے ساتھ انٹری اچھی رہے گی اور شاید جگہ بھی مل جائے۔خطوط کی محفل خوب جمی ہوئی تھی۔سب کے تبصرے پڑھ کر خوشی ہوئی سب نے کمال کا لکھا۔''پرانا اسکول'' سکندر حبیب صاحب کمال کردیا بہت عمدہ کہانی لمبی ضرور تھی لیکن کہانی نے بور نہیں ہونے دیا۔ویل ڈن۔خلیل جبار جب بھی لکھتے ہیں کمال کردیتے ہیں اس بار''جنگل کا آسیب'' پڑھ کر بہت اچھا لگا منظر نگاری خوب کی۔''زندگی'' رابعہ آفرین لاجواب تحریر ویل ڈن۔''نیلا بندر'' نیلے بندر کے کارنامے پڑھ کر حیرانگی سے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔''مہلک مرض'' احسان الحق یار کیا لکھ دیا؟ سچ میں بہت عمدہ تحریر لکھی میری دعا ہے ایسے ہی لکھتے رہیں اور چھائے رہیں۔ایک شاہکار ناول جس کا ہر ماہ شدت سے انتظار رہتا ہے ارشد نذیر طاہر صاحب کمال لکھ رہے ہیں ناول کا نام ہی ایک ایسا شاہکار نام ہے کہ جو نام دیکھتا ہے وہ ''جہنمی دروازہ'' ضرور پڑھتا ہے۔ارے واہ ماشاء اللہ روبینہ عبدالقدیر آپی آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور کہانی پڑھ کر حیرانی ہوئی اتنی خوفناک تحریر زبردست بہت سی داد اور دعائیں۔''موت کی سرگوشی'' مظہر الحق علوی زبردست ہے۔شہزاد خان پیارے آپ نے دعوت نہ دی لیکن میں خود آگیا چلیں کوئی بات نہیں سرپرائز سمجھیں میری انٹری کو۔''بھٹکتی روح'' یار آپ خوفناک منظر نگاری خوب کرلیتے ہو۔یہ تحریر بھی زبردست رہی۔''آخری وعدہ'' زمرخان ویل ڈن۔''خونی سڑک'' رضوان آپ کی تحریر پڑھ کر مجھے بھی آپ کی تحریر پڑھ ایک سڑک یاد آگئی جب ہاف ہوتی تھی تو میں اس سڑک سے گزر کر دادا جان کو کھانا دینے جاتا تھا۔آخری کہانی ''ایلومیناٹی'' بھی زبردست رہی اور ہوتی بھی کیونکہ کہ یہ عثمان غنی خان نے لکھی اور کمال لکھی ہے۔دل خوش ہوگیا پیارے لکھتے رہو۔ اب چاہتا ہوں اجازت ان شاءاللہ اگلے ماہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضری دوں گا تب تک کے لئے خدا حافظ۔

☆☆اللہ رکھا صاحب: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم،آپ کا اچھا تجزیہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی،آپ کو ڈرڈائجسٹ اچھا لگتا ہے،اس کے لئے اور آئندہ ماہ بھی خط لکھنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں،اگر کہانی لکھتے ہیں تو کہانی لکھ کر ارسال کردیں۔نوک پلک سنوار کر شائع کردی جائے گی۔

ظہیر ملک ہارون آباد سے،السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ ایڈیٹر صاحب امید ہے آپ اور آپ کی تمام ٹیم بخیر وعافیت ہونگے میں ڈرڈائجسٹ کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں لیکن کبھی تبصرہ یا کہانی نہیں دی وجہ کچھ لکھنا بھی نہیں آتا اور کچھ یہ ڈر کہ پتہ نہیں شائع بھی ہوگا یا نہیں لیکن اس دفعہ مارکیٹ گیا اور سوچا چلو یار قسمت آزمائی کرلیتے ہیں اس لیئے تبصرے سے شروعات کررہا ہوں امید ہے آپ میرے لکھے گئے چند الفاظ ضرور شامل کریں گے میں بالکل نیو رائٹر ہوں لکھنے کی کوشش کررہا ہوں تو غلطی کوتاہی معاف کیجئے گا۔جی باتیں بہت ہوگئیں اب آتے ہیں تبصرے کی طرف سرورق کی بات کریں تو بہت اچھا لگا جسے دیکھ کر خوف آرہا تھا۔قرآن کی باتیں تو ہمیشہ عمدہ ہوتی تھیں اس بار بھی دل کو منور کیا ماشاءاللہ بہترین سلسلہ ہے اللہ تعالی ہمیں قرآن پاک پڑھ کر اس پہ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔خطوط کی محفل ہماری پسندیدہ محفل ہوتی ہے جس میں قارئین کرام اور مصنفین گفت وشنید کرتے ہیں خالد علی صاحب نے عمدہ باتیں لکھیں ماشاءاللہ اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر عطا کرے آمین۔خطوط میں تمام خط بہت عمدہ لکھے گئے جن میں ہما خان، کائنات رشک تنویر،بلقیس خان،عثمان غنی خان،ضرغام محمود،عاصمہ خان،ایم عبدالوہاب،عمیرہ فرمان،امرحہ خان،انعم شاہ حسین،ہاشم محمد خان،کشف حسین،خرم عباس،محمد اویس بخاری،ماہ نور شاہ،مہرینہ غلام علی،مسز وجاہت حسین،شبینہ حسن،ایس حبیب خان،ماریہ مسعود،نثار فاطمہ،رابعہ آفرین،ایس امتیاز احمد،محمد عثمان اشرف،عامر شہزاد،اسامہ عزیز،محسن عزیز حلیم اور محمد اویس بلوچ صاحب آپ سب نے خوبصورت خط لکھے کچھ احباب کی سیاسی گفتگو تھی لیکن اس کے علاوہ آپ رسالے پر دھیان دیں کہانیوں پر تبصرے کریں تو امید ہے رائٹرز کی حوصلہ افزائی ہوگی خیر بہت اچھے خطوط تھے آپ تمام احباب کے،اب مزید آپ کے خطوط پڑھنے کا شرف حاصل

ہوگا، پھر بڑھے فہرست کی جانب جو چمکتے ہوئی ادبی ستاروں سے مزین تھی ماشاءاللہ کچھ نام جانے پہچانے بھی تھے جیسے شہزاد خان بھائی جن کی کہانی بھٹکتی روح شامل اشاعت ہے ماشاءاللہ پیارے بھائی آپ جہاں بھی جاتے ہو چھا جاتے ہو خوفناک کہانی لکھنے کا ہنر تو کوئی آپ سے سیکھے اللہ مزید ترقیاں دے آپ کو۔ خونخوار بلیاں مرزا صہیب بھی ویلڈن۔ پرانا اسکول شمارے کے ابتدائی صفحات پر مزین بہترین اور سب سے خوفناک اور دل دہلا دینے کہانی شروع سے لے کر آخر تک کمال رہی، کہانی کے لئے بہت سی داد۔ جنگل کا آسیب محترم خلیل جبار صاحب کی کہانی بھی عمدہ تھی لیکن کچھ خاص نہ لگی زندگی رابعہ آفرین صاحبہ کی کہانی بھی درد سے بھرپور عمدہ تھی، نیلا بندر محترم ناصر محمود فرہاد صاحب ماشاءاللہ بہترین کہانی تھی آپ کی۔ مہلک مرض محترم احسان الحق صاحب ویلڈن خوبصورت کہانی۔ قوسِ قزح بہترین سلسلہ ہے ماشاءاللہ سب کی شاعری قابل داد تھی گڈ ورک شعراء حضرات اللہ مزید ترقیاں عطا کرے۔ ایلو مینائی محترم عثمان غنی خان صاحب کو پہلی دفعہ پڑھ رہا ہوں ماشاءاللہ بہترین کہانی ہے آپ کی گڈ ورک ویلڈن۔ اب اجازت چاہوں گا امید ہے میرا پہلا تبصرہ پسند آئے گا اپنا اپنے پیاروں کا خیال رکھیں اللہ نگہبان۔

☆☆ظہیر صاحب: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، دل کی گہرائی سے لکھا ہوا تبصرہ پڑھ کر اچھا بلکہ بہت اچھا لگا، امید ہے آئندہ ماہ بھی دل سے لکھا ہوا تبصرہ ضرور ارسال کریں گے۔

کاشف عبید کاوش بگرام سے، السلام علیکم سب سے پہلے تو ڈرڈائجسٹ کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے 22واں سالگرہ مبارک ہو، ادارے سے گزارش ہے کہ میرا خط من وعن شائع کریں آپ کو بتاتا چلوں کہ میں اور ڈرڈائجسٹ تقریباً ہم عمر ہیں۔ کافی عرصے بعد ڈرڈائجسٹ سے دوبارہ رشتہ جڑا ہے امید ہے سب خوش آمدید کہیں گے۔ دوبارہ رشتہ 2020 کے اوائل میں جڑا تھا مگر عالمی وبا کی وجہ سے خط نہیں لکھ سکا ہاں یاد آیا سب قارئین اور رائٹرز 2020 کے ہولناکیوں مثلاً کرونا، بارش اور سیلابوں میں محفوظ ہوں گے اگر کسی کا کوئی مالی یا جانی نقصان ہوا ہے تو خدا ان کی مدد فرمائے اور آئندہ ہمیں اس طرح کے حالات سے محفوظ رکھے۔ مجھے نمبر (2019) کا شمارہ چاہیے پلیز اگر کسی کے پاس ہے تو ادارے کے ذریعے مجھ سے رابطہ کرلیں میں اس دوست سے خرید لوں گا۔ سالگرہ نمبر اور کچھ گزشتہ شمارے ادارے سے منگوائے تو پتہ چلا کہ کچھ پرانے دوستوں کا رابطہ ڈرڈائجسٹ سے ختم ہو چکا ہے جبکہ ساتھ یہ خوشگوار تبدیلی بھی محسوس کی کہ کچھ نئے پڑھنے والے اور نئے رائٹرز حضرات بھی جڑ چکے ہیں جو کہ اچھی بات ہے۔ باقی کا تو نہیں پتا مگر انشاءاللہ میرا رشتہ بطور رائٹر اور قاری اب ڈر سے جڑا رہے گا۔ کتاب ''خوفناک کہانیاں'' میں میری کہانی شامل کرنے کا بہت شکریہ، اب کچھ دوستوں کا ذکر کروں سب سے پہلے محمد قاسم رحمان صاحب بھی غائب ہیں یار بہت یاد آرہے ہو نمبر تو تمہارا بند ہے ہی مگر فیس بک سے بھی غائب ہو۔ طاہر اور نادر شاہ شجاع آباد والوں کا بھی رابطہ بند ہے، پلیز واپس آجائیں ڈرڈائجسٹ میں محمد خالد شاہان صاحب صادق آباد والے کا بھی میرے ساتھ کچھ نامعلوم وجوہات کی بنا پر دوستی ختم ہوگئی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ میری اور کچھ دوسرے افراد کی پرزور گزارش پر ڈرڈائجسٹ سے جڑے تھے۔ ابوہریرہ بلوچ اور ندیم عباس صاحب بھی غائب ہیں۔ پشاور سے عثمان غنی خان صاحب، جناب آپ کا بہت شکریہ دونوں عیدین پر اور جشن آزادی پر آپ کا میسج مجھے موصول ہوا تھا شکریہ، مجھے یاد کرنے کا شکریہ مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ ڈرڈائجسٹ میں اتنے معروف رائٹر بن گئے ہیں کہ اب آپ کی کہانیاں ڈائجسٹ میں قسط وار شائع ہو رہی ہے۔ خیر زور قلم زیادہ ہو۔ بلقیس خان صاحبہ آپ کو یاد ہوگا آپ سے بھی میری کافی دفعہ پہلے فیس بک میں بات ہو چکی ہے آپ اب تک ڈائجسٹ سے جڑی ہیں جان کر اچھا لگا اکتوبر کے شمارے میں قرآن کی باتوں سے ہوتا ہوا فہرست کو ایک نظر دیکھ کر خطوط میں پہنچا خطوط میں کچھ دوست اپنی کہانی شائع ہونے کی خوشی منا رہے تھے۔ دوستوں کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔ قسط وار کہانیوں میں جہنمی دروازہ ابھی نہیں پڑھی مگر موت کی سرگوشی تو واقعی ایک خوبصورت کہانی ہے، پہلی کہانی ابتدائی صفحات پر پرانا سکول پڑھی، اچھی کہانی تھی جنگل کا آسیب ایک بیکار کہانی، مہلک مرض موجودہ حالات کے مطابق ایک اچھی تحریر جبکہ تتلی ایک بے کار سی کہانی تھی، خونی پیاس اور کوٹھری کا جن کچھ خاص تاثر نہ دے سکی۔ زندگی کا ڈر ایک اعلیٰ پائے کی کہانی تھی، رقص اجل بالکل ڈرڈائجسٹ کے معیار کے عین مطابق اچھی کہانی تھی بھٹکتی روح، جیل اور موت ایک سایہ بھی میرے خیال سے اچھی کہانیاں تھیں، آسیبی بلی واہ ایس امتیاز احمد صاحب نے کمال کر دیا یہ کہانی ابتدائی صفات ہونی چاہیے تھی۔ خونخوار بلیاں ایک بیکار جبکہ کہ اندھیری رات کا مسافر نے دل جیت لیا اب ضرغام محمود اور ایس امتیاز احمد صاحب کو قسط وار کہانیاں لکھنی چاہیے۔ آخری وعدہ ایک خوبصورت سی تحریر ثابت ہوئی، ایسی کہانیاں

کبھی کبھی شائع کردیا کریں۔ خونی سڑک میں میرے ہم نام کاشف نے تو دل کا میلہ لوٹ لیا، درندگی واقعی ایک اچھی کہانی تھی مگر میں سچ کہوں تو ڈراؤ ڈائجسٹ کے معیار کے مطابق بالکل نہیں تھی، انتقام نے بھی اچھا تاثر دیا۔ اشعار اور غزلیں اچھی رہیں۔ آخر میں ایلومیناٹی پڑھی، کہانی کا نام جس طرح تھا کہانی اس طرح ثابت بالکل نہ ہوئی، لیلیٰ اور اس کے نام والے گانے سن کر ہنسی روکنا مشکل تھا۔ لیکن بہرحال کہانی اچھی تھی۔ عثمان صاحب ذرا کوشش اور کرلیتے، باقی شہزادہ چاندزیب عباسی صاحب غائب ہیں اور عمران قریشی بھی یہ دونوں میرے پسندیدہ رائٹرز ہیں میرے خیال سے میں نے شمارے پر اپنی طرف سے تبصرہ کرکے بہت سے رائٹرز پر اعتراض کیا مگر میرے خیال سے یہ تنقید برائے اصلاح تھی۔ اب آئندہ میں اسی طرح تبصرہ کروں گا اگر کسی کو میرے اظہار خیال سے مسئلہ ہے تو مجھے کچھ کہنے کے بجائے کوشش کرکے اپنے قلم میں نکھار لایا جائے۔ باقی ادارے کو میری کہانیاں جلد موصول ہوجائیں گی، اس کے ساتھ ہی تمام عالم اسلام اور ڈر ڈائجسٹ کے لیے دعا گو ہوں۔

☆☆ کاشف صاحب: ایک طویل عرصہ بعد ڈر ڈائجسٹ میں شامل ہونے پر شکریہ بلکہ بہت بہت شکریہ، کاشف صاحب ہر آدمی کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر کہانی ہر کسی کو پسند آجائے، خیر حسب وعدہ آپ کے تبصرہ کا آئندہ ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔ Thanks۔

نعیم بخاری آکاش اوکاڑہ (قطر) سے، السلام وعلیکم میں امید کرتا ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ ڈر ڈائجسٹ کے ساتھ دلی رفاقت کبھی بھی ختم نہیں ہوسکتی ہے۔ جناب میں نعیم بخاری آکاش ہوں اور ڈر میں اکثر اوقات کہانیاں لکھتا رہتا ہوں۔ لیکن کچھ عرصہ سے میں کام کے سلسلے میں قطر آیا ہوا ہوں اور ڈر باقاعدگی سے نہیں پڑھ سکا۔ محترم میری ایک کہانی آپ کے پاس تھی جو شاید ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے اور اگر وہ شائع ہوچکی ہے تو پلیز شمارے کا بتادیں کس ماہ شائع ہوئی ہے پلیز۔ میں ڈر کی دن دگنی رات چگنی ترقی کے لیے دعا گو رہوں گا۔

☆☆ نعیم بخاری صاحب: خط لکھنے اور خیر خیریت معلوم کرنے اور ساتھ ہی کہانی کا پتہ کرنے کے لئے شکریہ، دراصل میرے ذہن میں تھا کہ آپ دوسری کہانی ارسال کریں تو مہربانی ہوگی، کیونکہ میری یہ بھی کوشش تھی کہ ایک کے بعد دوسری شائع ہوتی رہے۔ خیر آئندہ ماہ کہانی ''نمبر 19'' شائع ہوجائے گی۔ اور یہ بھی قوی امید ہے کہ نئی کہانی ارسال کردیں گے۔ Thanks۔

ذیشان سمیر گلاب ٹاؤن سے، اکتوبر کا شمارہ اس بار جلدی ملا، دل خوش اس لیے ہوگیا، کیونکہ سالگرہ نمبر تھا، خطوط کی محفل میں اچھے خطوط تھے۔ ایس حبیب خان سالگرہ مبارک ہو، اور ڈر کو بھی ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، بلقیس خان اچھے تجزیئے کے ساتھ چھا گئی، عثمان غنی خان بھی ملک کے حالات پر تبصرہ فرماتے نظر آئے، ویلڈن، اللہ ضرغام محمود کو صبر و تحمل عطا فرمائے، پرانا اسکول نے خوب رنگ جمایا۔ زندگی کا ڈر نے بھی خوب رنگ جمایا۔ زندگی بہت اچھی سٹوری لکھی ہے۔ کالی مجھے بے حد پسند ہے۔ تتلی یہ جاندار و شاندار تحریر ہمیشہ یاد رہے گی۔ سچ یا وہم کہانی کو دل سے سراہا۔ انتقام بے ربط سی تحریر تھی۔ محبت کا سایہ جلد بازی میں ختم کردی۔ خونی سڑک پسندیدہ کہانی رہی۔ آسیبی بلی کہانی بھی بے حد پسند آئی۔ رقص اجل بے حد پسند آئی۔ اور ایلومیناٹی تو عثمان غنی خان کی اس ماہ کی لاجواب تحریر تھی۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ سب پر اپنی رحمت نازل کرے اور سب کو زور قلم اور دے۔ (آمین)

☆☆ ذیشان سمیر صاحب: دل و جان اور محبت سے لکھا ہوا خط پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا، آپ کی تحریر دل میں اتر گئی، خوبصورت خط بار بار پڑھا تب کہیں جاکر دل کی تسکین ہوئی، آئندہ ماہ بھی خوبصورت خط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ Thanks۔

محبوب خان تونسہ شریف سے، اکتوبر ماہ کا ڈر جلد مل گیا، قرآن کی باتیں، ہمیشہ کی طرح سب سے بہترین رہیں، کہانیوں میں اس بار بھی کچھ ریگولر لکھاریوں کی تحریریں موجود تھیں، سب سے پہلے خطوط کی بات کرتے ہیں۔ بلقیس خان آپ نے کمال کا تجزیہ لکھ کر سب کا دل گویا جیت ہی لیا ہے۔ ایس حبیب خان، سالگرہ مبارک ہو۔ عثمان غنی بھائی، میں آپ کا ریگولر ریڈر ہوں، آپ کی کوئی بھی کہانی مسڈ نہیں کرتا ہوں، ڈر کی محفل میں سب دوستوں کو خوش آمدید.....! سب کو سلام، آپ سب کے خطوط بہت خوبصورت تھے۔ بہت پسند آئے۔ پہلی کہانی پرانا اسکول اچھی کہانی تھی۔ زندگی بہت بہت بہت اچھی کہانی ہے۔ تتلی بے حد اچھی، عمدہ، اور پیاری تحریر ہے۔ سچ یا وہم کا اینڈ خراب کردیا۔ جنگل کا آسیب بے حد مزے دار انوکھی تحریر تھی، آخری وعدہ کی کیا بات ہے، بے بس وجود پڑھ کر مزہ آگیا۔ رقص اجل بہت عجیب تحریر لکھی ہے۔ محبت کا سایہ پسند نہیں آئی۔ خونخوار بلیاں بہت خوبصورت کہانی ہے۔ آسیبی بلی واقعی

بہت زبردست آمیزنگ کہانی تھی، آخری صفحات پر موجود ایلومینائی، میرے موسٹ فیوریٹ رائٹر کی تحریر ہے، جس کو میں نے بہت دل سے پڑھا۔ ویلڈن، پہلی بار کچھ یونیک سی کہانی تحریر کی ہیں، جو سالگرہ نمبر کو چار چاند لگا گئی۔ وسلام۔

☆☆محبوب صاحب: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید خط لکھنے، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی دلکش تجزیہ کے لئے شکریہ قبول کریں، آئندہ خط لکھنا نہ بھولئے گا۔

عبدالرئوف ہائی وے تارو جبہ سے، السلام علیکم! اکتوبر کا سالگرہ نمبر جلدی مل گیا، ٹائٹل اچھا تاثر دے رہا تھا، قرآن کی باتیں دل پذیر ہیں، کہانیوں کی فہرست دیکھی، پھر خطوط کی محفل میں آ گئے۔ عثمان غنی خان بھائی جو کچھ بھی کہا، بس اللہ سب کو ہدایت دے، بلقیس خان جو بھی لکھا اچھا لکھا اور بالکل درست تجزیہ کر دیا، اللہ سب سے بڑا پلانر ہے۔ پہلی تحریر پرانا اسکول کافی اچھی لگی، مہلک مرض احسان صاحب کی یونیک کہانی تھی، بے بس وجود بھی اچھی لکھی تھی۔ کالی کہانی ٹھیک تھی۔ نیلا بندر پسندیدہ تھی، زندگی کہانی بالکل بے مزہ تھی، تتلی عمدہ اسٹوری تھی، سچ یا وہم ڈر کے عین مطابق تھی۔ زندگی کا ڈراگر چہ ڈراؤنی نہیں، مگر میری من پسند رہی۔ رقص اجل کہانی پسند آئی، بھٹکتی روح لکھاری، بہت بہت داد کا مستحق ہے۔ خونی سڑک بہت امیزنگ اسٹوری تھی، ورنہ گی بس گزارہ لائق کہانیوں میں یہ کہانی شامل ہے۔ انتقام اچھی کہانی لگی۔ آخری وعدہ بھی اچھی ہے۔ اور آخری کہانی، آخری صفحات پر لگی ایلومینائی بے حد پسند آئی، عثمان غنی خان بھائی بالکل فریش موضوع پر قلم خاص انداز میں چلایا، روانی میں پڑھی، ایک بار آپ پھر سے بازی لے اڑے ہیں۔

☆☆عبدالرؤف صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے شکریہ قبول کریں، آپ کا خط پڑھ کر دل بہت خوش ہوا، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

ابرار بشیر یونی ٹاؤن سے، السلام علیکم ڈرڈائجسٹ اکتوبر کا جلدی مل گیا، اس ماہ کا ٹائٹل کافی شاندار تھا۔ خطوط میں بلقیس خان، کا خط بے حد جاندار تھا، انہوں نے جو کچھ لکھا تھا، لوگ آج بھی اسی بحث مباحثے میں پڑے ہوئے ہیں، آیا کرونا تھا بھی یا نہیں، کیونکہ پاکستان کے لوگ تو سیلاب کا سامنا نہ کر سکیں، تو بیماری کا مقابلہ کیسے کر پائیں گے؟ عثمان غنی خان پلیز بڑا تبصرہ لکھا کریں۔ سب سے پہلے فہرست میں عثمان غنی خان کو ڈھونڈا۔ وہ مل گئے، تو ایلومینائی، عثمان غنی خان کی سب سے پہلے پڑھی۔ کہانی میں لیلیٰ کا کردار اچھا لگا، لو اسٹوری ہونے کے باوجود دل سے انجوائے کی، قیس اور لیلیٰ ایک دوسرے کو اچھا وقت دیا۔ دجالی پیروکاروں کا نقاب اس کہانی نے اتار کر رکھ دیا۔ ویلڈن عثمان غنی خان، خونی سڑک دل سے پسند آئی، محبت ایک سایہ نیو انداز میں طرز تحریر کی تھی۔ زندگی کا ڈر بالکل بھی بار نہیں تھی، مگر اچھی تھی، چیل پسند آئی، آسیبی بلی بھی خاص تحریر ہے، زندگی پسند نہیں آئی۔ مجھے بے بس وجود پسند نہ آسکی، تتلی بیسٹ تھی، کالی میں بھی معاشرتی تحریر تھی، سچ یا وہم یہ اچھی کہانی تھی۔ انتقام بے حد پسند آئی۔ آخری وعدہ اچھی کہانی ہے۔ کھوٹری کا جن وہی روایتی سی تھی۔ مہلک مرض کو رونا پر لکھی گئی تھی۔ ایک تو ہم رئیل لائف میں کورونا سے تنگ ہیں۔

☆☆ابرار بشیر صاحب: خط لکھ کر خوشی پہنچانے کے لئے شکریہ، کورونا سے ہم ہی نہیں بلکہ پوری دنیا پریشان ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مہلک وبا سے تمام انسانوں کو چھٹکارا دے اور سب پر اپنی رحمت خاص نازل کرے آئندہ ماہ بھی آپ خط لکھنا نہ بھولئے گا۔

فرخ چوہدری گجرانوالہ سے، منتظلی اکتوبر شمارہ اس بار جلدی ملا، خطوط کی محفل میں اچھے خطوط تھے، خاص کر نئے لوگ ڈائجسٹ کی محفل میں شامل ہو رہے ہیں، ویسے اس ماہ کا سالگرہ نمبر بھی بہت بہت اچھا تھا۔ بلقیس خان، بہت نائس لکھتی ہیں، ویلڈن جی۔ ایس حبیب خان آپ کے لیے پیپی برتھ ڈے ٹو یو، عثمان غنی خان آپ کا خط بہت اچھا اور مثبت ہوتا ہے۔ باقی سب کے خطوط اچھے تھے جو کہ پسند آئے، سب کے اشعار و انتخابات بھی بہت بہت دل کو پسند آئے۔ پہلی کہانی پرانا اسکول کو شروع کر دیا، مگر بس بور ہی کر دیا۔ کالی کہانی اچھی تھی، زندگی کا ڈر بھی نائس تھی۔ ایلومینائی نے توقعات پر ایک دم کھری اتری، ویلڈی، آپ میرے فیوریٹ رائٹرز میں ہوں، اب انشاء اللہ آپ کی ہر کہانی پڑھوں گی۔ عثمان غنی خان ویلڈن، تتلی بہت زیادہ اچھا لکھی ہے۔ رقص اجل کہانی میری من پسند رہی، آسیبی بلی اس کہانی نے دل ہی جیت لیا۔ جبکہ خونی سڑک اچھی بہترین کہانی رہی۔ آخری وعدہ میری من پسند کہانی رہی۔ باقی آئندہ ماہ ملاقات ہوتی رہے گی، اب اجازت دیجیے گا۔

☆☆فرخ صاحب: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، آپ کو ڈر کی کہانیاں اچھی لگیں اور آپ نے اچھا تبصرہ کیا اس کے لئے شکریہ قبول کریں اور ہاں آئندہ ماہ بھی خط ضرور لکھئے گا۔

عندلیب شیر بہ گرام سے، ڈیئر ایڈیٹر السلام علیکم! ڈر کا سالگرہ نمبر جلدی مل گیا۔ ٹائٹل بہت خوبصورت تھا، لڑکی بہت پیاری تھی۔ ادارے نے جو قرآن کی باتیں دی تھیں، پہلے وہی پڑھیں۔ پھر خطوط کی طرف چلے آئے، میرا پہلا تبصرہ ہے، کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے کیا لکھوں؟ سب سے پہلے تمام پاکستانیوں کو پیارا سا سلام قبول ہوں، بلقیس خان آپ بہت اچھا خط لکھتی ہے۔ ایس حبیب خان آپ کا تبصرہ بہت پیارا ہوتا ہے، عثمان غنی خان، آپ دل کی گہرائیوں سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اس لیے بہترین تبصرہ، اور عمدہ طرز تحریر لکھنے میں گویا آپ کا کوئی نعم البدل نہیں، خطوط کی محفل آپ کے بنا ادھوری لگتی ہے۔ باقی سب بہت اچھی باتیں لکھ رہے ہیں۔ اب ہو جائے کہانیوں پر تبصرہ، اس مہینے کے شمارے میں پہلی کہانی پرانا اسکول اپنے نام کی طرح نرم سی رہی۔ زندگی بس عام سی اسٹوری تھی، زندگی کا ڈر بھی گزارہ کر رہی تھی، خونی سڑک زبردست لگی، ایلومیناٹی، اپنے نام کی طرح شاندار، وجاندار کہانی تھی، جہاں دونوں کردار بے حد پسندیدہ رہیں، عثمان غنی خان کی آخری صفحات پر لگی اس کہانی نے دل جیت لیا ہے۔ رقص اجل کہانی نے الجھا دیا، چیل نے مزہ نہیں دیا، بے بس وجود ایک جاندار اور اچھی کہانی تھی، آسیبی بلی جیسی کہانیاں کم کم لکھی جاتی ہے۔ خونخوار بلیاں بھی بس گزارہ لائق سی کہانی تھی۔ کالی بے حد خوب تر رہی، جنگل کا آسیب بھی بچوں کے لیے اچھی تھی۔ آخری وعدہ بہت مزے دار کہانی تھی، تتلی ناکس تھی، تو سچ یا وہم بھی گزارے لائق تھی۔ حالانکہ باقی سب کی کہانیاں اچھی تھیں۔

☆☆ عندلیب صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ مین آپ کو سب سے پہلے ویلکم کیا جاتا ہے، آپ کا تجزیہ زبردست ہے، اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، آپ آئندہ بھی نوازش نامہ لکھنا نہ بھولئے گا، کیونکہ آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم! ماہ اکتوبر کا ڈر ڈائجسٹ بہت جلد مل گیا تو خوشی ہوئی، اپنا خط دیکھ کر تھوڑا سا دل ضرور اداس ہوا، میں نے ڈر کو برتھ ڈے وش کی تھی، جو ادارے کے ظالم قینچی کی نذر ہوگئی، پہلے قرآن کی باتیں پھر خطوط کی طرف چل پڑے۔ میرے خط کو پسند کرنے پر آپ سب کی شکر گزار ہوں۔ ایس حبیب خان کے خط کو دیکھ کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ بہن ایس حبیب آپ کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ ویسے آپ اگر لکھ نہیں رہی ہیں، تو کم سے کم محفل میں حاضری ہی لگایا کریں، ساحل دعا بخاری پلیز ویئر آر یو؟ کہانیوں پر بات کرتے ہیں، پہلی کہانی پرانا اسکول مجھے بہت اتنی پسند نہ آئی۔ زندگی کا ڈر بے حد عمدہ طرز تحریر کو لکھی ہے۔ زندگی بھی پسند آئی۔ جنگل کا آسیب بالکل بھی پسند آسکی۔ مہلک مرض بھی پسند نہ آسکی کیونکہ کورونا تو ہے نہیں، بس پوری دنیا کے مذموم مقاصد کو پورا کرنے کا ڈرامہ تھا۔ سچ یا وہم چارم لوز کر گئی تھی، تتلی بہت اچھی تھی۔ بے بس وجود کہانی میں بھرپور کرداروں کے تاثرات مزے دار تھے۔ آسیبی بلی عمدہ خوبصورت اور زوق کے درجوق کے مطابق قلم چلایا۔ ایلومیناٹی عثمان غنی خان کی کہانی اس ماہ بھی بہت خاص تحریر تھی۔ ضرغام محمود اللہ آپ کے والد ماجد کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں، اگر آپ کی کہانی ترجمہ تھی، تو شاید اتفاق مووی کے رائٹر نے کہانی ناول سے چرائی ہوں گی، یا پھر مووی میکرز نے گلشن ندہ سے ناول کے رائٹس خرید لیے ہوں، مگر اب مجھے مووی کا رائٹر کا نام یاد نہیں، ویسے اتفاق مووی بہت زیادہ پرانی ہیں، کچھ کہانیاں اتنی زیادہ پسند آجاتی ہیں، وہ دوسرے لکھاریوں کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہیں، اور لوگ اسی کہانی کو رپیٹ میں لکھ لیتے ہیں، زیادہ لوگ مووی دیکھتے ہیں، چاہے وہ پرانی ہی کیوں نہ ہو۔ خطوط سے پتہ چلتا ہے۔ میری نظر کے مطابق لکھاریوں کو ایسی کہانیاں لکھنی چاہیے، جس سے ان کی ساکھ اور ادارے کے نام کو نقصان نہ ہو۔ اگر آپ کہہ رہے ہیں، ڈر ترجمہ ماتھے پر نہیں لکھتا ہے۔ تو ادارے کی یہ پالیسی نہیں ہیں، کہ وہ ری میک یعنی کاپی شایع کرائیں، ادارہ چاہتا ہے کہ وہ نئی سوچ کو پروان چڑھائے۔ باقی اگر آپ کو کوئی بات بری لگی ہو تو بہت بہت معذرت۔۔۔!! آپ ویسے اچھے رائٹر ہیں، اور آپ کا ڈر میں نمایاں نام ہے۔

☆☆ بلقیس صاحبہ: آپ کا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی ہے اور آپ کا تجزیہ بار بار پڑھنے کے لئے دل چاہتا ہے کہ آپ نے جو کچھ بھی لکھا بہت خوب لکھا، امید ہے جلد از جلد اپنی کہانی ارسال کریں گی۔ Thanks۔

بینا خان اسلام آباد سے، اکتوبر ماہ کا ڈر بہت جلد مل گیا۔ قرآن کی باتیں بہترین ہیں خطوط کی محفل بے حد پسندیدہ ہے جہاں سب سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں کچھ نوک جھونک بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں سب کے خطوط دل کی گہرائیوں سے پسند آگئے، آپ سب کو سلام!، ڈر کا شمارہ اس ماہ کا اچھا تھا، کیونکہ سالگرہ نمبر تھا، جتنا پڑھا اس پر تبصرہ کر دوں، ایس حبیب خان خان کو کافی عرصہ بعد خط پر مبارک باد قبول ہو، اور برتھ ڈے کی بھی مبارک باد قبول ہو۔ عثمان غنی خان آپ خطوط میں سب کے جان بن گئے ہو۔ بلقیس خان آئی ایم ایگری ود تھ یو، ہم نے اپنے پورے علاقے میں ایک بھی کورونا کا مریض نہیں دیکھا، ویلڈن، پہلے ناپسندیدہ کہانیوں پر بات کرتے

ہیں، پرانا اسکول کہانی بس گزارے کی تھی۔ زندگی بھی پسند آئی۔ جنگل کا آسیب بورنگ رہی، مہلک مرض مجھے بالکل بھی پسند نہیں آسکی۔ سچ یا وہم بھی بالکل بھی پسند نہ رہی تھی۔ اب پسندیدہ کہانیوں کے نام لیتی ہوں۔ رقص اجل بہت نائس تھی۔ کالی ٹھیک تھی۔ خونی سڑک بہترین کہانی تھی، آسیبی بلی ایس امتیاز احمد کو پڑھ میں واؤ منہ سے نکلا۔ تتلی بے حد اچھی لگی۔ زندگی کا ڈر مزے کی تحریر لکھی تھی، ایلومیناٹی عثمان غنی خان، واؤ، آمیزنگ، سُپر، عثمان غنی خان صاحب بے حد عمدہ، لذیز، اور دل کو چھو لینے والی تحریر آپ نے لکھی۔

☆☆ بینا صاحبہ: دل کی گہرائی سے لکھا ہوا تجزیہ پڑھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا اور اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، امید ہے آئندہ ماہ بھی آپ کا تجزیہ پڑھنے کو ملے گا۔ شکریہ۔

بسما خان نوشہرہ وا کینٹ سے، السلام علیکم....!! ماہنامہ ڈر اکتوبر کا سالگرہ نمبر جلدی مل گیا، سب کو سلام، سب کے خطوط بے حد پسند آئے، ایس حبیب خان نے جو کچھ بھی لکھا، وہ داد کے قابل ہے۔ ایس حبیب خان سالگرہ مبارک ہو۔ عثمان غنی خان بہت پیارا تبصرہ لکھا ہے۔ بلقیس خان سچائی سے تجزیہ کرنا کوئی آپ سے سیکھے۔ اس ماہ کا شمارہ بے حد اچھا ہے کیونکہ اس میں اچھی کہانیوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ کہانی پرانا اسکول بہت بیسٹ ہے۔ آسیبی بلی ایس امتیاز احمد کی بھی اچھی کہانی ہے، آپ کورونا کے دوران ایک دو ماہ مسڈ کر گئے تھے، آپ کی کمی محسوس ہوتی رہی تھی۔ نیلا بندر دل سے آپ کی کہانی پسند آئی۔ زندگی کا ڈر کہانی بہت اچھی اور شاندار و جاندار تھی۔ آخری صفحات پر عثمان غنی خان کی ایلومیناٹی، جس نے میرے رونگٹے کھڑے کردیے، دل سے پڑھی، اسپیشلی لیلیٰ جیسے لوگوں سے بچنا بہت ضروری ہو گیا ہے، جن کے دین ایمان کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے۔ چیل من پسند رہی۔ زندگی کہانی اچھی رہی، کالی بالکل بھی پسند نہیں آئی، باقی سب کی کہانیاں اچھی تھیں، جن میں بے بس وجود، سچ یا وہم، تتلی، خونی سڑک، رہیں۔ بہترین کہانی لگی۔

☆☆ بسما صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کے تجزیہ کے لئے اور آئندہ ماہ بھی دلکش نوازش نامہ کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں، آئندہ ماہ بھی خوب صورت تجزیہ کا بہت بہت انتظار رہے گا۔

فریدہ خانم نیومری سے، ڈیئر ایڈیٹر صاحب یقین اور امید ہے کہ آپ خیر و عافیت سے ہونگے، جیسے ہی اس ماہ کا ڈر ڈائجسٹ ملا۔ دل خوشی سے جیسے باغ و بہار ہو گیا۔ قرآن کی باتیں بہت خوبصورت اور دیدہ زیب لگیں دل میں سکون پہچانے کا سبب بن گئیں، خیر خطوط کی محفل میں پہنچے۔ بلقیس خان نے اپنا تبصرہ بے حد عمدہ لکھا تھا، ویلڈن بلقیس خان۔ ایس حبیب خان، سالگرہ مبارک ہو، اور جلدی کہانی لکھ کر ہمارے دل کو ٹھنڈک پہنچانے کا سبب بن جاؤں، عثمان غنی خان، بالکل یہاں مری میں بھی بہت سارے لوگ سیاحت کرنے آئے تھے، اور زیادہ رش کی وجہ سے بہت سارے نوجوان موت کے منہ میں چلے گئے۔ اس ماہ سالگرہ نمبر کی کہانیاں کافی زیادہ اچھی تھیں۔ پرانا اسکول پہلی کہانی نرم تحریر ثابت ہوئی، زندگی اچھی لگی۔ ایلومیناٹی عثمان غنی خان آپ کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوں گی، بہت اچھا لکھا، آپ جب بھی لکھتے ہیں، ہمیشہ اچھا ہی لکھتے ہیں۔ بہت آمیزنگ اینڈنگ کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ جنگل کا آسیب اس کہانی نے دل تھوڑا سا خراب کردیا۔ تتلی تو زبردست لگی۔ سچ یا وہم بالکل بھی پسند نہ آسکی۔ زندگی کا ڈر خوبصورت کہانی پڑھی۔ محبت کا سایہ بس اچھی لگی۔ کالی کہانی اچھی ہے۔ رقص اجل بھی پسند آئی۔ بے بس وجود بھی پسند آئی۔ چیل عمدہ تحریر تھی، آسیبی بلی نائس اور عمدہ اچھی لگی۔

☆☆ فریدہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کا خط پڑھ کر ہمارا بھی دل باغ و بہار ہو گیا۔ آپ نے کم لکھا مگر بہت کچھ لکھا کہانیوں اور رسالے کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس۔

کائنات بلوچ بلوچستان سے، السلام علیکم! ڈر ڈائجسٹ کا شمارہ مل گیا، دل خوشی سے جیسے بلیوں اچھل اچھل پڑا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں، کافی دل کو سکون عطا کرگئی۔ پھر خطوط کی محفل میں چلے گئے، بلقیس خان کا خط ٹاپ پر دیکھ کر خوشی سے ایک بار پھر بلیوں اچھل پڑا، ایس حبیب خان سالگرہ مبارک ہو، آپ بے حد اچھا لکھتی ہیں، عثمان غنی خان آپ کا لکھا بے حد اچھا ثابت ہوتا ہے۔ چاہے تجزیہ ہو، یا ناول، افسانہ، یا پھر کہانی ہو، بھئی ہم نے مان لیا۔ ویسے باقی سارے خطوط بھی اچھے تھے۔ پرانا اسکول بہت اچھی لگی۔ زندگی یہ کہانی ڈر کی جان دار کہانی ہے۔ جنگل کا آسیب کہانی خوب تر رہی، تتلی بہت ہی پیاری تحریر رہی، زندگی کا ڈر سبق آموز کہانی تھی۔ سچ یا وہم بس اچھی تھی۔ نیلا بندر نائس اسٹوری لکھی ہے، آخری وعدہ بہت خوب رہی۔ آخری صفحات پر عثمان غنی خان کی ایلومیناٹی نام نے چونکانے پر مجبور کردیا، اندر سے وہ شاہکار برآمد ہوا، جس کے ہم تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ واقعی یہ کہانی ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہیں۔ زبردست، خونی بلی ایس امتیاز احمد کی تحریر بہت اچھی رہی۔ خونی سڑک بہت اچھی کہانی تھی۔ باقی سب کی کہانیاں بھی بہت اچھی اور نائس تھیں۔

☆☆ کائنات صاحبہ: آپ کا تبصرہ پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے اور بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے آپ جب بھی لکھتی ہیں بہت خوب لکھتی ہیں جس کا جواب نہیں۔ خیر آئندہ ارسال کرنا بھولئے گا مت اس کے لئے شکریہ قبول کریں۔

خانسہ غیور سوات سے، ماہ اکتوبر کا ڈر بہت جلد ملا، اور اس بار کور بہت پیارا تھا، اس ماہ کا سالگرہ نمبر تھا، ڈر جلد ملنے کی خوشی بہت ہوئی، اور اس ماہ خطوط کافی سارے تھے۔ سب سے پہلے قرآن کی باتوں سے شروعات کیں پھر خطوط کی محفل میں آئے، ارے واہ بہت اچھے تبصرے تھے، سب کو خوش آمدید اور سب کو سلام، اس بار خط بلقیس خان نے اچھا اور مثبت تبصرہ لکھ کر ایک بار پھر لیڈ کر لیا۔ ایس حبیب خان آپ کا تبصرہ دیکھ کر خوشی سے بے حال ہو گئی۔ ویسے سالگرہ مبارک ہو۔ عثمان غنی خان کا تبصرہ بھی بہت عمدہ اچھا، نائس اور پوزیٹو تھا۔ مگر بہت مختصر تھا۔!! باقی سب نئے دوستوں کو ویلکم ان ڈر محفل۔ اس بار ڈر میں جن کہانیوں نے دل جیت لیا۔ سب سے پہلے غالباً زندگی کا ڈر پڑھی، بہت اچھی مزے دار کہانی ہے۔ خونی سڑک بے حد مزے دار کہانی لگی، پرانا اسکول بھی بہت عمدہ لکھا گیا ہے۔ انتقام اچھی لکھی گئی ہے ایلومیناٹی نام نے کافی چونکا دیا، اور رائٹر کے نام نے فوراً پڑھنے پر راضی کر دیا، عثمان غنی خان کی لکھی۔ اس شاہکار کہانی نے دل میں خوف بھر دیا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ زندگی کے میلوں، میں دجالی ساتھی ہمیں یوں گمراہ کر رہے ہیں۔ عثمان غنی خان، ایک بار پھر آپ نے ایلومیناٹی سے دل جیت لیا ہے۔ کالی بھر پور رہی۔ آسیبی بلی ایس امتیاز احمد کی نئی کہانی نے بہترین اور کامیاب رہی۔ آخری وعدہ بہترین لگی۔ اندھیری رات کا مسافر پسند نہ آئی۔ وجہ یہ ہے کہ ایک ماں اپنے بیٹے کو پہچان نہ پائی۔ باقی سب کی کہانیاں اچھی تھیں۔

☆☆ خانسہ غیور صاحبہ: دل کی گہرائی سے لکھا ہوا تبصرہ پڑھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا اور تبصرہ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، آئندہ ماہ بھی دلکش تبصرہ لکھنا نہ بھولئے گا۔ Thanks۔

مہرینہ غلام علی بدین سے، امید ہے ادارہ بخیر و خیریت سے ہوگا، ڈر کا نیا شمارہ جلد مل گیا، سالگرہ نمبر کافی اچھا نکالا تھا، دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا، بلقیس خان نے اچھی باتیں لکھ کر ہمارا دل جیت لیا۔ ایس حبیب خان آپ کو سلام، اور آپ کی سوچ کی قدر کرتے ہیں۔ آپ کو بھی سالگرہ مبارک ہو، ویسے آپ کی سالگرہ میں ہم تب ہی شرکت کر پاتے، جب ڈر کی سالگرہ میں آپ شریک ہوتیں، میرا مطلب ہے آپ کی کہانی شائع ہوتی، عثمان غنی خان، آپ میرے فیورٹ رائٹر ہیں، اس بات میں کوئی بھی شک نہیں ہیں۔ حافظ مون شاہ آپ کافی لمبے عرصے کے بعد ڈر میں نظر آئیں، پرانا اسکول بہت بے مثال تحریر ہے۔ زندگی کا ڈر جادوئی قلم کا بخوبی استعمال کیا، جنگل کا آسیب بھی نائس اور عمدہ کہانی تھی۔ زندگی کہانی بھی اچھی تھی، ایلومیناٹی عثمان غنی آپ نے بہت پیاری تحریر لکھی ہیں۔ نگینے کی طرح فٹ تھی۔ سالگرہ کا مزہ دوبالا کر دیا۔ یہ شاہکار کہانی مدت تک یاد رہے گی۔ خونی سڑک ویلڈن بہت اچھی کہانی لکھی ہے۔ جنمی دروازہ کی یہ قسط کافی اچھی لگی۔

☆☆ مہرینہ صاحبہ: آپ نے خط لکھا اور تبصرہ بھی جاندار تھا لیکن بہت کم لکھا۔ ہر ماہ آپ کا تبصرہ پڑھ کر دل خوشی سے جھومنے لگتا ہے، لہٰذا آئندہ بھی آپ کے تبصرے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

نوری بشریٰ یونی ٹاؤن سے، السلام علیکم اکتوبر کا سالگرہ نمبر جلدی مل گیا، ٹائٹل اچھا تھا، پہلے قرآن کی باتیں دل و دماغ کو فرحت بخش سکون دے گئیں، پھر خطوط میں کی محفل میں چھلانگ لگا دی، ایس حبیب خان، سالگرہ بہت بہت مبارک ہو، اور ڈر کو بھی، بلقیس خان آپ کی سب باتیں درست ہیں، عثمان غنی خان صاحب یو آر گریٹ رائٹر، اتنے یونیک خیالات لاتے کیسے ہو؟ ہم سے تو چند سطور کا خط نہیں لکھا ہے، امرحہ خان، کا تبصرے دل کو چھو گیا، باقی سب کے خطوط بھی پسند آئے۔ اس ماہ کا ٹائٹل بہت پیارا ہے۔ اول کہانی پرانا اسکول بہت پسند آئی۔ بے بس وجود اچھا لکھا، زندگی کہانی کا اینڈ اچھا تھا۔ زندگی کا ڈر مجھے پسند آ گئی، جنگل کا آسیب بہت اچھی کہانی رہی۔ تتلی کہانی کافی اچھی لگی، بیچ یا وہم بالکل بھی اچھی نہیں تھی۔ آخری وعدہ اسٹوری بور نگ رہی، محبت کا سایہ بہت پیاری تحریر تھی جبکہ خونی سڑک گڈ اسٹوری لکھی۔ آسیبی بلی ایس امتیاز احمد کی عمدہ رہی، کالی واہ آمیزنگ ونڈر فل اسٹوری تھی۔ انتقام اچھا لکھا۔ ایلومیناٹی عثمان غنی خان بھیا بہت لاجواب، آمیزنگ کہانی رہی۔۔۔!!

☆☆ نوری بشریٰ صاحبہ: آپ کا خط پڑھا تو خوشیوں سے جھوم اٹھا، اور بار بار پڑھا، آپ نے جو بھی لکھا بہت خوب لکھا، عثمان صاحب واقعی بہت گریٹ ہو رہے ہیں ان کی محنت رنگ لا رہی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ محنت رائیگاں نہیں جاتی۔

نورینہ خیام پنجاب سے، اکتوبر کا سالگرہ نمبر بہت جلد ملا، کور بہت پیارا تھا، سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں۔ پھر خطوط کی

محفل میں آئی، سب کے خطوط بے حد پسند آئی، سب کو خوش آمدید، اور سب کو سلام، دل کرتا ہے، مجھے بھی پورے دل سے خوش کہا جائے، پرانا سکول بس ملتی جلتی کہانی تھی، بے بس وجود گڈ پیاری دل سے سراہنے والی تحریر ہے۔ زندگی کا ڈراچھا نیا موضوع تھا۔ زندگی بھی اچھی کہانی ہے، عثمان غنی خان ایلومیناٹی ایک پر اثر کہانی ہے، جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہی ہوں گی۔ آج کل ہر جگہ فتنہ دجال وقت سے پہلے پھیل گیا ہے، لوگ زیادہ تر بے حیائی کی طرف اٹریکٹ ہو رہے ہیں۔ جنگل کا آسیب پسند نہ آسکی، اندھیری رات کا مسافر بھی پسند نہیں آئی، کہانی کا مین تھیم بالکل بھی اچھا نہیں تھا۔ آسیبی بلی بہترین کہانی رہی۔ تتلی کہانی بہت، بہت اچھی لگی۔ سچ یا وہم بے حد اچھی لگی۔ رقص اجل خاص نہیں تھی مگر بری بھی نہیں تھی، آخری وعدہ اچھی کہانی تھی۔ جہنمی دروازہ مزے کی رہی۔

☆☆ نورینہ صاحبہ: ڈردائجسٹ میں خوش آمدید، دل کی گہرائی سے لکھا ہوا نوازش نامہ پڑھ کر دل بہت خوش ہوا، آئندہ ماہ بھی دلکش تجزیہ کا انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

روھانیہ عامر مردان سے، ڈرڈائجسٹ ملا تو دل خوشی سے ناچ اٹھا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں، کافی دل کو سکون عطا کر گئی۔ پھر خطوط کی محفل میں حاضری لگائی، سب نے جاندار تبصرہ کر کے دل جیت لیا۔ سب کو ویلڈن بہت زیادہ اچھا لکھا۔ خاص کر بلقیس خان، ایس حبیب خان، عثمان غنی خان آپ کا خط بہت بہت اچھا لگا۔ پرانا اسکول کہانی مجھے تو پسند آئی، زندگی کا ڈر بھی اچھی لگی، یہ کہانی بہت اچھی اور بہترین تھی۔ زندگی بھی ایک بہترین اور اچھی کہانی ہے۔ کالی نے بھی دل میں جگہ بنالی ہے، ایلومیناٹی جیسی کہانیوں کو خاص جگہ دینی چاہیے۔ آسیبی سڑک، ارے اتنی بھرپور اور مزے دار کہانی، سیدھی دل میں اتر گئی ہے۔ بے بس وجود بہت بھرپور کہانی ہے۔ جنگل کا آسیب کہانی اچھی تھی۔ سچ یا وہم بھی بس ایوریج تھی۔ تتلی کہانی بہت اچھی رہی خونی سڑک بھی مجھے مکمل طور پر پسند آگئی۔ باقی سب کے سلسلے کلام بہت اچھے تھے، اور دونوں قسط وار تحریریں بہت اچھی جا رہی ہیں۔ اللہ ضرغام محمود اور اہل خانہ کو صبر وتحمل عطا کرے۔ آپ کے والد صاحب کا ہمیں دلی طور پر افسوس ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔ (آمین)

☆☆ روبانیہ صاحبہ: آپ کا دلکش تجزیہ پڑھ کر دل بہت خوش ہوا اور اتنا خوش ہوا کہ جھومنے لگا، عثمان غنی بہت اچھا لکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ڈر کے سارے رائٹروں کو زور قلم اور دے۔

صبا شاہ جڑانوالہ سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر کی پوری ٹیم ٹھیک ٹھاک ہوگی اور تمام رائٹر بھی خیر وعافیت سے ہوں گے ماہ اکتوبر کا سانگرہ نمبر جلد ہی مل گیا۔ اکتوبر کے شمارے کا ٹائٹل خوفناک تاثر دے رہا تھا۔ قرآن پاک کی باتیں ہمیشہ کی طرح روح میں اتر گئیں پھر خطوط کی محفل میں سب کے خط پیارے تھے، اچھے تبصرہ نگاروں میں ہما خان، بلقیس خان کی باتیں حقیقت پر مبنی تھیں۔ ضرغام محمود، امر حدخان، ایس حبیب خان، ماریہ مسعود، رابعہ آفرین اور عامر شہزاد کے تبصرے دل کو چھو گئے۔ ضرغام محمود بھائی اللہ تعالیٰ اپ کے والد کو جنت الفردوس میں عالی مقام عطا فرمائے۔ (آمین) کہانیوں میں جو مجھے سب سے اچھی کہانیاں لگیں۔ پرانا اسکول، زندگی، تتلی، بے بس وجود، زندگی کا ڈر، رقص اجل، بھٹکتی روح، چیل، اندھیری رات کا مسافر، انتقام اور آخر میں آسیبی بلی بہت زبردست اسٹوریز تھیں۔ اور میری دعا ہے کہ ڈر خوب ترقی کرے، کہانی ارسال ہے اگر شائع ہو جائے تو پلیز۔

☆☆ صبا صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، کہانی شامل اشاعت ہے۔ خوش ہو جائیں۔ کہانی لکھ کر ایک مرتبہ پڑھ کر دوبارہ فائنل کیا کریں اور ہاں امید ہے آئندہ ماہ بھی خط لکھنا نہیں بھولیں گی۔ شکریہ۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ پچھلے دو ماہ کے شماروں میں مزہ نہیں آیا! کمپلین شاید کرونا! یا برسات کی وجہ سے دلچسپی کا عنصر کم رہا۔ مگر برا لگا تو معذرت۔ خیر۔ اسٹاف کو اور ڈرڈائجسٹ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ووپورز کو دعا سلام۔ اپنا خیال رکھئے گا۔ شکریہ۔

☆☆ امتیاز صاحب: معذرت کی بات نہیں ملکی حالات جو ہیں وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ کورونا اور برسات کا بھی عمل دخل رہا ہے۔ خیر دعا کریں کہ ملکی حالات جلد از جلد بہتر ہو جائیں۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

احسان الحق السلام علیکم! میں امید کرتا ہوں کہ ڈرڈائجسٹ کی اس خوب صورت بزم کے تمام معزز رائٹرز اور قارئین کرام خیر و عافیت سے ہوں گے۔ ڈرڈائجسٹ بروقت موصول ہوا اور اس کا چونکہ ایک خاص Charm ہے میری زندگی میں، تو ڈرڈائجسٹ کے بغیر زندگی ادھوری سی محسوس ہوتی ہے۔ اس مرتبہ خطوط میں ضرغام محمود صاحب کے والد صاحب کے انتقال کی خبر نے دل کو بہت زیادہ

اداس کیا۔ میں اور میری فیملی فوری سورہ یٰسین شریف کی تلاوت میں مشغول ہوگئے تھے۔ عجیب سی کیفیت تھی لیکن اللہ پاک کے فیصلوں کے سامنے ہم سب ابن آدم بے بس ہیں۔ فاتحہ شریف پڑھنے کے بعد میں قلبی و روحانی طور پر ضرغام صاحب کے ساتھ رنج و غم میں برابر کا شریک ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ پاک انہیں اپنے کریم صبر سے نوازتے ہوئے ان کے ابو جان کی مغفرت فرمائیں اور نبیوں و صدیقین کے ساتھ ہم مسلمین کی آخرت سنوار دیں، آمین۔ میں اس رات ٹھیک سے سویا بھی نہیں۔ آنسو تھے کہ تھمتے نہیں تھے۔ شاید اسی کو بڑھاپا کہتے ہیں کہ انسان کو احساس ہو جاتا ہے اور غم سن بھی نہیں پاتا۔ بہرحال! کہانیوں مین اس مرتبہ سالگرہ نمبر کی بہترین کہانیاں شامل تھیں اور واہ! سب کہانیوں کے لئے کہوں گا، کیا کہنے، کیا لکھنے! مزا تھا اور وہ بھی ڈر کی سالگرہ کے ساتھ دوبالا۔ ماشاء اللہ۔ اللہ پاک میرے جوانوں اور لکھنے والوں کو یونہی مزید لکھنے کی ہمت دے، آمین۔ کہانی کے متعلق ایک بات کہوں گا کہ کہانی لکھتے رہیں، یہ پڑھنے کے لئے ہے، سنانے کے لئے ہے اور سننے کے لئے۔ اس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی آدم اور ابن آدم کی۔ خیر!......اس مرتبہ میں بہت سے دوست لکھاریوں کو Miss کرتا رہا۔ ان میں سرفہرست ایس حبیب خان صاحبہ کا ذکر کروں گا۔ مجھے ان کی تحریروں سے ایک عقیدت سی رہی ہے کیونکہ وہ ڈر کی ایک منجھی ہوئی رائٹرز ہیں۔ ان کی کہانیاں بڑے ردھم کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں اور جو خاصہ ان کا ھندی کہانیوں میں ہے تو وہ کیا ہی کہنے، لاجواب ہے۔ امید ہے ان کی امی جان اب صحت یاب ہوں گی۔ فلکہ ناز صاحبہ کی کہانی کو تلاش کرتا رہا۔ نہ جانے اس مرتبہ ان خوبصورت تحریروں میں وہ کیوں نہ اپنی خوبصورت کہانی کو پیش کرسکیں، وہ جہاں ہوں اللہ خوشیوں کے ساتھ رکھے۔ آخر میں فقط اتنا ہی کہ یہ ناچیز آپ سب کے لئے دعا گو ہے، امید ہے کہ آپ سب کی دعائیں بھی اس بندے کو ٹھنڈی ہواؤں کی مانند پہنچتی رہیں گی۔ جزاک اللہ، سلامت رہیں۔ خیر اندیش۔

☆☆ احسان الحق صاحب: آپ کی صحت اور تندرستی کے لئے ہم اور قارئین دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ تمام اہل خانہ کو بخیر و عافیت رکھے۔ ہر ماہ برائے مہربانی کہانی اگر نہ ہو سکے تو خط ارسال کر کے اپنے چاہنے والوں کو خوش کر دیا کریں۔ Thanks۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے، رم جھم کی برسات میں 258 صفحات میں 26 کہانیوں کا گلدستہ حاضر ہاتھوں میں ہے۔ جلتے گلاب ونڈرفل عثمان غنی صاحب آخری قسط آنکھیں جھپکانا بھول گئے۔ جب زین گولی چلاتا ہے تو دل رکتا ہوا محسوس ہوا۔ عثمان غنی صاحب ہم صوابی میں ایک ماہ کے ٹور پر صوابی میں تھے، صبح فجر کی نماز کے بعد خان دوستوں کے ان بچوں کو نشانہ بازی کی مشق کرتے ہوئے دیکھتے جن میں ہم شامل ہوتے ہر گھر سے فائر کی آواز ایسے آتی جیسے کہ شب برات ہو۔ آخر زین نے بھی اپنی دلہن کو نشانہ بازی کی مشق کرائی۔ پہلی رات جماعت کے سلسلے میں موبائل بند رکھتے ہیں ہرفن مولا کبھی مسجد کبھی مرکز کبھی...... میں اس لئے موبائل نمبر میری طرح ہرفن مولا...... خواتین رائٹروں سے آگے ریس میں چلنے والی بلقیس خان سے گزارش کریں گے۔ آپ بھی جلتے گلاب جیسی کہانی لکھیں۔ ویسے آپ کی ہر کہانی میں سبق پوشیدہ ہوتا ہے۔ شاہد بھائی اردو بازار کا پانی خشک ہو جائے تو حاضر ہوں گے۔

☆☆ شرف الدین صاحب: آپ کی صحت و تندرستی کے لئے ہم سب دعا گو ہیں اور الہ تعالیٰ آپ کو کلی صحت عطا کرے اور ہاں یاد آیا۔ اب اردو بازار کا پانی خشک ہو گیا ہے۔ آپ کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں یاد ہے ضرور شکریہ کا موقع دیں گے۔

محسن حسنین کاظمی میانوالی سے، السلام علیکم! میں عرصہ دراز سے ''ڈر'' ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ خصوصی طور پر جنات اور کالے علم سے متعلق کہانیاں پڑھنا اور لکھنا میرا مشغلہ ہے۔ ''ڈر'' ڈائجسٹ میں پہلی مرتبہ خط لکھنے اور کہانی بھیجنے کا سلسلہ شروع کر رہا ہوں۔ اگست اور ستمبر کے شمارے میں تقریباً تمام کہانیاں بہترین اسلوب اور انداز تحریر کے حساب سے یگانگت رکھنے والی تھیں۔ میرا علاقہ موچھ ضلع میانوالی ہے۔ ''ڈر'' ڈائجسٹ کی ڈراؤنی کہانیاں حقائق کے مطابق ہوتی ہیں جن کی وجہ سے اندرونی ڈر ختم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ میں اپنی تحریروں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کا متمنی رہتا ہوں اور قارئین کرام کی حوصلہ افزائی کی بدولت جنات، کالا علم اور مافوق الفطرت واقعات پر مبنی کئی کہانیاں تحریر کر چکا ہوں۔ اگر ڈر ڈائجسٹ کی انتظامیہ نے میری حوصلہ افزائی کی اور قارئین عظام نے مجھے حوصلہ دیا تو میں آپ کو کسی صورت مایوس نہیں کروں گا۔ آپ کا حکم ہوا تو اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر ہر مہینے ایک اچھوتی اور حقائق سے مزین کہانی آپ کو روانہ کیا کروں گا۔

☆☆ محسن صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، کہانی شامل اشاعت ہے اور اب حسب وعدہ نئی کہانی کا انتظار ہے۔ امید ہے ہر ماہ شکریہ کا موقع ضرور دیتے رہیں گے۔ شکریہ۔

اسحار بن ناصر کراچی سے، السلام علیکم! اللہ رب العالمین سے خیر کی امید ہے کہ جملہ مخالفین مع متعلقین عافیت سے ہوں گے، ڈر ماہ اکتوبر 2020ء اوائل مہینہ میں خریدا۔ ماشاء اللہ ڈراب ''بائیس سال' کا خوبرو اور گبرو جوان ہوگیا ہے، اب میرے خیال میں ایڈیٹر صاحبان کو اس کی 'شادی' کی فکر کرنی چاہئے! ہاہاہا کیا خیال ہے قارئین؟ خیر اکتوبر کے رسالہ میں اپنا ارسال کردہ خط اور شعر نہ پا کر 'سالگرہ نمبر' میں خود کی کمی کا احساس ہوا۔ یقیناً ڈاک خانے والے بہت سست ہوگئے ہیں! خطوط میں ضرغام محمود صاحب کا خط پڑھا میں ان سے جنت کی دعاؤں کے ساتھ تعزیت کرتا ہوں۔ بقول ضرغام صاحب ان کے والد کا جمعہ کو وصال ہوا۔ جس کی ہم سب کو خواہش ہے، اللہ ان کی اور سب لوگوں کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ اب آئے کہانیوں کی طرف..... پہلی کہانی 'پرانا اسکول' بلاشبہ خوبصورت اور مناسب تھی، ویسے اس بار رسالے میں اکثریت مختصر کاوشیں تھیں، جو بہتر بات ہے! 'جنگل کا آسیب' اچھی تھی۔ رابعہ صاحبہ نے 'زندگی' بہت زیادہ عمدہ کہانی لکھی! 'نیلا بندر' بھی دل کو لگی۔ 'مہلک مرض' لکھ کر احسان صاحب نے قدرتی خوف دلا دیا، اگلی 'تتلی' بھی اچھی تھی۔ اگلی کہانیوں میں 'سچ یا وہم' 'کالی' اور 'خونی پیاس' وغیرہ بہت خوب صورت کاوشیں اور ہر اک اپنے اندر اک نصیحت پنہاں کی ہوئی تھی۔ آخری وعدہ بہترین کہانی لکھی۔ 'خونی سڑک' کا تو تجزیہ ہی نہیں۔ ایس امتیاز احمد صاحب کے ایک تفصیلی خط کا انتظار ہے۔ باقی زندگی کا ڈرعکاسی کرتی رہی زندگانی کی ہمیں تو آخرت میں فیصلے کا ڈر رہنا چاہئے! قسط وار کہانی بھی دونوں خوب ڈگر پر چل پڑی ہیں! ایلومیناٹی میں عثمان غنی صاحب کی ایک نئی مخفی حقیقت لکھی، مبارک قبول کریں! اچھا اب تمام لوگوں کو فی امان اللہ بہت سی دعائیں۔

☆☆ اسحار صاحب: حقیقت ہے کہ ڈاکخانہ والے آج کل زیادہ..... باقی تمام باتیں سمجھنے والی ہیں۔ خیر آپ کا تجزیہ پڑھ کر دل کو خوشی ہوئی۔

عثمان غنی پشاور سے، السلام علیکم! ادارہ خیر و عافیت سے ہوگا، ڈر کا سالگرہ نمبر اس ماہ کافی جلدی مل گیا۔ جس کی بے حد خوشی ہوئی، ٹائٹل کافی یونیک تھا، سب سے پہلے فہرست دیکھی جو کافی اچھی لگی، پھر قرآن کی باتیں بے حد بہترین ہیں، اس کے بعد خطوط کی محفل میں حاضری دی، ضرغام محمود صاحب کے والد کا سن کر بے حد دکھ ہوا، اللہ آپ کے والد کو اونچے درجات میں جگہ دے آمین، ایس حبیب خان آپ کو بھی سالگرہ بہت بہت، مبارک ہو۔ آپ پلیز کہانیوں میں اپنی موجودگی یقینی بنائیں، سب کے خطوط بے حد پسند آئے، قرآن کی باتیں بے حد بہترین ہیں، ڈر کا سالگرہ نمبر بے حد عمدگی سے سجایا گیا تھا۔ ملک بھر میں کورونا کے بے تحاشہ چھٹیوں نے طالب علموں کو بالکل نکما بنا دیا ہے، کسی کا دل بھی پڑھائی لکھائی میں لگ نہیں رہا ہے، اُوپر سے فیک نیوز ہر دن بہت زیادہ ملکی سطح پر پھیلائی جا رہی ہیں، جن کو سن کو صرف دکھ ہی ہوتا ہے۔ اب طالب علم یہی چاہتے ہیں، ملک بھر میں سال کے آخر تک صرف چھٹیاں ہی ہوں۔ کیونکہ وہ ان کم عرصے میں پڑھائی نہیں ہو سکتی ہیں۔ جو کچھ ہمارے اسٹوڈنٹس نے پڑھا اور سیکھا تھا، وہ کورونا نے بھلا دیا ہے، اور جو نہیں بھولے، وہ پب جی پر اپنا وقت برباد کر رہے ہیں اور کچھ ٹک ٹاک پر مجرا اور ایکٹنگ کر کے نہیں تھک رہے ہیں، ڈر کے ماہ اکتوبر میں اول کہانی پرانا اسکول کافی اچھی لگی، کہانی میں آخر تک روانی موجود تھی۔ جنگل کا آسیب بھی اچھی لگی، نیلا بندر کہانی بھی عمدگی سے بہت اچھے انداز میں تحریر کی گئی ہے، زندگی کہانی بھی ٹھیک تھی، سچ یا وہم بہت اچھی اسٹوری لکھی تھی۔ زندگی کا ڈر لاجواب تھی، ادارے کی یہی بہترین خوبی ہے، وہ ہر موضوع پر کہانیاں شائع کرتا ہے۔ کالی معاشرے میں پھیلی برائیوں پر مبنی بہترین کہانی تھی۔ تتلی اس ماہ کی اچھی کہانی لگی تھی، جو بالکل بھی بور نہیں تھی، اور کہانی کا نام بھی کہانی کی طرح پیارا تھا۔ خونی پیاس بھی بس ٹھیک تھی، قصہ اجل بھی عمدگی سے تحریر کی گئی تھی۔ آسیبی بلی ایک بہترین، اور لاجواب کہانی تھی۔ خونی بلیاں اچھی کوشش تھی۔ خونی سڑک بہت اچھی تحریر لکھی ہے۔ دونوں قسط وار تحریریں، جہنمی دروازہ اور موت کی سرگوشی عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہیں، اس کے علاوہ سب کے کٹ پیس بہت اچھے تھے اور قوس و قزح کے تمام رنگ اچھے تھے۔ ڈر اس ماہ کا بہت زیادہ بہترین تھا۔ ہر کہانی نگینے کی طرح فٹ تھی۔ اس ماہ جن رائٹرز کی کمی محسوس ہوئی۔ ان میں بلقیس خان، فلک زاہد، ایس حبیب خان، محمد شعیب، ساحل دعا، ربیعہ امجد، مونا شہزاد، کرن خان، مینا خان، ثنا اے شیخ، آپ سب سالگرہ میں موجود نہیں تھے، آپ کی کمی محسوس ہوئی، جن نئے لکھاریوں کی کہانیاں شائع ہوگئی تھیں، وہ سب قابل تعریف ہیں اور ان سب کو خوش آمدید۔

☆☆ عثمان صاحب: دل کی گہرائی سے آپ کا لکھا ہوا تجزیہ پڑھ کر دل کو خوشی اور سکون ملا، آپ کی ہر کہانی پڑھنے والوں کے دل میں اتر جاتی ہے، اور اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو اور بھی زور قلم دے۔ آپ کی ساری باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔ Thanks۔

☆☆

شیطانی حویلی

خالد شاہان-صادق آباد

رات کا اندھیرا ہر سو مسلط تھا کہ اتنے میں ایک بلا کی غراہٹ سنائی دی آواز اتنی کرخت تھی کہ نوجوان کا دل مسوس کر رہ گیا کہ پھر اتنے میں ایک اور آواز سنائی دی تو.....

دل دہلاتی.....اور تہلکہ مچاتی.....ایک عجیب وغریب آسیبی اور.....خونی.....کہانی

ٹرین کی بوگی نمبر 5 اور کیبن نمبر 13 میں اس وقت وارث، آصف، احسان، سحر، عثمان غنی، فلک زاہد، قیصر جمیل پروانہ سکندر حبیب، ضرغام محمود سب موجود تھے۔ اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ رات کے تقریباً 12 بجے کا وقت تھا۔ اور ٹرین اپنی سی رفتار سے چلی جا رہی تھی۔

وارث ہنستے ہوئے بولا۔ ''دوستوں مجھے تو بڑی خوشی ہوئی۔ جب مجھے ڈرڈ انجسٹ کے ایڈیٹر انکل شاہد کی کال آئی کہ ڈرڈ انجسٹ کی سالگرہ پر آپ کو دعوت دی جاتی ہے۔ جلدی آجائیں تو میری تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

''قیصر جمیل وارث آصف کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وارث جی یہ آپ کو نہیں انکل شاہد کی ہم سب کو کال آئی ہے دعوت کی اور ہم سب ہی دعوت پر جا رہے ہیں۔''

سکندر حبیب بولا۔ ''ہاں دوستوں پر یہ ایک اچھی بات ہے۔ کہ اب ہر سال میں ڈرڈ انجسٹ کی سالگرہ پر ادارے والوں نے سب رائٹرز حضرات کو دعوت کرنے کا سوچا ہے جو کہ ہماری حوصلہ افزائی کے لئے کافی اچھی کوشش ہے۔''

تو ضرغام محمود نے کہا۔ ''دوستوں ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ صادق آباد شہر کو گزرے ہوئے کافی ٹائم ہو گیا۔ مگر محمد خالد شاہان صاحب ابھی تک آئے نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ وہ کوچ سے کراچی چلے گئے ہوں۔'' فلک زاہد کی آواز پر سب اسے دیکھنے لگے اور عثمان غنی نے کہا۔ کہ ہو سکتا ہے کہ دعوت میں ہماری ملاقات ان سے ہو جائے۔''

ابھی یہ سب باتوں میں مصروف تھے کہ ٹرین آہستہ آہستہ رک گئی۔ جب کافی دیر تک ٹرین نہ چلی تو سب ٹرین کے ڈبے سے اتر آئے۔ ٹرین سے کافی مسافر اور بھی اتر رہے تھے اور کچھ چہل قدمی کر رہے تھے۔ جہاں ٹرین رکی تھی وہاں آس پاس گھنا جنگل تھا۔ سب لوگ حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ یہ اچانک ٹرین کیوں رک گئی۔

سکندر حبیب بولا۔ ''میں پتہ کر کے آتا ہوں کہ کیا مسئلہ ہے۔'' وہ ایک طرف چلا گیا اور پانچ منٹ بعد واپس آ کر بولا۔ ''دوست کافی مشکل ہو گئی ہے۔ ٹرین کا انجن فیل ہو گیا ہے۔ اور سکھر سے دوسرا انجن صبح تک پہنچ جائے گا۔ اور ہم اس وقت صادق آباد سے چند کلومیٹر آگے والہار کے جنگل کے پاس کھڑے ہیں۔''

تو اس کا مطلب ہے رات ساری یہاں گزارنی

PakistanPoint www.pakistanipoint.com

ہو گی۔ فلک زاہد گھبراتے ہوئے بولی۔ ''ہاں اب تو مجبوری ہے پر اتنی دیر ہم کریں گے کیا۔''

سکندر بولا۔ سامنے میدان ہے وہاں پر کچھ حصہ صاف ہے وہاں جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ساری رات گپ شپ کریں گے۔'' بس پھر سب دوست وہیں جا کر بیٹھ گئے۔ عثمان غنی ایک جگہ سے کافی ساری لکڑیاں لے آیا۔ اور سب کے درمیان میں ڈھیر کر کے آگ کا آلاؤ روشن کر دیا۔ ابھی عثمان غنی آگ لگا کر بیٹھا ہی تھا کہ فلک زاہد بولی۔

''و امنے دیکھو کیا ہے'' تو سب سامنے کی طرف نگاہ اُ س تو انہیں کافی دور درختوں میں ایک خوفناک بڑی سی پراسرار حویلی کے کھنڈرات نظر آئے۔ جو کہ آدھی رات کے وقت چاند کی روشنی میں اور پراسرار لگ رہی تھی۔

سکندر حبیب بولا۔ ''لو بھئی پوری رات گزارنے کا موقع بھی مل گیا۔ کوئی اور بور بھی نہ ہوگا۔''

وہ کیسے وارث بولا۔

''وہ ایسے کہ ہم ڈر ڈائجسٹ کے رائٹرز ہیں اور ہم نے کافی حد تک بڑی بڑی خوفناک اور پراسرار اسٹوریاں تحریر کی ہیں۔ تو آج دیکھتے ہیں کہ میرے علاوہ کوئی ہمت والا ہے۔ جو اس پراسرار حویلی کے اندر سے گھوم پھر کر آ جائے۔'' عثمان غنی سمیت سب کی نگاہ وارث پر آ کر تھم گئی۔ وارث گھبراتے ہوئے بولا۔

''مم...... میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ میں ہارر رائٹر ضرور ہوں پر بہادر نہیں اسٹوری میں تو بس چھوڑتا رہتا ہوں۔ نا بابا نا میں نہیں جاتا اس پراسرار حویلی میں۔'' سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''کون جائے کہ کون جائے پر کسی میں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ حالانکہ سب ہارر ڈائجسٹ کے رائٹر تھے۔ ایسے میں قیصر جمیل پروانہ اٹھتا ہوا بولا۔ ''دوستوں میں جاؤں گا اس حویلی میں آپ سب یہاں بیٹھے میرا انتظار کرنا۔'' سب نے قیصر جمیل کو داد دی۔ کہ وہ واقعی میں ہمت والا ہے۔ وارث آصف آگے بڑھ کر قیصر کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

''شاباش میرے یار مجھے تم سے یہی امید تھی۔ فکر نہ کر اگلے ماہ تیرے اوپر ہی اسٹوری لکھوں گا۔ جا شاباش اب جا۔''

اور پھر وہ ہنستے ہوئے اس پراسرار حویلی کی طرف چل پڑا۔ سب دوست اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے جب تک وہ نگاہ سے اوجھل نہ ہو گیا۔

قیصر آہستہ آہستہ پراسرار حویلی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اس کے دل میں ہلکا سا خوف بھی تھا۔ اور سوچ بھی رہا تھا۔ کہ ہو سکتا ہے کہ اس حویلی میں کسی نے رہائش اختیار کر رکھی ہو۔ اب وہاں جا کر ہی پتہ چلنا تھا۔ سب کچھ۔

قیصر جب ایک جھاڑی کے پاس سے گزر رہا تھا تو وہاں اسے سرسراہٹ سی سنائی دی۔ تو قیصر رک گیا اور اس جھاڑی کی طرف دیکھنے لگا جو کہ اب ہلنا شروع ہو گئی تھی۔ کہ اچانک اس جھاڑی سے چار خونخوار کتے نمودار ہوئے۔ اور اس کی طرف دیکھ کر غرانے لگے۔ یہ دیکھ کر قیصر نے دوڑ لگا دی اور کتے بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ دوڑتے دوڑتے قیصر حویلی کے نزدیک آ گیا۔ اسے حویلی کی ایک سائیڈ کی کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی محسوس ہوئی اور قیصر نے دوڑتے ہوئے کھڑکی کے اندر چھلانگ لگا دی۔ اور کھڑکی کے نیچے ہی دبک کر بیٹھ گیا۔ اور اپنا سانس درست کرنے لگا۔ اسے ابھی بھی کتوں کی ہلکی ہلکی بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ آوازیں اب کافی دور سے آ رہی ہیں۔ یہ سوچ کر قیصر کو اطمینان ہوا کہ اب خطرہ ٹل چکا ہے۔ آہستہ آہستہ دور ہوتی ہوئی کتوں کی آوازیں بھی معدوم ہو گئیں۔

قیصر کی سانس اب اعتدال پر آ چکی تھیں۔ اس کی دل کی دھڑکنیں بھی بحال ہو چکی تھیں۔ حالانکہ خطرہ اب ٹل چکا تھا۔

مگر پھر بھی ایک عجیب سی بات اس نے محسوس کی کہ ایک عجیب سا خوف اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا

تھا۔ جس کا کوئی سبب اس کی سمجھ میں نہ آسکا۔ شاید اس کا یہ سبب یہ ہو کہ وہ جو حویلی میں داخل ہوا ہے۔ یہاں کوئی رہتا ہے تو کہیں وہ کتوں کی آوازوں کو سن کر جاگ نہ اٹھیں۔ لیکن ابھی تک حویلی میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جس سے اندازہ ہوا تھا۔ کہ اس حویلی میں اگر کوئی رہتا ہے تو انہوں نے باہر کا شور نہیں سنا تھا۔ یا شاید وہ گہری نیند میں تھے۔

جس کمرے میں قیصر اس وقت دیکا وہا تھا۔ اس میں اتنا گہرا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے دس بارہ منٹ ہو چکے تھے اب باہر سے بھی کتوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ جس سے ظاہر تھا کہ وہ کتے اس کی تلاش میں ناکام ہو کر اب واپس جا چکے تھے۔ بظاہر اب دور دور تک کوئی خطرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن نامعلوم خوف کا احساس اب بھی اس کے دل پر چھایا ہوا تھا اب اسے ٹارچ جلانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔

چنانچہ قیصر نے جیب سے چھوٹا سا لائٹر نکالا اور اسے روشن کر دیا۔ یہ حویلی شاید بہت پرانی تھی۔ کیونکہ دیواروں سے جگہ جگہ پلستر اتر چکا تھا۔ اندر سے خستہ حال اینٹیں جھانک رہی تھیں۔ اور ہر جگہ مکڑی کے مہیب جالے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جگہ دیوار سے لگی ہوئی۔ ایک قدیم الماری نظر آئی۔ جو سیاہ لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ الماری کے دونوں پٹوں پر نہایت ہی خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے جو کہ ایک عرصہ گزرنے کی وجہ سے اب ہلکے پڑ گئے تھے۔ بہر حال ساگوان کی لکڑی کی بنی ہوئی یہ الماری کاریگری کا بہترین نمونہ نظر آرہی تھی۔

الماری کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ اور اس میں کچھ کتابیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ جو گرد آلود تھیں فرش پر بھی مٹی کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ جیسے اس اس کمرے میں برسوں سے کوئی نہیں آیا۔

قیصر نے ٹارچ ذرا گھمائی تو ایک سمت میں شاہ بلوط کی لکڑی کا ایک خوبصورت دروازہ نظر آیا۔ جو شاید اندرونی کمروں میں کھلتا تھا۔ ہر شے پر مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں فرش پر جگہ جگہ چوہوں کی غلاظت پھیلی ہوئی تھی۔ قیصر نے ٹارچ کی روشنی دوسری سمت ڈالی تو اس طرف بھی قدیم طرز کی ایک بھاری میز دکھائی دی۔ قیصر نے ٹارچ کی روشنی ذرا اوپر گھمائی تو بری طرح اچھل پڑا۔

قیصر کی چیخ نکل پڑی۔ چند لمحات تک وہ ساکت ہو کر رہ گیا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ وہ منظر ہی اتنا خوفناک تھا۔ کہ قیصر حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔

میز کی دوسری طرف ایک کرسی رکھی ہوئی تھی جس پر ایک انسانی ڈھانچہ بیٹھا ہوا تھا۔

لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے جسم پر پورے کپڑے تھے۔ قیصر حیرت زدہ سا کھڑا ڈھانچے کو گھورے جا رہا تھا۔ پھر اس نے خود پر قابو پا کر ذرا غور سے دیکھا۔ تو وہ کپڑے بھی اسے کافی پرانے نظر آئے۔ جو ڈھانچے نے پہنے ہوئے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان کپڑوں کا ڈیزائن کافی پرانے لگے۔

قیصر چند قدم آگے بڑھا۔ تاکہ ذرا قریب سے جائزہ لے سکے۔ اس نے پھر ڈرتے ڈرتے ڈھانچے کی طرف قدم بڑھایا۔ وہ اسے قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے کچھ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اس نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دی۔ کہ بھلا ایک ڈھانچے سے کیا ڈرنا۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔

حقیقت یہ تھی۔ کہ اس کمرے کا ماحول چکرا دینے والا تھا۔ قیصر کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو چیخیں مارتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا۔

یہاں آکر کوئی بات قیصر کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ کمرے کی حالت اس کے لئے غیر متوقع تھی۔ خاص طور پر وہ پراسرار ڈھانچہ اتنا تو ظاہر تھا۔ کہ اسے مرے ہوئے بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ اتنا عرصہ کے اس کا جسم بھی گل سڑ کے ختم ہو چکا ہے۔ اور اب صرف ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ لیکن اتنے لمبے عرصے میں کسی کو اس کے بارے میں علم کیوں نہیں ہوا۔ کیا اسے کسی نے قتل کیا

ہے۔ اگر ایسا تھا تو پولیس کو اس کا ضرور علم ہونا چاہئے تھا ۔کم از کم کسی کو تو معلوم ہوتا۔ کمرے کی خستہ حالت بتا رہی تھی کہ یہ حویلی خالی ہے۔

قیصر نے ڈرتے ڈرتے ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور ڈھانچے کے کپڑوں کو چھو کر دیکھا، معلوم ہوا کہ اس کے کپڑے بھی بوسیدہ ہو چکے تھے۔ ہلکے ہلکے خوف کے باوجود اس کے دل میں تجسس کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ اور قیصر نے فیصلہ کیا کہ وہ اس حویلی کو اب اندر سے ضرور دیکھے گا۔ ہو سکتا ہے یہی سوچ کر قیصر دبے قدموں اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

کاش اگر قیصر کو یہ علم ہوتا کہ یہ حویلی آسیب زدہ اور یہاں آ کر وہ بہت بڑے مصیبت میں پھنس جائے گا تو وہ کبھی اپنے دوستوں سے وعدہ کر کے نہ آتا۔ اور اس منحوس عمارت میں بھی قدم نہ رکھتا۔ مگر افسوس کہ ہونی ہو کر رہتی ہیں۔

قیصر نے سامنے کا دروازہ کھولنے کے لئے جیسے ہی اس پر ہاتھ رکھا۔ ویسے ہی شاہ بلوط کا وہ دوازہ چرچراہٹ کے ساتھ خود بخود اس طرح کھلتا چلا گیا۔ جیسے اس کے ہاتھ لگانے کا منتظر ہوں جیسے ہی دروازہ خود بخود کھلنے لگا۔ قیصر گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔

خوف کی سرد لہر قیصر کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ لیکن چند ہی منٹ میں اس نے اپنے خوف پر غلبہ حاصل کر لیا۔ تھوڑی دیر میں وہ یونہی چپ چاپ کھڑا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں دروازے کی چرچراہٹ سن کر اندر کے لوگ بیدار نہ ہو جائیں لیکن اندر اسی طرح خاموشی چھائی رہی۔

قیصر کو حیرت ہوئی کہ دروازے کی چرچراہٹ سن کر بھی کوئی نہیں جاگا تھا۔ اس سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ راہداری میں اور کمروں کے باہر کونوں کھدروں میں مختلف حشرات الارض نے رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس کے علاوہ چمگادڑوں کی غلاظت بھی تھی۔ چند لمحے قیصر اپنی جگہ کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر ٹارچ کی روشنی میں دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ لیکن ایک بات اس نے صاف طور پر محسوس کہ کہ اس کے دل و دماغ میں جو ہلکا سا خوف تھا۔ اس میں اب اور اضافہ ہو چکا ہے۔ اتنا تو وہ یقین سے کہہ سکتا تھا۔ کہ یہاں کے رہنے والے لوگوں سے اسے کوئی خوف نہ تھا۔ مگر یہ عجیب سا خوف تھا۔ جو آج پہلی بار اسے محسوس ہو رہا تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ خوف کی لہریں اس کے رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھیں۔

قیصر بے آواز چلتا ہوا۔ تیسرے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ وہاں پہنچ کر پہلے اس نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور پھر دروازے کی ایک پتلی جھری سے آنکھیں لگا دیں سب سے پہلے اس کی نظر اس شمع دان پر پڑی۔ اس میں چار شمعیں روشن تھیں۔ شمع دان نہایت ہی خوبصورت اور دیدہ زیب تھا۔ کونے میں ایک پرانی مسہری رکھی ہوئی تھی۔ جو خالی تھی۔ لیکن جونہی قیصر کی نظر وسط میں پڑی اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سردی کے باوجود قیصر کا سارا جسم پسینے میں نہا گیا کمرے کے وسط میں ایک عام کتے کے قد کے برابر ایک خونخوار سیاہ رنگ کا بلا زمین پر پڑی پلیٹ میں منہ ڈالے خون پی رہا تھا۔ وہ منظر اتنا حیرت ناک تھا۔ کہ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ دہشت کی سرد لہریں اس کے پورے وجود میں دوڑنے لگیں۔ اور دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جیسے سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اس نے اپنی زندگی میں اتنا قد آور بلا نہیں دیکھا تھا۔

یہ تصور ہی لرزا دینے کے لئے کافی تھا۔ کہ اس حویلی میں رہنے والے کی فطرت اور درندگی کا کیا عالم ہو گا۔ جو اس بلے کو خون پلا کر پال رہا تھا۔ قیصر انہی سوچوں میں گم تھا۔ اور اس کی نظر بلے پر لگی ہوئی تھی۔ کہ اچانک نہ جانے کس طرح بلے کو قیصر کی موجودگی کا پتہ چل گیا تو اس نے خون پیتے پیتے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اوہ..... وہ اس کی خوفناک آنکھیں دیکھ کر قیصر کے بدن میں تھرتھری چھوٹ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے بلے کی آنکھوں میں دو سرخ شعلے منجمد ہو

کر رہ گئے ہوں۔ اس کے منہ سے خون کے قطرے ٹپک کر نیچے گر رہے تھے۔ جو ماحول کو اور بھی بھیانک بنا رہے تھے۔

اچانک وہ غرا کر دروازے کی طرف لپکا۔ اور قیصر کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ فوراً ہی دروازے سے ہٹ گیا یہ تو غنیمت تھا کہ دروازہ اور کھڑکی بند تھی۔ ورنہ نہ جانے وہ اس کا کیا حشر کرتا۔

قیصر سر سے لے کر پاؤں تک لرز گیا۔ اور دل جیسے کھوپڑی میں دھڑکنے لگا۔ جسم کے سارے مساموں سے پسینہ پانی کی طرح بہہ نکلا۔ منظر اتنا ہولناک تھا کہ قیصر نے اپنی چیخ بڑی مشکل سے روکی پھر اس نے دیکھا کہ ایک کالا خوفناک ناگ جس کی لمبائی کسی طرح بھی بیس فٹ سے کم نہ تھی۔

پرلی طرف دیوار پر ٹکٹکی لگائے کسی چیز کو گھور رہا تھا۔ قیصر نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا۔ کہ سانپ کی نظریں دیوار پر لگی ہوئی ایک بے حد پرانی تصویر کو گھور رہی تھیں۔ قیصر کے اعصاب کشیدہ ہونے لگے۔

وہ سانپ تقریباً آٹھ انچ موٹا تھا۔ وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت تھا اور اس قدر غور سے تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ منظر اس قدر ہوش ربا تھا کہ قیصر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اس کی ساری دلیری دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

قیصر کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ اب بھی یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ اس طرف اس کا دھیان گیا ضرور تھا۔ لیکن اسے یقین نہ تھا۔ البتہ اب اسے یہ احساس شدت سے ہونے لگا تھا کہ یہ حویلی خالی ہے۔ کیونکہ حویلی میں ان دو بلاؤں کی موجودگی میں کسی انسان کا رہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

درحقیقت قیصر بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ کہ ان خوفناک حالات میں بھی یہاں ابھی تک موجود تھا۔ اور اپنا وعدہ پورا کرنے کا جذبہ رکھتا تھا۔ ورنہ عام آدمی کے لئے تو یہاں دو منٹ رکنا بھی ناممکن تھا۔ حالانکہ ان خطرناک اور خونخوار جانوروں کی موجودگی قیصر کا خون خشک کیئے دے رہی تھی۔

لیکن دروازہ بند ہونے کی وجہ سے اسے ان سے فوری خطرہ نہ تھا۔ پھر بھی خوف و دہشت نے بری طرح اس کے دل اور دماغ کو جکڑ رکھا تھا۔ اسی وقت دنیا کے خوفناک ترین جانور سانپ نے اپنا پھن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ یوں جیسے اسے پتہ چل گیا ہو۔ کہ دروازے کے باہر اس کا کوئی دشمن موجود ہے۔ اس کی آنکھیں شیشے کی گولیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ان آنکھوں سے جیسے چنگاریاں سی نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان سلا دینے والی آنکھوں میں کچھ ایسا سحر موجود تھا۔ کہ قیصر کا دماغ متاثر ہو رہا تھا۔ اور آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں، حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے تو کوئی آواز بھی نہ نکالی۔ نہ ہی کوئی ایسی حرکت کی۔ پھر سانپ کو پتہ کیسے چل گیا۔ کہ باہر کوئی موجود ہے۔

قیصر نے گھبرا کر اپنی نگاہیں دروازے کی جھری سی ہٹالیں۔ اسی وقت اسے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کی پشت کی طرف سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ ایک لمحے کے لئے قیصر بدحواس ہو گیا۔

مگر دوسرے ہی لمحے اس نے تیزی سے پیچھے کی طرف دیکھا۔ لیکن وہاں ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کہ اچانک قیصر اچھل پڑا کہ گرتے گرتے بچا ایک چیخ کی آواز اتنی تیز اور بھیانک تھی کہ اس کے ہوش و حواس ایک لمحے کے لئے جواب دے گئے۔ اور دل اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جیسے ابھی سینے سے باہر آجائے گا۔ وہ خون سرد کرنے والی دہشت ناک آواز اوپر کے کسی کمرے سے بلند ہوئی تھی۔ یوں جیسے کسی کا گلہ کاٹا جا رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ وہ آواز سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔ آواز بلاشبہ کسی عورت کی تھی۔ ہلکی ہلکی سسکیوں کی درد ناک آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا اور دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔

رات کے ہولناک سناٹے میں گونجنے والی ان آوازوں نے اس کے ہوش اڑا دیئے تھے پہلا خیال جو

قیصر کے دماغ میں آیا وہ یہی تھا کہ شاید یہ مکان آسیب کے قبضے میں ہے۔ اور یہ آواز کسی بدروح کی ہے۔

دوسرا خیال یہ آیا۔ کہ اسے اس ویران اور پراسرار حویلی سے فوراً بھاگ جانا چاہئے۔ اگر دوستوں میں مذاق ہوتا ہے تو ایسا سہی۔ وہ بھاگنے کے لئے مڑا ہی تھا کہ اچانک ایک خیال نے اس کے قدم روک لیئے۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں اس عمارت میں کچھ لوگوں نے غیر قانونی سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہوں۔ اور انہوں نے یہ خوفناک جانور پال رکھے ہوں۔ تاکہ پولیس اور دوسرے لوگ ان کے کام میں مداخلت نہ کرسکیں۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔ انہوں نے اس عمارت کو ویران بنایا ہوا ہے۔

اس چیخ کا سبب بھی یہی ہوگا۔ کہ وہ لوگ کسی لڑکی کو اغواء کر کے لائے ہوں گے اور اس وقت اس پر تشدد کیا جارہا ہوگا۔ لیکن پھر بھی یہ عجیب بات تھی۔ کیونکہ اس حویلی سے اندازاً کئی قدموں کے فاصلے پر ٹرین موجود تھی اور ساتھ ہی میدان میں اس کے دوست بیٹھے اس کا انتظار کررہے تھے۔

ابھی اس چیخ کی بازگشت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک خوفناک قہقہہ گونجا۔ اور در و دیوار لرز کر رہ گئے۔ یہ ایک مردانہ آواز تھی جس سے قیصر کے اندیشے کی تصدیق ہوگئی۔ یہ آواز اس قدر دہشت انگیز تھی کہ اس کے رگ و پے میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ ایک جھرجھری لے کر آگے بڑھا۔ اور پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

اس کا رخ بائیں طرف والے زینے کی طرف تھا۔ سسکیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں ابھی تک اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھیں۔ قیصر نے سیڑھیوں پر قدم رکھا تو لکڑی کا بوسیدہ زینہ جھولنے لگا۔ وہ احتیاط سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اسے ڈر تھا کہ زینہ کہیں اس کے بوجھ سے بیٹھ نہ جائے۔ اس کے ہر قدم پر زینہ سے چرچراہٹ کی ڈراؤنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور اس کی احتیاط رائیگاں جارہی تھی کیونکہ زینے سے نکلنے والی آوازوں سے وہ لوگ یقیناً خبردار ہوگئے ہوں گے۔ قیصر نہایت چوکنے انداز میں زینہ کی سیڑھیاں طے کررہا تھا۔

مگر پھر بھی اسے ہر آن یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی کہیں سے کوئی نادیدہ گولی آکر اس کا کام تمام کردے گی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ سسکیوں کی آواز سن رہا تھا۔ لیکن جب وہ اوپر پہنچا تو وہ آوازیں یک بیک بند ہوگئیں۔ آنے والے لمحات کے تصور سے اس کا دل اس تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے کوئی زخمی پرندہ پنجرے میں پھڑپھڑا رہا ہو۔ اوپر فقط ایک کمرے میں روشنی تھی۔ اور باقی تین کمرے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قیصر بے آواز قدموں سے چلتا ہوا روشن کمرے کی طرف بڑھا۔ اس وقت اس نے خود کو ہر قسم کے حالات کے لئے تیار کرلیا تھا۔ قیصر دروازے پر پہنچا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے نہایت احتیاط سے کھلے ہوئے دروازے سے جھانک کر اندر دیکھا تو حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔

کمرہ خالی تھا۔ شاید وہ لوگ زینہ سے ابھرنے والی آوازیں سن کر کہیں چھپ گئے تھے۔ البتہ اس کمرے کے کونے میں رکھی ہوئی ویسی ہی ایک شاندار مسہری رکھی ہوئی تھی۔ جیسے وہ نیچے ایک کمرے میں دیکھ چکا تھا۔ مسہری پر کوئی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ اس لئے یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ مرد ہے یا عورت سونے والے کو دیکھ کر پہلا خیال جو دل میں آیا۔ وہ یہ تھا کہ سونے والے نے چیخوں کی آوازیں نہیں سنیں کہ وہ ابھی تک لمبی تان کر سو رہا تھا۔

کمرے میں ویسا ہی ایک شمع دان تھا۔ ایسے شمع دان نیچے والے دو کمروں میں بھی رکھے ہوئے تھے کمرے میں ایک میز پر ایک کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ دونوں ہی سیاہ لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ اور بے حد قدیم تر زکی تھیں۔ یہ بات بھی نہایت حیران کن تھی کہ اس عمارت میں اب تک جتنی بھی چیزیں قیصر کو نظر آئی تھیں وہ سب کی سب بے حد قدیم تھیں۔ اور اتو اور مسہری پر جو کوئی بھی سو رہا تھا اس کے اوپر اتنی صاف اور اجلی چادر

دکھائی دے رہی تھی۔ اس پر دماغ دھبہ تو دور کی بات ہے ہلکی سی شکن تک نہ تھی۔ اس کے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے اب شک ہونے لگا تھا کہ یہ حویلی آسیب زدہ ہے کیونکہ اس حویلی کی کوئی چیز بھی اپنی ترتیب سے نہ تھی۔

چیخ کی آواز سے ظاہر تھا کہ یہاں کوئی تھا ضرور..... تو کیا وہ آوازیں دوسرے کمروں سے آئی تھیں لیکن پھر اس کمرے کی میز کرسی اور مسہری کی صفائی کس نے کی اور کب۔

قیصر حیران ہو رہا تھا کہ یہاں کے لوگ کس قسم کے ہیں۔ کہ انہوں نے میز کرسی کی صفائی کی لیکن باقی کمرے کو ایسا ہی چھوڑ دیا۔

کمرے کی پراسرار حالت دیکھ کر قیصر کا دل جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس سارے معاملے میں یقیناً کوئی نادیدہ قوت کارفرما ہے۔

البتہ مسہری پر سونے والا اسی طرح سو رہا تھا۔ اس عرصے میں نہ چیخ کی آواز سنائی دی۔ نہ سسکیوں کی۔ اب اس کی نظریں مسہری پر لگی ہوئی تھیں اور دماغ میں عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ سونے والے کے بارے میں کئی سوالات اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ اور وہ ہر قسم کی صورت حال کیلئے خود کو تیار کرتا آہستہ آہستہ مسہری کی طرف بڑھنے لگا۔ تاکہ چادر اتار کر دیکھے کون سو رہا ہے۔

لیکن وہ ابھی مسہری سے کچھ ہی دور تھا کہ اچانک دروازے کی چرچرانے کی آواز سن کر سرتاپا لرز کر رہ گیا۔ اور اس کے بڑھتے ہوئے قدم فوراً رک گئے۔ تیزی سے مڑ کر جونہی اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ تو وہ اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا۔

آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور دل جیسے دہشت اور خوف کے سمندر میں ڈوبنے لگا۔ شاہ بلوط کی لکڑی کا بھاری دروازہ چرچراہٹ کی بھیانک آواز کے ساتھ آپ ہی آپ بند ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت قیصر کے جسم کا خون جیسے خشک ہو چکا تھا۔ جب دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا۔ تو اسے جیسے اچانک ہوش آ گیا۔ وہ بھاگتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ اور اسے کھولنے کی دیوانہ وار کوشش کرنے لگا۔ مگر بے سود یوں لگتا تھا۔ جیسے دروازہ کسی نے باہر سے بند کر دیا ہو۔ لیکن وہ کھلی آنکھوں سے دروازے کو خود بخود بند ہوتے دیکھ چکا تھا۔

اب تو قیصر بری طرح گھبرا گیا۔ اب کوئی شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ کہ مکان آسیب زدہ ہے۔ آسیب کا خیال آتے ہی اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔

وہ تو جن، بھوتوں، اور چڑیلوں کی بیسیوں کہانیاں لکھ چکا تھا۔ قیصر کو اپنی لکھی ہوئی اسٹوریاں ایک ایک کر کے سب یاد آنے لگیں۔

اور بے اختیار اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

اب قیصر کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ کہ اس نے اپنے دوستوں سے وعدہ کر کے اور یہاں آ کر زبردست بھول کی ہے۔ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مگر اب وہ سوچنے لگا کہ اسے اب یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن کس طرح، قیصر نے چاروں طرف کمرے میں نظر دوڑائی بس لے دے کر ایک کھڑکی ہی تھی۔ جو عقب میں کھلتی تھی۔ وہ بے اختیار کھڑکی کے پاس پہنچا۔ اور اسے کھولا تو زمین پچیس تیس فٹ نیچے نظر آئی۔ یعنی کھڑکی کے راستے نیچے پہنچنا بھی ممکن نہ تھا۔ کیونکہ رسی وغیرہ بھی نہ تھی اور ظاہر ہے کہ چھلانگ بھی نہ لگائی جا سکتی تھی۔ قیصر نے بے چین ہو کر کھڑکی کی دائیں طرف دیکھا۔ تو تھوڑے فاصلے پر دوسرے کمرے کی کھڑکی نظر آئی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ کھڑکیوں کے اوپر نیچے چھجے سے بنے ہوئے تھے۔ جس کے ذریعے دوسری کھڑکی تک پہنچا جا سکتا تھا۔ وہ کسی حد تک مطمئن ہو گیا کہ خطرے کے وقت کم از کم اس کمرے سے نکلا جا سکتا ہے۔ مگر افسوس قیصر کو یہ معلوم نہ تھا۔

یہ بھیانک حویلی اس کے لئے ایک ایسا قید خانہ بن چکی ہے۔ جہاں سے نکلنا بے حد مشکل ہو گا۔

لیکن وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کمرے سے نکل کر وہ دوسرے کمرے میں ہی جا سکتا ہے۔ اس عمارت

سے تو نہیں نکل سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں قیصر کو یوں لگتا تھا۔ کہ وہ ایک ایسی بھول بھلیوں میں پھنس چکا ہے۔ جس کا ہر راستہ موت کی طرف جاتا ہے۔

پھر مسہری پر سونے والے کا خیال آیا۔ اور وہ کھڑکی سے پلٹ کر مسہری کی جانب بڑھا۔ مسہری کے پاس پہنچ کر اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا۔ اور اس کے سر سے چادر ہٹادی۔ لیکن چادر ہٹتے ہی بے اختیار اس کے منہ سے تیز چیخ نکل گئی۔ اور وہ بری طرح اچھل کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مارے دہشت کے اس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اور اس کے حواس جواب دے گئے۔

اس نے دیکھا کہ وہ ایک عورت کی لاش تھی اس حالت میں کہ اس کی گردن کٹی ہوئی تھی۔ اور خون اس تیزی سے نکل رہا تھا۔ جیسے اسے ابھی ابھی قتل کیا گیا ہو۔ اس کی کٹی ہوئی گردن کے مختلف حصے پھڑک رہے تھے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کا سر غائب تھا۔

تو کیا وہ چیخیں اس عورت کی تھیں مگر وہ آوازیں تو کچھ دیر قبل سنائی دی تھیں۔ جبکہ تیزی سے بہتا ہوا خون بتا رہا تھا کہ اس عورت کو تین چار منٹ پہلے قتل کیا گیا تھا۔ قیصر کا دل کھوپڑی میں دھڑکنے لگا۔ اور جسم کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ اس وقت قیصر پر جو گزر رہی تھی۔ اسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل تھا۔ بس یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اس کے جسم کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔

اس کا دماغ سن ہو چکا تھا۔ اور سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں بے کار ہو چکی تھیں۔ ظاہر تھا کہ عورت کو اس وقت قتل کیا گیا تھا۔ مگر کیسے یہاں تو اس کے علاوہ دوسرا کوئی آیا نہیں۔ وہ کافی دیر سے اس کمرے میں موجود تھا۔ جس وقت اس نے وہ چیخیں سنی تھیں۔ اگر اس عورت کو اس وقت قتل کیا گیا ہوتا۔ تو اس وقت تک عورت کا سارا خون نکل چکا ہوتا۔ یہ ناممکن ہے اس کو ابھی ابھی قتل کیا گیا تھا۔ مگر قتل کس نے کیا۔ کیا وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی تھی۔ جو اسے نظر نہ آئی۔ یقیناً یہی بات ہے۔ لیکن اس کا سر تو یہیں ہونا چاہئے تھا۔

تو کیا قاتل سر بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ قیصر کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ اب اسے اپنی زندگی بھی خطرے میں نظر آنے لگی۔ یہ نادیدہ قاتل تو اسے بھی قتل کر سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ بھاگتا ہوا ایک بار پھر دروازے پر گیا۔ اور اسے زور آزمائی کرنے لگا۔ مگر دروازے کو نہ کھلنا تھا نہ کھلا اب وہ بری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اسے لاش کو دوبارہ دیکھنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ نہ اتنی ہمت تھی کہ اسے پھر سے چادر سے ڈھانپ دیتا۔

وہ سوچنے لگا کہ وہ کس مصیبت میں پھنس گیا۔ اس خطرناک جگہ پر تو وہ آرام سے بھی کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ بیٹھنا تو دور کی بات تھی۔ وہ میز کے پاس کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے اور کہاں جائے۔ وہ انہیں سوچوں میں گم تھا کہ اچانک اس کی نظر فرش پر پڑی۔ اور وہ اس طرح چونک کر پیچھے ہٹا۔ جیسے اس کے آگے موت کھڑی ہو وہ منظر ہی اتنا خطرناک تھا کہ اس کے دل کی دھڑکن رکنے لگی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس سے دو فٹ کے فاصلے پر فرش کی مٹی پر اسرار انسانی قدموں کے نشانات بنتے چلے جا رہے تھے۔

یوں جیسے کوئی انسان فرش پر چل رہا ہو مگر وہاں کوئی انسان تو کیا۔ ایک مکھی تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ مگر نشان برابر بنتے چلے جا رہے تھے۔ اس طرح کے آگے آگے نشان بنتے جا رہے تھے۔ اور پیچھے پیچھے مٹتے جا رہے تھے۔ قیصر حیرت سے آنکھیں پھاڑے ان عجیب و غریب نشانوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو کمرے کے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔

اس کا دل خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اور آنکھیں جیسے حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نشان دروازے تک پہنچے۔

اچانک دروازہ کھلا جیسے نادیدہ ہاتھ کھولا ہو۔ اور نشانات باہر نکلتے چلے گئے۔ دروازہ اب آہستہ آہستہ بند ہونے لگا۔ یکا یک قیصر کو خیال آیا۔ کہ اس کے لئے سنہری موقع ہے۔ اور اسے بھاگ جانا چاہئے۔ وہ بجلی کی تیزی سے بھاگتا ہوا دروازے تک پہنچا تھا۔ کہ

دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہو گیا۔ اور وہ اپنے ہی زور سے دروازے سے ٹکرا گیا۔ اور نیچے گر پڑا۔ کافی زور کی چوٹ لگی تھی۔ چند منٹ تک اس میں اٹھنے کی بھی سکت نہ تھی۔ اور وہ اسی طرح زمین پر پڑے پڑے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

وہ کچھ اس انداز میں زمین پر گرا تھا کہ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی اور چہرہ میز کرسی اور مسہری کی طرف تھا۔

اچانک خوف سے قیصر کی بری حالت ہو گئی۔ جب اس نے ایک لمبے سانپ کو مسہری کے نیچے سے نکلتا دیکھا۔ جو دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جہاں وہ گرا تھا۔ حالانکہ روشنی کافی تیز تھی۔ لیکن وہ اسے سانپ ہی سمجھا تھا۔ مگر اب جو غور سے دیکھا تو وہ خون کا ریلا تھا۔ جو عورت کے جسم سے بہہ کر مسہری کے نیچے جمع ہو گیا تھا۔ اب وہاں سے ریلے کی شکل میں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی جان میں جان آئی۔ اور وہ دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر یہ اطمینان کا صرف ایک لمحہ تھا۔ جو اسے نصیب ہوا۔

دوسرے ہی لمحے قیصر کے ہوش اڑ گئے جب اس نے دیکھا کہ وہ خون دروازے سے ہٹ کر اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ قیصر چیخیں مارتا ہوا چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ اور وہ خون سانپ کی مانند اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ مگر وہ بھاگ کر جاتا بھی تو کہاں جاتا۔ کوئی جائے پناہ نہ تھی۔

لہٰذا کچھ دیر تو وہ دیوانوں کی طرح بھاگتا رہا پھر بے اختیار ہو کر کھڑکی پر چڑھا۔ اور احتیاط سے چھجے پر پاؤں رکھتا ہوا دوسرے کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ ہر آن اسے یہی خوف تھا کہ چھجا ٹوٹ نہ جائے کیونکہ عمارت بے حد قدیم تھی۔ مگر شاید قدرت کو قیصر کی زندگی منظور تھی۔ ویسے یہ بات تو ظاہر ہے کہ وہ خون قیصر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ لیکن اس وقت خوف اور دہشت نے کچھ اس طرح سے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا کہ اس کے ہوش گم تھے اور بھاگنے کے سوا اسے کچھ اور نہیں سوجھ رہا تھا۔

وہ آسانی سے کھڑکی میں سے گزر کر دوسرے کمرے میں کود گیا۔ اس نے ٹارچ جلا کر کمرے کا جائزہ لیا یہ دیکھ کر اس کے دل کو کافی اطمینان ہوا۔ کہ کمرہ خالی تھا۔ لیکن اس شیطانی حویلی کے چپے چپے پر دہشت کی حکمرانی تھی۔

پے در پے ہونے والے ان دہشت ناک واقعات نے قیصر کی جان نکال دی تھی۔

اس کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ لہٰذا اس نے ٹارچ روشن کیے رکھی یہ کمرہ پہلے کی نسبت کچھ صاف تھا۔ گو یہاں پر رکھی ہوئی کچھ چیزیں بھی گرد آلود تھیں۔ فرش پر مٹی بھی جمی ہوئی تھیں۔ دیواروں کا پلستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ مگر یہاں مکڑی کے جالے بہت کم تھے۔ ایک جگہ کارنس پر ویسا ہی پراسرار شمع دان رکھا ہوا تھا۔ چونکہ ٹارچ کی روشنی محدود تھی۔ اس لئے قیصر نے سوچا کہ شمع کو جلانا چاہیئے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کیسے جلاؤں۔

اچانک اسے یاد آیا کہ اس کی جیب میں ماچس اور سگریٹ کا پیکٹ موجود ہے۔ قیصر نے ماچس جلا کر تیلی جلائی، اور شمع کی طرف بڑھا۔ مگر بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ اسے خیال آیا تھا کہ اس عجیب و غریب موم بتیوں کے شعلے ساکت رہتے ہیں۔ اور عام شعلوں کی طرح ہوا کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا اسی وقت جلتی ہوئی تیلی انگلیوں کو جلانے لگی تو اس نے گھبرا کر اسے پھینک دیا۔

وہ سوچنے لگا کہ یہ شمع دان بھی سونے کا تھا اور یہ شمع دان بھی کسی شیطانی قوت کے زیر اثر ہیں۔ تبھی تو اس کے شعلے عام شعلوں کی طرح گھٹتے بڑھتے نہیں۔ ورنہ ہوا چاہے بالکل ہی رکی ہوئی ہو۔ تب بھی عام شعلے رقص کرتے رہتے ہیں۔

حالانکہ یہ شمع دان بھی سونے کا تھا۔ مگر اب ان سے بھی قیصر کو خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر ٹارچ مسلسل روشن رہی تو اس کے سیل جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔

اور پھر ٹارچ کی روشنی اتنے بڑے کمرے کا

احاطہ کرنے میں ناکام تھی۔ پھر حویلی میں اسے نہ جانے کتنی دیر رکنا پڑے اس لئے اسے کوشش کرنی چاہئے۔ لہٰذا قیصر نے پھر ایک تیلی جلائی۔ اور ڈرتے ڈرتے ایک موم بتی روشن کردی۔ اور پھر سب موم بتیاں روشن ہوتے ہی اس کے شعلے اس طرح ساکت ہوگئے جیسے بجلی کے ہوں۔

اس بھاگ دوڑ نے قیصر کو کافی تھکا دیا تھا۔ اور رہی سہی کسر خوف اور رہشت نے پوری کردی تھی۔ اب چند لمحات قیصر کو سکون کے ملے تو بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔ قیصر کو بڑی شدت کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ کاش وہ ٹرین سے کھانا کھا کر آتا۔ مگر اب برداشت کرنا تھا۔ اسی وقت اس کی نظر بند الماری میں پڑی۔ اور اس کا تجسس جاگ اٹھا۔ اس نے سوچا کہ اسے کھول کر دیکھنا چاہئے۔ ممکن ہے کہ اس میں ہیرے جواہرات یا اور کوئی قیمتی چیز بند ہو۔ اس وقت پہلی بار قیصر کو علم ہوا کہ انسان فطری طور پر لالچی ہوتا ہے۔ حالانکہ اس وقت اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ مگر ایسے خوفناک حالات بھی اسے ہیرے جواہرات کی تمنا تھی۔

قیصر کرسی سے اٹھ کر الماری کے قریب پہنچا تو چونک گیا۔ الماری کے دونوں پٹ بند تھے۔ مگر اس کی کنڈے پر ایک خوفناک سیاہ مکڑی بیٹھی ہوئی تھی اسے دیکھتے ہی قیصر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اور وہ کانپ کر رہ گیا۔ عام حالات میں شاید نہ ڈرتا۔ مگر اس پراسرار عمارت میں ہر طرف موت ہی موت مختلف شکلوں میں گھوم رہی تھی۔ اس لئے اب اسے حویلی کا چپہ چپہ اپنا دشمن لگ رہا تھا۔ لہٰذا اس عجیب مکڑی کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا۔ ویسے بھی یہ پراسرار مکڑی جسامت میں کافی بڑی تھی۔ اندازً چھ انچ کے قریب ہو۔ مگر اس مکڑی کی موجودگی میں قیصر کو یہاں کیسے سکون مل سکتا تھا۔ لہٰذا قیصر نے اسے ہاتھ اور پیر ہلا کر بھگانے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی وہ ہاتھ ہلا ہلا کر تھک گیا۔ مگر وہ کریہہ مکڑی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

اچانک ایک نئے خیال نے قیصر کو اور دہشت زدہ کردیا۔ وہ سوچنے لگا کہ ایسا تو نہیں کہ اس پراسرار عمارت کی مافوق الفطرت قوتوں نے اس مکڑی کو اس الماری کی حفاظت پر مامور کیا ہو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ الماری میں کوئی ایسی چیز ہے جو قیمتی ہوسکتی ہے۔ یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس مکڑی کو صرف اسے دہشت زدہ کرنے کے لئے بھیجا گیا ہو۔

بہرحال قیصر نے اسے بھگانے کی کافی کوشش کی۔ مگر وہ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹی۔ بڑی دیدہ دلیر مکڑی تھی آخرکار جب قیصر اسے ہٹانے میں ناکام ہوگیا تو آخری چارے کے طور پر اس نے کرسی اٹھائی جو بہت بھاری تھی اس کا ایک پایا مکڑی پر دے مارا۔

مگر اس وقت وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ جب مکڑی پھر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ اور تو اور اس پر اس چوٹ کا اثر بھی نہ ہوا۔

اس پر چوٹ کراری پڑی تھی۔ عام مکڑی کا تو بھرکس نکل چکا ہوتا۔ کم از کم وہ پچک جاتی۔ مگر یہ تو جیسے لوہے کی بنی ہوئی تھی۔ لوہے کے نام پر قیصر کے ذہن میں جیسے بجلی سی کوند گئی۔ اور وہ سوچنے لگا کہ یہ واقعی لوہے کی تو بنی ہوئی نہیں ہے۔ ایک بے جان مکڑی احتیاط کے طور پر قیصر نے دو تین اور وار کیئے پھر اسے ایک پاؤں سے رگڑا بھی تب اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی لوہے کی بنی ہوئی ہے۔ مت پوچھیئے کہ اس وقت قیصر دل ہی دل میں کتنا شرمندہ ہوا۔ جب اسے پتہ چلا کہ وہ پرانے زمانے کے ایک عجیب وغریب قفل پر طاقت آزمائی کررہا تھا۔

بہرحال جب اسے یہ معلوم ہوگیا کہ عجیب و غریب ڈیزائن کا تالہ ہے۔ تو قیصر نے اسے کھولنے کی کوشش شروع کردی۔ پندرہ منٹ بعد ہی وہ اسے کھولنے میں کامیاب ہوا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے الماری کے دروازے پر ہاتھ لگایا۔ لیکن اس نے دروازہ کھلا تو قیصر پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اندر سے کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو آرہی تھی۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔ الماری میں کل چار خانے تھے۔ اور یہ کھانا اوپر سے دوسرے نمبر کے خانے میں

ایک صاف کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ باقی الماری خالی تھی۔ کھانے کی خوشبو اتنی پیاری تھی کہ اس کی بھوک یک بیک بڑھ گئی۔

قیصر کو اپنی دماغی حالت پر شک ہونے لگا۔ بھلا صدیوں سے بند الماری میں کھانا کہاں سے آیا۔ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ مگر خوشبو برابر قیصر کے ناک میں آرہی تھی۔ اور قیصر کے معدے میں بھوک کے مارے آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ بہت سے خیالات اس کے دماغ میں آکر گزر گئے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ سراب تو نہیں جیسے صحرا میں بھٹکے ہوئے پیاسے لوگوں کو ریت کے ذرات میں اکثر دریا کا پانی ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ پانی نہیں ہوتا۔ کم از کم اس وقت قیصر کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہو رہی تھی کہ بھوک لمحہ بہ لمحہ ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔

مگر اس کو صدیوں سے ویران اس خالی حویلی میں مزیدار اور تازہ کھانے کی خوشبو آرہی تھیں۔ اس کا دماغ گھومنے لگا۔ قیصر نے یہ بھی سوچا کہ شاید عمارت کے پراسرار مکینوں کو اس کی حالت پر رحم آگیا ہو۔ آخر جب برداشت کا مادہ نہ رہا تو قیصر نے ہاتھ بڑھا کر ڈرتے ڈرتے کھانے پر پڑا ہوا کپڑا ہٹادیا۔

اس وقت قیصر کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ مارے حیرت کے اس کی حالت عجیب ہوگئی تھی۔

درحقیقت اسے اپنی بینائی پر شبہ ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک بڑی سی ٹرے میں کئی پلیٹیں کھانے سے بھری ہوئی تھیں۔ جن میں تکے کباب کوفتے گوشت کا سالن، روٹیاں اور چند ایک دوسری چیزیں شامل تھیں اور سب سے حیرت ناک بات یہ تھی کہ کھانا گرم تھا۔ جس کی آنچ قیصر کو صاف طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر قبل کے عبرت انگیز واقعات پس منظر میں چلے گئے۔ اور قیصر نے ساری احتیاط بالائے طاق رکھ دی اور کھانا الماری سے اٹھا کر میز پر لے آیا اور بے اختیار کھانا شروع کردیا۔

قیصر نے سوچا تھا کہ اس آسیبی عمارت سے اس کا زندہ بچ نکلنا ناممکن ہے اس نے سوچا کہ جب اسے مرنا ہی ہے تو کیوں نہ کچھ کھا کر مرے پھر اسے یہ بھی خیال تھا کہ آگے نہ جانے کیا حالات پیش آئیں۔ اس لئے اس میں تو کچھ توانائی ہو۔ وہ کھانا اتنا لذیذ تھا کہ اس کی تعریف کرنے کے لئے قیصر کے پاس الفاظ نہ تھے۔ ایسا مزے دار اور لذیذ کھانا قیصر نے اپنی پوری زندگی میں نہیں کھایا تھا۔

خاص طور پر گوشت نہ جانے کس کا تھا۔ اس گوشت کی بے مثال لذت یہ بتا رہی تھی کہ آج تک قیصر گوشت کے نام پر گھاس کھاتا رہا ہے۔ وہ سب کی سب چیزیں ایک دوسرے سے زیادہ لذیذ تھیں۔ نہ جانے کس نے یہ کھانا بنایا تھا کہ بے اختیار قیصر پکانے والے کے ہاتھ چومنے کو جی چاہ رہا تھا۔ بے شک یہ عمارت خوفناک تھی۔ اور یہاں قیصر کو حد سے زیادہ اذیت برداشت کرنی پڑی تھی۔ لیکن اس لاجواب کھانے نے قیصر کی ساری تکلیف کا ازالہ کردیا تھا۔

اور گوشت نے تو اس کا دل خوش کردیا تھا۔ لہٰذا اب اسے موت کا بھی غم نہ تھا۔

ابھی قیصر نے چند ہی لقمے لئے تھے کہ پہلی بار وہ عجیب آواز اسے سنائی دی تھی۔ آواز بہت ہلکی تھی زوں..... زوں..... ہوسکتا تھا۔ کہ وہ آواز شروع سے ہی آرہی ہوں۔ مگر قیصر نے اپنی پریشانی کی وجہ سے نہ سنا ہو۔ ایک بار تو قیصر کھاتے کھاتے رک بھی گیا۔ نہایت حیرت انگیز آواز تھی۔ اور اس سناٹے میں بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ یوں جیسے اوپر سے کوئی ہوائی جہاز گزر رہا ہو لیکن قیصر نے زیادہ غور نہیں کیا۔ اور بدستور کھانا کھاتا رہا۔ پر تھوڑی ہی دیر بعد قیصر نے محسوس کیا آواز کچھ اور تیز ہوگئی ہے۔ مگر قیصر پھر بھی کھانے میں لگا رہا۔ اور اس وقت وہ تقریباً آدھی پلیٹ صاف کر چکا تھا۔ اور حقیقت میں کھانا، دو تین آدمیوں کا تھا۔ مگر اول تو قیصر کو بڑی بھوک لگ رہی تھی۔ دوسرا کھانا لذیز ہونے کی وجہ سے قیصر کھاتا ہی جارہا تھا۔

جب قیصر نے آدھا کھانا کھا لیا تو سالن کی پلیٹ سے ایک عجیب بوٹی اس کے ہاتھ میں آئی وہ لمبی سی نہایت عجیب سی بوٹی تھی۔ قیصر بہت حیران تھا کیونکہ وہ تھی ہڈی جیسی لیکن کسی حد تک گوشت کی طرح نرم بھی۔ قیصر نے ذرا غور سے دیکھا تو دہشت کی وجہ سے اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ نوالہ منہ سے نکل کر نیچے گر پڑا ہاتھ سے بوٹی نکل کر فرش پر گر پڑی۔ ایک بھیانک چیخ قیصر کے منہ سے نکلی اور وہ اچھل کر اس طرح کرسی سے اٹھا جیسے بھولے سے سانپ پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بوٹی نہ تھی بلکہ انسانی انگلی تھی۔ جس میں ابھی تک ناخن لگا ہوا تھا۔

قیصر کے ہوش وحواس پر جیسے بجلی سی گر پڑی اور قیصر کی روح تک لرزنے لگی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اب تک انسانی گوشت کھاتا رہا تھا۔

الٹیوں نے اس کی حالت اور زیادہ خراب کر دی۔

اور وہ بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑا۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی ہر چار سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پوری حویلی میں بھیانک سناٹا مسلط تھا۔ ایسے میں قیصر کو اپنے سانسوں کی آواز بھی یوں لگ رہی تھی جیسے اس کے قریب خون خوار درندے کھڑے ہانپ رہے ہوں۔

کافی دیر تک قیصر زمین پر یوں ہی ہانپتا رہا۔ کہ اچانک اسے پراسرار آواز سنائی دی۔

''ذوں.....ذوں.....اب اس آواز میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس پراسرار آواز نے بعد میں اسے تھوڑی دیر نا قابل بیان اذیت سے دو چار کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی قیصر اس آواز کا ممنون تھا۔ کہ اس نے تھوڑی دیر قبل کی اذیت ناک حالت اور ابکائیوں سے نجات دلا دی تھی۔ کیونکہ اس عجیب آواز کو سن کر ہی قیصر کا دھیان کچھ دیر پہلے کے کھانے اور انسانی گوشت سے ہٹ چکا تھا۔

اب قیصر کے دماغ میں بس یہی آواز گھوم رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی یہ آواز کچھ اور تیز ہو گئی۔ لہٰذا قیصر زمین سے اٹھ کھڑا ہوا منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے قیصر نے ایک سگریٹ سلگالی۔

آواز کچھ اس طرح سے آ رہی تھی کہ پورے کمرے میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔

لہٰذا قیصر نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کہ کہیں کوئی بھنورا تو نہیں گھس آیا۔ مگر کمرے میں ایک مکھی تک نہیں تھی اب قیصر نے کان لگا کر ذرا غور سے سنا تو معلوم ہوا کہ آواز باہر سے آ رہی ہے۔

تجسس نے قیصر کو مجبور کر دیا کہ وہ اس آواز کا پتہ چلائے لہٰذا وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا۔ دروازے تک آیا۔ اور کنڈی کھول دی۔ پھر دروازہ بھی کھول دیا۔ دروازہ چرچراہٹ کی ڈراؤنی آواز کے ساتھ کھل گیا اس آواز نے رات کے سناٹے کو مجروح کر دیا تھا۔ قیصر کمرے سے باہر آیا تو اس پراسرار آواز میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

قیصر نے غور سے سننے کی کوشش کی تو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ آواز بائیں طرف سے آ رہی ہے اس طرف باقی تو کمرے تھے۔ حالانکہ جس کمرے سے قیصر ابھی باہر نکلا تھا اس کمرے کی روشنی کھلے ہوئے دروازے سے باہر تک پہنچ رہی تھی۔ مگر پھر بھی تیسرے اور چوتھے نمبر کے کمروں کے باہر کافی اندھیرا سا پھیلا ہوا تھا۔ قیصر نے جیب سے ٹارچ نکالی اور اسے روشن کر کے آگے بڑھنے لگا۔ جب تیسرے کمرے کے دروازے تک پہنچا تو یوں لگا کہ وہ عجیب وغریب آواز اس کمرے کے اندر سے آ رہی تھی۔ آواز بے شک اس کمرے سے آ رہی تھی۔ مگر کمرے کے اندر مکمل تاریکی تھی۔

قیصر نے کواڑوں پر ذرا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ ویسے یہ بھی غور کرنے والی بات تھی کہ اس عمارت کا کوئی بھی کمرہ مقفل نہ تھا۔ جونہی دروازہ کھلا بدبو کا ایک جھونکا قیصر کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ اور وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور ناک پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس بدبو سے اسے ابکائیاں آنے لگیں۔

قیصر سوچنے لگا کہ یہ کمرہ نہ جانے کتنی مدت سے بند ہے۔ اندر کی ہوا خارج ہو تو وہ اندر جائے۔ چند منٹ بعد اس نے پہلے ٹارچ کی روشنی اندر کمرے میں ڈالی۔

پھر خود بھی اندر داخل ہو گیا۔ جس آواز کی تلاش میں وہ اس کمرے میں آیا تھا وہ آواز کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ لیکن قیصر اب بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ کہ وہ آواز کس چیز کی ہے اور کس طرف سے آ رہی ہے۔ لیکن اس کمرے سے بدبو آ رہی تھی۔ نہ جانے کس چیز کی تھی۔

قیصر نے ٹارچ کی روشنی کمرے میں چاروں طرف ڈالی۔ تو ایک بار پھر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

کمرہ خالی تھا۔ لیکن وہ آواز بلاشبہ اسی کمرے سے آ رہی تھی یہاں بھی ایک میز پر ایک کرسی اور ایک الماری موجود تھی۔ الماری کے دونوں پٹ بند تھے۔ اور اس میں ویسے ہی مکڑی نما تالا لگا ہوا تھا۔

تعفن اتنا شدید تھا کہ ایک منٹ وہاں رکنا بھی محال تھا۔ قیصر جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ تعفن اور آواز کہاں سے اٹھ رہی ہے۔ لہٰذا قیصر نے خود پر جبر کر کے ٹارچ روشن کی اور آگے بڑھ کر اس کی روشنی چوتھے کمرے میں ڈالی۔

لیکن روشنی ڈالتے ہی ایک تیز چیخ قیصر کے منہ سے نکلی۔ اور بے اختیار اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اندر ایک لاش تھی۔

جی ہاں ایک آدمی کی لاش کمرے کے وسط میں ایک رسی کے ذریعے چھت سے لٹک رہی تھی۔ رسی کا پھندہ آدمی کے گلے میں پڑا ہوا تھا لیکن لاش سر سے پاؤں تک سیاہ نظر آ رہی تھی۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں مکھیاں اس کی لاش سے چمٹی ہوئی تھیں۔ تبھی اس کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر جب روشنی محسوس کر کے مکھیاں اس کے چہرے سے اڑیں تو ایک بار پھر قیصر کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

اس لاش کی آنکھیں بھیانک انداز میں کھلی ہوئی تھیں زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور گالوں کا گوشت مکھیاں کھا چکی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ لاش کی آنکھیں قیصر پر مرکوز تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی اور اذیت کے ایسے تاثرات تھے کہ قیصر کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے گالوں سے ظاہر ہونے والی ہڈیوں نے اس کے چہرے کو اور خوفناک بنا دیا تھا۔

یہ منظر اتنا خوفناک تھا کہ قیصر بے اختیار چیخیں مارتا ہوا باہر بھاگا۔ اس وقت جیسے دل اس کے قابو میں نہ تھا۔ اور اس کے حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔

جب قیصر بے اختیار بھاگتا ہوا زینہ تک پہنچا تو جیسے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ ہوش ایک لمحے کو رخصت ہو گئے اور دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

زینہ کی درمیانی سیڑھیوں پر وہی خونخوار سیاہ بلا کھڑا قیصر کی طرف قہر بار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا رخ قیصر کی جانب تھا۔ اور اس کی سفاک آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

اچانک بلے کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور قیصر کے ہوش و حواس پر بجلی سی گری قیصر نے اپنی زندگی میں ہزاروں انسانوں کو مسکراتے دیکھا تھا لیکن کسی خونخوار جانور کو مسکراتے ہوئے آج پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

یقین جانیے اس بلے کی مسکراہٹ اتنی حیرت انگیز خوفناک اور پراسرار تھی کہ قیصر کی سانس رکنے لگی۔

دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا قیصر پتھر کے بت کی طرح اس کو گھورنے لگا۔ قیصر کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بے کار ہو چکی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے وہاں کھڑے کھڑے صدیاں گزر گئی ہوں۔ قیصر میں ہلنے جلنے کی طاقت بھی نہ تھی۔

قیصر کے جسم سے جیسے دم نکلا جا رہا تھا۔ اچانک بلا خوفناک غراہٹ کے ساتھ قیصر کی طرف لپکا۔ تو اسے ہوش آ گیا۔ اور قیصر واپس کمروں کی طرف بھاگا۔ ادھر بلے نے چھلانگ لگائی۔ ادھر قیصر دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ خونخوار بلے کا پنجہ اس کی ٹانگ پر پڑا۔ مگر قیصر دروازہ بند کر چکا تھا۔ پھر بھی بلا اس کے پائنچے کا ٹکڑا لے اڑا۔ پر اس کی قسمت اچھی تھی کہ صرف آدھا انچ کی کسر رہ گئی۔ اور یہ خطرناک سیاہ بلا قیصر کا پائنچہ ہی ادھیڑ سکا۔ جب تک وہ بلا دوسرا حملہ کرتا۔ وہ دروازہ بند کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

قیصر کا پورا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ پسینہ پانی کی طرح چوٹی سے ایڑی کی طرف بہہ رہا تھا۔ اور اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس کا رخ ابھی تک دروازے کی طرف تھا۔ لیکن بلے کی غراہٹیں سن کر وہ کمرے کی طرف مڑا تاکہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کر سکے۔ کیونکہ دروازے پر بلے کے پنجے نہایت تیزی سے پڑ رہے تھے دروازہ حالانکہ بے حد مضبوط تھا۔ لیکن بہت پرانا بھی تھا اور قیصر کو ڈر تھا کہ بلے کے پنجے اسی رفتار سے پڑتے رہے تو وہ جلد ہی دروازے کو گرا لے گا۔ لیکن جونہی قیصر کمرے کی طرف مڑا اس کا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا اوپر رہ گیا۔

قیصر سے چھ قدم کے فاصلے پر وہی سرکٹی عورت کھڑی تھی۔ جسے پہلے وہ کمرے میں مسہری پر لیٹے دیکھ چکا تھا اور جس کی کٹی ہوئی گردن سے خون بہہ رہا تھا۔

اس وقت اس کے دائیں ہاتھ میں اس کا اپنا ہی کٹا ہوا سر تھا۔ جسے اس نے بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ سیاہ میلے سے لباس میں ملبوس تھی۔ اس کے سر اور گردن سے خون ابھی تک جاری تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے کٹے ہوئے سر کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن ان آنکھوں میں وہ گول کالی پتلیاں نظر نہیں آ رہی تھیں جو ہر انسان کی آنکھوں میں ہوتی ہیں۔ پھر بھی اس کی آنکھیں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ اس کے آگے کے دو دانت کافی لمبے تھے۔ اور منہ سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ جن پر خون لگا ہوا تھا۔ جیسے وہ ابھی ابھی کسی کا خون پی کر آئی ہو۔ یہ منظر اتنا غیر فطری بھیانک اور خوفناک تھا کہ قیصر کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ جسم کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ سانس جیسے رک سی گئی۔ خوف سے قیصر کی گھگھی بندھ گئی۔ قیصر نے چیخنا چاہا لیکن اس کی آواز ہی نہ نکلی۔ قیصر نے پیچھے ہٹنا چاہا۔ لیکن قدموں میں جیسے جان ہی نہ رہی تھی۔

وہ ایک پتھر کے بت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور جسم سے جیسے خون کا ایک ایک قطرہ کسی نے نچوڑ لیا ہو۔ مارے خوف کے قیصر کی آنکھیں حلقوں سے نکل رہی تھیں۔

یہ تو سمجھنے میں نہ آنے والی بات تھی۔ کہ آدمی کا سر کٹنے کے بعد زندہ رہ سکتا ہے۔ اچانک اس زندہ لاش کے کٹے ہوئے سر سے ایک خوفناک قہقہہ بلند ہوا اور قیصر کو جیسے ہوش آ گیا۔ مگر اس کے حواس ابھی تک گم تھے۔ ادھر دروازے کے باہر وہ خونخوار بلا اپنے ناخنوں اور پنجوں سے مسلسل دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور آگے سرکٹی لاش جو یقیناً کوئی بدروح تھی۔

جو قیصر کے سامنے موت بن کر کھڑی تھی۔ اس کے منہ سے اب مسلسل قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ اور قیصر کا رہا سہا خون بھی خشک ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے اس کے آگے بھی موت اور پیچھے بھی موت تھی۔ جو اپنے بھیانک جبڑے کھولے دونوں طرف سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اچانک وہ سرکٹی لاش آہستہ آہستہ قیصر کی طرف بڑھنے لگی اور اس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تاکہ فرار کی کوئی راہ تلاش کر سکے لیکن اس کے آگے وہ ہی سرکٹی شیطانی روح کھڑی تھی۔ اور دائیں ہاتھ والے دروازے کا تصور ہی قیصر کو لرزہ براندام کر دینے کے لئے کافی تھا۔ کیونکہ تیسرے کمرے سے متصل چوتھے کمرے میں وہ چھت سے لٹکی ہوئی لاش اور اس سے چمٹی ہوئی وہ ہزاروں خونخوار اور آدم خور مکھیاں موجود تھیں۔

ادھر سرکٹی لاش قیصر کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے سر سے بلند ہونے والے قہقہے قیصر کے سر پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ اس کی مدافعت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ کیونکہ پے در پے واقعات نے اس کی حالت بہت بری کر دی تھی۔ اس وقت موت نے جس طرح دو اطراف سے قیصر کو گھیرا تھا اور جو کچھ قیصر کا دل محسوس کر رہا تھا۔ اس کا انداز صرف وہ ہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود اس قسم کے حالات میں کبھی گھرے ہوں۔

لہٰذا اس خوفناک اور جان لیوا صورت حال کا

خالد علی کی نگرانی میں کامیابی سے مسلسل

چھبیس سال سے شائع ہو رہی ہے

شمع کامیاب روحانی جنتری 2021

شائع ہوگئی ہے۔قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں۔

مؤلف۔اقبال احمد مدنی

شاہد علی

مذہبی تقریبات وتعطیلات 2021ء، 176 سالہ

شمسی ہجری کیلنڈر، اثرات قمر، بارہ ماہ 2021ء، مشکلات کا

حل، مستفسر کے دل میں کیا ہے؟، حضرت نعمت اللہ شاہ ولیؒ کی پیشین

گوئیاں، کسوف (سورج گرہن) خسوف (چاند گرہن) 2021، نقشہ سحر وافطار

رمضان المبارک برائے کراچی 2021ء، کھیل اور کھلاڑی، بچے اور ان کا

مستقبل، فہرست عرس ہائے بزرگان دین برصغیر 2021ء، قمر در عقرب اوقات

2021، کراچی سے تفاوت، جمیلہ پری کو قابو کرنے کا عمل، روزمرہ متناسبہ

سلسلہ لوگارثم، ہمزاد کو قابو کرنے کا عمل، برج کی

منسوبات، آخریات

قیمت-/120 روپے

شمع بک ایجنسی نوید اسکوائر اردو بازار کراچی

Ph:32773302

اندازہ قیصر کرسکتا تھا کہ اب اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ چنانچہ اس دہشت ناک صورت حال کا مقابلہ وہ زیادہ دیر تک نہ کرسکا۔ لہٰذا قیصر ہزیانی انداز میں چیخنے لگا۔

''رک جاؤ۔ رک جاؤ۔ میرے قریب نہ آؤ ورنہ ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔ قتل کردوں گا۔ بچاؤ۔ بچاؤ کوئی ہے مجھے بچاؤ بچاؤ۔''

مگر وہ خون آشام مروح برابر قیصر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس خوفناک بلا کو یوں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر قیصر اچھل کر پیچھے ہٹا اچھلتے وقت اچانک کوٹ کی جیب سے کوئی بھاری چیز قیصر کے ہاتھ سے ٹکرائی۔ تب اسے یاد آیا کہ اس کے پاس پستول بھی ہے۔ قیصر نے بجلی کی سی تیزی سے جیب سے پستول نکالا اور یکے بعد دیگر اس سرکٹی بدروح پر تین فائر کیے۔ لیکن اس وقت قیصر نے یہ عبرت ناک منظر دیکھا کہ تینوں گولیاں اسے لگیں اس کے جسم میں سوراخ بھی ہوئے۔ لیکن ان سوراخوں سے خون کا ایک قطرہ تک نہ نکلا۔ اور وہ برابر آگے بڑھتی رہی۔ البتہ اس کے قہقہوں میں اب اور شدت پیدا ہوگئی تھی۔

یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ گولیاں قیصر نے کسی اور پر چلائی ہوں۔ اس پر گولیوں کا ذرا برابر بھی اثر نہ ہوا۔ یہ ناقابل یقین منظر دیکھ کر خوف سے قیصر کی گھگھی بندھ گئی۔ اس وقت اس کا سارا وجود طوفان کی زد میں آئے ہوئے درخت کی طرح لرز رہا تھا۔ اس وقت قیصر کو اور کچھ نہ سوجھا تو پستول جیب میں رکھ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اپنے قریب رکھی کرسی اٹھائی اور پوری قوت سے اس زندہ لاش پر دے ماری۔ وہ بھاری کرسی سمیت الٹ کر پچھلی سمت جا گری۔ اور اس کے شیطانی قہقہے اس طرح رک گئے جیسے چلتے چلتے اچانک گراموفون ختم ہوجاتا ہے۔

جونہی وہ بدروح گری قیصر دائیں طرف والے دروازے کی طرف بھاگا۔ اور اسے کھول کر تیسرے کمرے میں آ گیا۔ اور جلدی سے اسے بند کردیا۔ تاکہ وہ آدم خور بلا اندر نہ آنے پائے۔ فوری طور پر تو قیصر نے خود کو ان بلاؤں سے بچالیا تھا لیکن آخر کب تک جلد یا بدیر وہ اسے بھی پکڑیں گے۔ ظاہر ہے ان بدروحوں کے لئے بند دروازے کیا اہمیت رکھتے تھے۔ اب اس سرکٹی لاش کی طرف ہی غور کیجئے قیصر نے اسے پہلے کمرے میں بستر پر لیٹے دیکھا تھا مگر نہ جانے کس طرح وہ بلا دوسرے کمرے میں آ گئی تھی۔ یہ کمرہ قیصر پہلے ہی روشن کرچکا تھا۔ یہ تیسرا کمرہ تھا۔ اور وہ دروازہ ابھی تک اسی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ ناقابل برداشت تعفن اسی طرح اس رسی سے لٹکی ہوئی لاش سے اٹھ رہا تھا۔ مگر اس میں وہ دروازہ بھی بند کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ قیصر کا دماغ ابھی تک گھوم رہا تھا۔

دل کی دھڑکن بے ترتیب تھیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کام نہیں کررہی تھیں۔ چاروں طرف موت اپنے پنجے تیز کررہی تھی۔ باہر وہ قیصر کے خون کا پیاسا قد آور بلا موجود تھا۔ برابر کے دوسرے کمرے میں وہ سرکٹی شیطانی روح اس کا خون پینے کو بے چین تھی۔ چوتھے کمرے میں وہ چھت سے لٹکی ہوئی لاش اور آدم خور مکھیاں نیچے وہ خوفناک سانپ جو یقیناً قیصر کو جکڑنے کے لئے بے قرار تھا۔ اس بھیانک عمارت کی ایک ایک چیز قیصر کی دشمن تھی۔ چاروں طرف سے موت قیصر پر نظر گاڑے ہوئے تھی۔

اس وقت قیصر کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سیاہ دیواروں کا ایک ایک پتھر قیصر کو گھور رہا ہو۔ تاکہ وہ اسے جکڑ سکے یہاں تھوڑی دیر کے لئے قیصر کی زندگی محفوظ ہو گئی تھی۔ لیکن بدبو اور تعفن نے قیصر کا دماغ الٹ کر رکھ دیا تھا۔ اب اس کے اعصاب آہستہ آہستہ قیصر کا ساتھ چھوڑتے جارہے تھے۔ ادھر بھوک پیاس، بھاگ دوڑ اور خوف و دہشت نے اس کی جان نکال دی تھی۔ لیکن اس وقت سب سے بڑا مسئلہ اس تعفن کا تھا۔ جس سے قیصر کسی بھی طرح نجات حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ اس وقت وہ بے بسی کی انتہا پر تھا۔

وہ موت کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ مگر اس وقت موت بھی اس سے دور بھاگ رہی تھی۔ اس سرکٹی لاش کے ہاتھوں یا اس خونخوار بلے کے ہاتھوں۔

اذیت کی موت قیصر کو پسند نہیں تھی۔ ادھر زندگی بھی کوسوں دور تھی۔ عجیب بے کسی کا عالم تھا قیصر نہ جی رہا تھا نہ مر رہا تھا۔ قیصر اب سوچ رہا تھا کہ اس دماغ پاش بدبو سے کس طرح پیچھا چھڑائے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ اس لاش کو کس نے یہاں لٹکایا ہے۔ اتنا تو پتہ چل رہا تھا کہ اس آدمی کو پھانسی دی گئی تھی۔ مگر کیوں کیا یہ آدمی بھی اس کی طرح نادانستگی میں اس عمارت میں داخل ہوا تھا۔ یا اس نے خودکشی کی تھی۔ قیصر کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا اس منحوس حویلی کی ہر بات قیصر کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

قیصر کو تعجب تھا کہ اس شیطانی عمارت میں اس کے علاوہ بھی کوئی داخل نہیں ہوا۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ قیصر سوچنے لگا کہ وہ اتنا چیختا چلاتا رہا۔ مگر باہر سے ٹرین والوں نے نہ اس کے کسی بھی دوست نے اس کی آواز کیوں نہ سنی اور اس کی مدد کو کیوں نہ آئے..... کیا اس کی چیخیں باہر کسی نے نہیں سنی۔ اگر یہاں کی آوازیں انہوں نے سنی ہوتیں تو وہ دریافت حال کے لئے ضرور آتے۔ جب یہاں بہت سی شیطانی چیخیں اور قہقہے بھی گونجتے رہے۔ اور یہ ساری آوازیں جس طرح سے بلند ہوتی تھیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ رات کی تاریکی میں بہت دور دور تک سنی جا سکتی تھیں۔ لیکن یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ یہاں کی آوازیں باہر نہیں سنی جا سکتیں۔

یہ بات نہایت تعجب خیز تھی۔ جب کہ ٹرین بھی عمارت سے کافی نزدیک تھی۔ اور کافی لوگ گھوم پھر رہے تھے۔ اور اس کے سب دوست بھی اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اب قیصر کو یہ امید بھی دم توڑتی محسوس ہوئی کہ باہر سے کوئی آئے گا۔ قیصر کا دل بیٹھنے لگا۔ قیصر کو اپنے زندہ بچنے کی اب کوئی امید نہ رہی تھی۔ وہ حالات کے آگے بالکل بے بس ہو گیا تھا۔

اگر کوئی انسان ہوتا تو وہ مقابلہ کر بھی سکتا تھا۔ لیکن مافوق الفطرت ہستیوں سے مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ قیصر اپنے پستول کو بے اثر ہوتے دیکھ چکا تھا۔ بھلا ان شیطانی قوتوں سے ٹکرانا اس کے بس کی بات کہاں تھی اور پھر حقیقت بھی یہ تھی کہ اب اس میں ہمت نہ تھی نہ حوصلہ کہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے کچھ کر سکتا۔ وہ ان بلاؤں میں مکمل طور پر گرفتار ہو چکا تھا۔

ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ پچھلی سمت کی کھڑکی کھول کر وہ نیچے چھلانگ لگا دے۔ چاہے ہاتھ پیر ہی کیوں نہ ٹوٹ جائیں۔ مگر جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ وہ کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔ اتنا وہ جانتا تھا کہ تیس فٹ نیچے کودنا اور پھر ہاتھ پیروں کا سلامت رہ جانا بے حد مشکل تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو پھر ساری زندگی معذوری کی زندگی بسر کرنا پڑتی اور پھر یہ بھی ممکن تھا کہ نیچے کودنے سے اور ہاتھ پاؤں ٹوٹنے کے بعد اگر وہ آدم خور بلا یا سانپ یا وہ سرکٹی عورت اسے پکڑ سکی تو وہ بھاگ سکتا، نہ ہی مقابلہ کرنا اس کے بس میں ہوتا۔ لہٰذا قیصر نیچے کودنے کی ہمت نہ کر سکا۔

قیصر کی حالت ابھی تک خراب تھی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ دماغ سنسنا رہا تھا اور بدن کانپ رہا تھا۔

قیصر کی حالت اس وقت اس چوہے جیسی تھی۔ جس کے چاروں طرف خونخوار بلیاں غرا رہی ہوں۔

اس آسیب زدہ حویلی میں قیصر کا ایک ایک پل کانٹوں پر بسر ہو رہا تھا۔ اور اسے کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ ہر آن یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں شیطانی بدروح اور وہ خونخوار بلا یہاں بھی نہ آ پہنچیں ادھر مکھیوں کی بھنبھناہٹ ابھی تک جسم میں سنسنی پیدا کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ آدم خور مکھیاں اگر اس سے آ چمٹیں تو دنیا کی کوئی طاقت قیصر کو ان سے نجات نہ دلا سکتی تھی۔ ادھر بدبو نے الگ ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اس کے چاروں طرف موت ہی موت تھی۔ جب کہ زندگی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

مصیبت کے اس لمحات میں ہر انسان کو خدا ہی یاد آتا ہے۔ خودغرض انسان کو جب کوئی فکر نہیں ہوتی تو وہ بھول کر بھی خدا کو یاد نہیں کرتا۔ مگر جب اس پر برا وقت آتا ہے اور وہ مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر

اس کی طرف بڑھا تھا اگر قیصر کے ہاتھ سے ٹارچ نہ گرتی تو وہ خوفناک سانپ بے خبری میں قیصر کو ڈس لیتا۔

اب موت قیصر سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر تھی۔

کہ اس لمحے بلے کی خوفناک غراہٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی عورت کے منہ سے قہقہہ گونجا۔ اور قیصر نے سوچے سمجھے بغیر سانپ کے اوپر سے چھلانگ لگا دی اور راہداری میں بھاگنے لگا۔

راہداری عبورت کرتے ہی سامنے دروازہ آ گیا جو ڈھانچے والے کمرے میں کھلتا تھا دروازہ اندر آتے وقت قیصر نے کھولا تھا۔ وہ اسی طرح کھلا ہوا تھا۔ قیصر نہایت تیزی سے بھاگتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا جہاں ڈھانچہ موجود تھا۔

اس وقت موت کے خوف سے قیصر کا دم گھٹ رہا تھا اس کے پیچھے بلے کی غرانے اور عورت کے خوفناک قہقہوں کی آوازیں مسلسل گونج رہی تھیں۔

مگر قیصر نے کسی طرف دیکھا تک نہیں اور بھاگ کر کھڑکی تک پہنچا۔ اور نہایت تیزی سے اسے کھول دیا۔ جہاں سے گزر کر وہ اس شیطانی حویلی میں داخل ہوا تھا۔ کھڑکی کھلتے ہی قیصر کو اپنے پیچھے اس ڈھانچے والے کمرے میں بہت نزدیک سے بلے کی غرانے کی آوازیں سنی۔ مگر قیصر نے مڑ کر دیکھنے میں بھی وقت ضائع نہیں کیا۔ اور کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔

اس وقت قیصر کو اندازہ ہوا کہ اس کے منہ سے ہذیانی انداز میں چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔

باہر گرتے ہی وہ چیختا ہوا اس طرف بھاگا جہاں اس کے دوست بیٹھے تھے۔

پر اچانک ہی بھاگتے ہوئے وہ کسی سے ٹکرایا اور لڑکھڑاتا ہوا دور جا گرا اس اچانک ٹکر سے وہ بے ہوش ہو گیا۔

بے ہوش ہوتے ہوئے جو آخری احساس تھا۔ قیصر کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ سرکٹی لاش سے ٹکرایا ہے۔

قیصر کو جب ہوش آیا تو وہ حیران حیران سی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا اس نے آپ آپ کو ٹرین کے ڈبے میں موجود پایا۔ وہاں پر سب دوست فلک زاہد، وارث، چاند زیب، ضرغام محمود، سکندر حبیب اور احسان سحر سب موجود تھے۔ اور وہ سب ہی قیصر کو حیرانگی سے دیکھ رہے تھے۔ قیصر سب کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''مم..... میں یہاں کیسے آ گیا۔ وہ سرکٹی لاش خونخوار بلا، وہ سانپ وہ پراسرار حویلی سب کہاں ہے۔''

فلک زاہد آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ''قیصر جب تمہیں گئے ہوئے کئی گھنٹے ہو گئے اور تم نہ آئے تو ہم سب پریشان ہو گئے اور تمہیں دیکھنے کے لئے حویلی کے پاس پہنچے ہی تھے کہ

اچانک تم چیختے چلاتے ہوئے اس حویلی کی کھڑکی سے چھلانگ مار کر بھاگتے ہوئے سکندر سے ٹکرائے، اور ٹکراتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ اور ہم تمہیں اٹھا کر یہاں ٹرین میں لے آئے۔ اور تو اور تمہیں چار گھنٹے بعد ہوش آیا ہے۔ اب ٹرین کا انجن آ کر لگ چکا ہے اور ٹرین بھی چلنے والی ہے۔ اس لئے تمہیں اندر لے آئے تھے۔ پر وہاں قیصر تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا کہ تم اتنے گھبرائے ہوئے تھے۔

قیصر نے شروع سے لے کر آخر تک سارے واقعات سنا دیئے۔ جو اس کے ساتھ پیش آئے تھے جسے سن کر سب حیران رہ گئے اور قیصر کو حیرانگی سے دیکھنے لگے۔ کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ یا اس کی دماغی حالت خراب ہے۔

ٹرین ایک جھٹکے سے چل پڑی لاہور سے کراچی جانے کے لئے، چلتی ٹرین سے سب کی نگاہ پیچھے جاتی ہوئی پراسرار حویلی کی طرف تھی۔ اور قیصر اس حویلی کو دیکھتے ہوئے لرز رہا تھا۔ کہ جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ سرکٹی لاش پھر نہ آ جائے۔

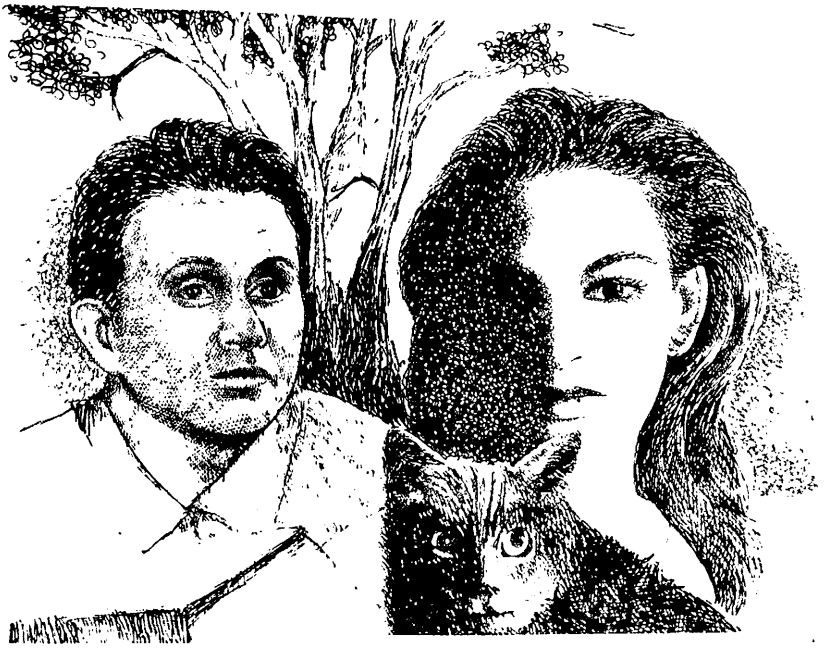

جنات کا بسیرا

خلیل جبار

اچانک عامل کی آواز سنائی دی تم نے ناحق لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے، اس اسکول میں بچے پڑھتے ہیں کیا تمہین اس کا احساس ہے یہ جگہ چھوڑ کر چلے جاؤ کیا جنات ایسے ہی ہوتے ہیں۔

خوف کے افق..... پر تہلکہ مچاتی اور دلوں پر سکتہ طاری کرتی..... خوفناک..... کہانی

اسکول کے باہر بچے جمع تھے۔ اسکول کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ پرائمری اسکول پنجرہ پول میں نور مسجد کے پاس واقع تھا۔ میری عادت تھی میں ہمیشہ مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے اسکول پہنچ جاتا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ میں آج دس منٹ لیٹ تھا۔

مجھے اسکول پہنچنے پر سب سے پہلے جو جھٹکا لگا وہ یہ تھا کہ آج بچے اسکول کے اندر کیوں نہیں جا رہے ہیں۔ آج چھٹی کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا۔ رات گئے ہلکی ہلکی بارش ضرور ہوئی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بچوں کی چھٹی کر دی جائے۔ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

رفاقت، جیلانی، فیض محمد عرف فیضو، محمد علی عرف پاکولا، جہانگیر اور دیگر دوست ایک جگہ موجود تھے۔ جیلانی کی والدہ کی نوکری شام کی شفٹ میں تھی۔ اسکول

"یہ انسانوں کی آبادی ہے، جنات کا انسانوں کی بستی میں کیا کام تم جنگلوں میں اور ویران جگہوں میں جا کر بسیرا کرو۔" عامل غیاث الدین نے کہا۔

"ہمیں انسانوں کی بستی میں رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

"تمہیں جانا ہوگا، ورنہ میں تمہیں جلا کر بھسم کر دوں گا۔"

"جلا کر بھسم کر سکتے ہو تو کر دو ہم اب یہاں سے نہیں جائیں گے۔" بوری سے آواز آئی۔

"ٹھیک ہے میں اپنا عمل شروع کر رہا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے عامل غیاث الدین نے کوئی خاص عمل شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر گزرنے پر بوری میں سے آوازیں آنے لگیں۔

خدا کے لیے ہمیں معاف کر دو ہمیں جلانا نہیں ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"اور اگر تم نہیں گئے تو پھر۔"

"ہم وعدہ کرتے ہیں یہاں سے چلے جائیں گے پھر لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ تم نے جو عمل شروع کیا ہے وہ بند کر دو۔"

"کیوں؟"

"اس خاص عمل سے ہمیں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں اپنا عمل بند کر رہا ہوں تم اپنا وعدہ نبھاؤ۔"

بوری آہستہ آہستہ پھولنا کم ہوتی چلی گئی اور اپنی اصلی حالت میں آ گئی۔

"لو بھئی آسیب اسکول سے چلا گیا۔" عامل نے کہا۔

"یہ واپس تو نہیں آئے گا۔"

"آسیب کو میری طاقت کا علم ہو گیا ہے اس لیے یہ دوبارہ اسکول میں آنے کی حماقت نہیں کرے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو، ایک بات میر سمجھ میں نہیں آئی۔" ہیڈ ماسٹر نے پوچھا۔

"کون سی بات؟"

"آسیب کو گندم کی بوری میں کیسے بند کیا۔"

"یہ ایک خاص عمل ہے اس کے ذریعے میں آسیب کو بوری میں بند کر دیتا ہوں جسے سزا دینا ہوتی ہے میں بوری پر ڈنڈے برسانا شروع کر دیتا ہوں۔ میں نا جانے ایسے کتنے ہی شریر جنات کو سدھار کر رکھ دیا ہے۔" عامل نے کہا۔

"واقعی ہمیں یہ نظر بھی آ گیا ہے، کس طرح جنات کو ٹھیک کرتے ہو۔" ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

"ویسے یہ دوبارہ نہیں آئے گے اور اگر دوبارہ آ جائیں تو مجھے اطلاع کر دینا میں ان کو جلا کر بھسم کر دوں گا۔" عامل نے کہا۔

عامل غیاث الدین کے چلے جانے پر تمام بچوں کو اسکول کے اندر بلا لیا گیا۔ سب بچے حیرت سے اسکول کو دیکھ رہے تھے۔ مجھے تجسس تھا کہ دیکھوں چھت پر پاؤں کے نشانات ہیں یا بچے جھوٹ بول رہے ہیں۔ صحن میں چٹائی بھی پڑی تھی۔ جو رفاقت پر آ کر گری تھی۔ چوتھی جماعت میں جا کر میں نے چھت کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہاں واقعی چھت پر پاؤں چھپنے کے نشانات موجود تھے۔

ہم پہلی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس لیے وہ پہلی منزل پر تھی اس لیے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر چلے گئے جہاں سرور صاحب ہمیں پڑھاتے تھے۔

جنات کی لوگوں کو ڈرانے کی کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ جنات دوبارہ پھر اسکول میں نہیں آئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ یہ واقعہ لوگوں کے ذہنوں سے نکل گیا تھا۔ جن لوگوں نے یہ واقعہ دیکھا تھا ان کے ذہنوں میں یہ واقع اس وقت آ جاتا ہے جب آسیب کے متعلق باتیں ہو رہی ہوں۔

حویلی کا آسیب

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

رات کا سناٹا اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والی ایک دل گریفتہ حقیقی روداد، جو کہ کہانی پڑھنے والوں کو عجیب دنیا کی سیر کرائے گی، کہانی کی حقیقت کہانی میں پنہاں ہے۔

حقیقت سے انکار کرنے والے ایک نوجوان کی داستان حیرت جو اچنبھے میں ڈال دے گی

سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی شام تھی..... سردی..... اور وہ بھی کوئٹہ جیسے مقام کی۔ قندھاری چلنے کے بعد یوں معلوم ہوتا تھا گویا تمام کائنات ہی جم کر رہ جائے گی۔ یخ بستہ ہواؤں نے روز مرہ کی زندگی مفلوج کر کے رکھ دی تھی اور کوئٹہ کے باسی سرِشام ہی اپنے اپنے گھروں میں مقید ہو کر رہ گئے تھے۔

میں اپنے شوہر کے پاس آتش دان کے سامنے بیٹھی سوئیٹر بن رہی تھی۔ ہماری گفتگو کا موضوع آسیب زدہ مکان تھے باتوں ہی باتوں میں برگزیدہ ہستیوں اور سانپوں وغیرہ کا ذکر چل نکلا جو کسی مقام کو اپنا مسکن بنا کر رہنا شروع کر دیتے ہیں..... میں نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

''کیا ایسا ہونا ممکن ہے کہ ایک بزرگ کسی مکان میں اپنا ٹھکانا بنالیں؟''

''پہلے تو میں بھی اس پر یقین نہیں رکھتا تھا۔''

اس نے جواب نہ دیا اور اشارے سے پانی مانگا۔ پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد اس کی طبیعت بڑی حد تک سنبھل گئی مگر اس کی آنکھیں ہنوز ویران ویران سی نظر آرہی تھیں۔ اس کے پسینے سے تر جسم کو دیکھتے ہوئے میں نے پنکھے کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے خاطر خواہ اثر دکھایا اور صادق اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''اعجاز میاں، بڑے پریس کے ساتھ ایک تعویذ لٹکا ہوا ہے۔ ذرا لپک کر لے آنا۔'' یکا یک صادق مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

میں نے چشم زدن میں تعویذ لا کے اسے دے دیا جسے گلے میں ڈالتے ہی اس کی طبیعت میں حیرت انگیز تغیر رونما ہو گیا اور وہ حسب سابق چاق چوبند نظر آنے لگا۔ اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر ٹھہرے لہجے میں بولا۔

''اس حویلی میں بزرگ کے قیام کو آج تک محض ایک دھکوسلا ہی سمجھتا رہا، مگر اب ان کی حقیقت مجھ پر واضح ہو چکی ہے اور یقیناً اس بابرکت ہستی کے طفیل میں نے آج ایک نئی زندگی پائی ہے۔

ہم سب متجسانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے اور مجھے اس کے یہ الفاظ سن کر دلی مسرت ہوئی۔ اس نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

تقریباً تین برس ہوئے، میں اور میرا ایک دوست رات کے وقت برما کے گنجان جنگلوں میں سے گزر رہے تھے جاپانی فوجیں ہر محاذ سے پسپا ہو رہی تھیں اور اتحادی فوجیں ان کا تعاقب کرتی ہوئی مسلسل آگے بڑھ رہی تھیں۔ ہم دونوں اپنی یونٹ سے بچھڑ چکے تھے۔ اور اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور دور دور تک کسی متنفس کا نام و نشان تک نہ مل رہا تھا۔

ہم قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے، جھاڑیوں سے الجھتے بدستور آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہمارے کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ ہمارے جسم تھکن سے چور ہو چکے تھے۔ جگہ جگہ خراشیں آئی تھیں۔ اور ان میں ناقابل برداشت جلن ہو رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ یہیں لیٹ کر گہری نیند سو جائیں۔

مگر جان ہر حال میں عزیز ہوتی ہے۔ ہم صبح ہونے سے قبل اپنی یونٹ سے مل جانا چاہتے تھے، کیونکہ ان دنوں اکاؤ کا جاپانی سپاہی جنگلوں میں بکھرے پڑے تھے جو موقع ملتے ہی اتحادی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر گھنے جنگلوں میں روپوش ہو جاتے..... ہمارے قدم اٹھتے رہے اور ہم ہر ٹھوکے پر چونکتے رہے مگر ہم رکے نہیں بدستور آگے بڑھتے رہے۔ اس سنسان جنگل میں اگر پتہ بھی گرتا تو دل دہل جاتا اور بے اختیار انگلی رائفل کے ٹریگر پر جا پہنچتی۔

اچانک جنگل کی خاموش فضا گھنگھروؤں کی چھن چھن سے مرتعش ہو گئی۔ ہم دونوں کانپ اٹھے۔ ہلکی سی خنکی ہونے کے باوجود میرا تمام جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ یہی حال میرے ساتھی کا بھی ہوا۔ دوسرے ہی لمحے ہم دونوں قریب ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔

''یہ کیسی آواز تھی؟'' میں نے دھڑکتے دل سے سرگوشی کی۔

''خدا جانے!'' میرے ساتھی نے دھیرے سے کہا اور اندھیرے میں اپنی نگاہیں مرکوز کر دیں۔

یکا یک وہی آواز رات کے سناٹے کو ایک بار پھر تہہ و بالا کر گئی اور اس کے ساتھ ہی خوف اور دہشت سے میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔ اندھیرے کی وجہ سے مجھے اپنے ساتھی کی حالت کا علم نہ ہو سکا، مگر میری حالت اس وقت نہایت دگرگوں ہو رہی تھی۔

اچانک مجھے اپنا دل حلق میں اٹکتا محسوس ہوا کیونکہ اس بار گھنگھروؤں کی آواز ہمارے بالکل نزدیک تھی۔ میں دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد کرنے لگا اور پھر دوسرے ہی لمحے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ایک نہایت حسین اور نوجوان لڑکی زیورات سے لدی پھندی زرق برق لباس میں ملبوس ہمارے قریب ہی اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ اس کے پاؤں کی ہر حرکت کے ساتھ

...ں کی بھنکار پیدا ہوتی تھی۔ میری پیشانی پسینے
...نی اور میں نے اپنے ساتھی کا شانہ مضبوطی سے
...ا ساتھی دھیرے سے میرے ہاتھ تھپتھپاتا ہوا
...
...صادق حوصلہ رکھو، میری موجودگی میں یہ تمہارا
...تی۔''
''...یہ ہے کون؟'' میں نے کپکپاتی آواز میں
...لی

کوئی بھی ہو، مگر انسان نہیں۔ اس نے بدستور ...کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

میرا دوست ایک نیک اور پرہیزگار شخص ہونے ... ایک اچھا عامل بھی تھا۔ لہٰذا میں اس کی بات ...نے کی جسارت نہ کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ منہ ...میں کچھ بڑبڑاتا رہا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور ...آہستہ قدموں سے اس کے ساتھ چل دیا۔ یہ ...میری جان ہی نکل گئی کہ اس پراسرار لڑکی نے بھی ...پیچھا کرنا شروع کر دیا تھا۔

''یار اس بلائے ناگہانی سے تو پیچھا چھڑاؤ۔'' میں نے اپنے ساتھی سے کہا۔

''فکر مت کرو...... یہ ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچا ...تی۔'' میرے ساتھی نے میری ڈھارس بندھائی۔

اپنے دوست کی موجودگی میں رفتہ رفتہ میر ...خوف بالکل دور ہو گیا۔ یکایک میرے ذہن میں ایک ...خیال نے جنم لیا...... میں نے دل میں سوچا کہ اپنے دوست کا علم آزمایا جائے۔ دیکھیں تو سہی اس کے عامل ہونے میں کتنی حقیقت ہے۔ لہٰذا میں نے اسے ...مایا کہ ''اس لڑکی کو قائل کر کے اپنے قابو میں کرو۔'' پہلے تو وہ نہ مانا، مگر میرے بار بار مجبور کرنے پر آخر وہ راضی ہو گیا اور زیر لب بولا۔

''دیکھو صادق تمہارے مجبور کرنے پر میں تمہیں ایک تماشہ دکھاتا ہوں گھبرانا بالکل نہیں۔''

وہ رک گیا اور مجھے بھی ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ اس دوران میں وہ مسلسل زیر لب کچھ پڑھتا رہا۔ اس کے

ڈائجسٹوں کی خوفناک مشہور کہانیاں

عیار ناگن

اس کتاب میں دیگر کہانیاں اصل روپ، آسیبی چیل، کالا ناگ، خطرناک عمل، پراسرار پھندا، پراسرار فقیر، پیاسی ناگن، قبر کا بچھو، دوست کا آسیب، روح کو قرار، قلعے کا بوڑھا، آسیبی روح، پیٹو آسیب، مہمان جن، روح کا انتقام، آسیبی مکان، چڑیل کی واپسی، بھٹے کا آسیب، آسیبی ڈھانچہ شامل ہیں۔

تحریر: خلیل جبار　　قیمت-/300روپے

ڈائجسٹوں کی مشہور کہانیاں

بہروپیا عامل

اس کتاب میں دیگر کہانیاں نیا فیصلہ، دوستی، وہ لمحہ، ناکردہ گناہ، خودسری، مجبور زندگی سے نجات، پراسرار قتل، جاندار کردار، بڑی غلطی، چسکا، شناخت شامل ہیں۔

تحریر: خلیل جبار　　قیمت-/300روپے

گھر بیٹھے کتاب منگوائیں، واٹس ایپ پر آرڈر دیں

واٹس ایپ نمبر: 0324-7232580

ڈرپبلی کیشنز

نورانی آرکیڈ نیوار دو بازار کراچی

نہیں ہورہے تھے ان دونوں نے بچے کو دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور دوسرے ہی پل انہوں نے بچے کو اُٹھا کر پجارو میں ڈال لیا۔۔۔ بچہ بری طرح سے مچلا لیکن بے سود، پھر اس کے بعد وہ پجارو فراٹے بھرتی ہوئی ایک خوبصورت سے بنگلے کے سامنے جا کر رکی وہ بنگلہ پالن پور کے خوبصورت بنگلوں میں سے ایک تھا ان دونوں نے پجارو سے ہارن دینا شروع کر دیئے، چند ہی ہارن کے بعد بنگلے سے ایک سرتاپا سیاہ رنگ کے لباس میں ملبوس ایک سیاہ پوش باہر آیا اس سیاہ پوش نے ان دونوں کو ایک نظر دیکھا۔ ''جاؤ۔۔۔ اس کو اندر لٹا دو۔۔۔'' سیاہ پوش کے حلق سے آواز نکلی جو کہ قدرے بیٹھی ہوئی تھی یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا گلا خراب ہے۔

ان دونوں نے بچے کو گاڑی سے باہر نکالا جو کہ بے ہوش تھا اور بنگلے کے اندر داخل ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد سیاہ پوش بڑی سرعت سے جیب سے ایک ڈیوائس نکال کر پجارو کے نیچے چپکا دی، دراصل وہ ڈیوائس ایک ٹائم بم تھا جو کہ مخصوص وقت کے بعد بعد پھٹ جانا تھا بچے کو اندر لٹانے کے بعد وہ دونوں باہر آ گئے۔

سیاہ پوش نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور ان دونوں کی جانب اچھال دی، اس کے بعد وہ دونوں سلام کر کے پجارو اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گئے پجارو جیسے ہی تھوڑا آگے گئی ایک زوردار دھماکے سے پجارو کے پرخچے اُڑ گئے۔

شہر میں بچوں کے اغوا کی چوتھی واردات تھی پولیس کی لاکھ کوششوں کے باوجود اصل مجرم کا سراغ نہیں ملا تھا صرف ہر واردات کے بعد ایک جلی ہوئی گاڑی ملتی جو کہ بہت زیادہ مہنگی ہوتی تھی بچوں کے والدین بھی خوفزدہ تھے کوئی بھی اپنے بچے کو اکیلا نہیں چھوڑتا تھا پھر بھی کوئی نہ کوئی واردات ہو جاتی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات آہستہ آہستہ گزرتی جارہی تھی چاروں طرف گہرے سناٹے کا راج تھا۔۔۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ آتش دان میں بھڑکتے شعلے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ رات نہایت سرد ہے، یوں بھی پہاڑی علاقوں میں پڑنے والی سردی کی شدت ملک کے دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

فرح آتش دان کے سامنے بیٹھی ایک دلچسپ ناول کا مطالعہ کر رہی تھی، ناول اس قدر دلچسپ اور سنسنی خیز تھا کہ وہ اسے پورا پڑھے بغیر اُٹھنا نہیں چاہتی تھی، ویسے راتوں کو دیر تک جاگنا اس کے فرائض میں شامل تھا کیونکہ ڈاکٹر کاشان اکثر راتوں کو دیر سے گھر آتے تھے کیونکہ جب بھی کوئی بڑا آپریشن آتا تھا تو ڈاکٹر کاشان کو یاد کیا جاتا تھا ڈاکٹر صاحب ایک بہترین قسم کے نیورو سرجن تھے ڈاکٹر صاحب ابھی تک اسپتال سے واپس نہیں آئے تھے چنانچہ وہ ڈاکٹر صاحب کا انتظار کرتے ہوئے وقت گزاری کے لئے مطالعہ گاہ میں جا کر کتاب کا مطالعہ شروع کر دیتی چنانچہ آج بھی وہ یہی کر رہی تھی اس بنگلے میں دو مطالعہ گاہ موجود تھے ایک فرح کے یوز میں دوسری مطالعہ گاہ ڈاکٹر کے یوز میں تھی جس میں ڈاکٹر اپنے سوا کسی کو بھی نہیں جانے دیتا تھا چنانچہ روزانہ رات دیر تک فرح مطالعہ کرتی ڈاکٹر کاشان نے کئی دفعہ اس کو کہا کہ اس کا انتظار نہ کیا کرے سو جایا کرے تو وہ مسکرا کر جواب دیتی کہ آپ کا انتظار کرنا اچھا لگتا ہے۔

ڈاکٹر سے فرح کی شادی محبت کی شادی تھی پالن پور کے اس واحد اسپتال میں فرح شادی سے پہلے ایک نرس تھی پورے نرسنگ اسٹاف میں فرح ہی وہ واحد نرس تھی جو کہ بے حد اسمارٹ اور خوبصورت تھی اس کی بڑی بڑی کٹورا سی آنکھوں میں دیکھنے پر جھیلوں کا سا گمان محسوس ہوتا تھا یوں لگتا تھا کہ جیسے کہ وہ آنکھیں کوئی دو حسین جھیلیں ہوں جن میں کسی وقت بھی تلاطم پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے بڑے بڑے کالے سیاہ بال گھٹاؤں کی مانند محسوس ہوتے تھے چہرے پر حد درجہ معصومیت پریوں کا سا گمان ہوتا تھا غرض فرح بے حد خوبصورت تھی بہت سے لوگوں نے فرح کی جانب دلچسپی دکھانے کی کوشش کی

لیکن فرح ان کے دام میں نہ آئی پھر ایک روز اسپتال میں ڈاکٹر کاشان کی آمد ہوئی ڈاکٹر کی مردانہ وجاہت کو دیکھتے ہی وہ دل ہار گئی تھی شاید اسی کو پہلی نظر کی محبت کہتے ہیں۔ کاشان کا بھی یہی حال ہوا تھا کاشان اور فرح کے درمیان قربتیں بڑھنے لگی تھیں اور پھر جلد ہی وہ قربتیں شادی کی صورت میں بدل گئیں۔

شادی کے فوراً بعد ہی فرح ڈاکٹر کے ساتھ ان کے خاندانی بنگلے میں چلی آئی تھی اور اس نے نوکری چھوڑ دی تھی اب وہ رات کو جاگ کر ڈاکٹر کا انتظار کررہی تھی، وہ ناول بے حد دلچسپ اور سنسنی خیز تھا اچانک وہ مطالعہ کرتے ہوئے چونک پڑی فرح کو ایسا لگا کہ جیسے اس کے آس پاس کوئی ہو۔ اس نے کتاب پر سے نظریں ہٹا کر ایک بار تیز نظروں سے پورے کمرے کا جائزہ لیا اور دوسرے ہی پل وہ اپنے وہم پر مسکرا اُٹھی کیونکہ کمرے میں اس کے سوا کوئی اور نہ تھا چنانچہ وہ دوبارا مطالعہ میں مصروف ہوگئی تھی چند لمحے گزرے ہوں گے کہ اب کی بار کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس زیادہ شدید تھا فرح کو ایسا لگا کہ جیسے کہ اس کے نزدیک کوئی موجود ہو۔ اس احساس کو جھٹلانا فرح کے لئے آسان نہ تھا مطالعہ گاہ میں ضرور کوئی موجود تھا مگر کون اس کا جواب اس کو آنکھیں پھاڑنے کے باوجود نہیں مل سکا تھا۔

اچانک فرح نے کمرے میں کسی کے قدموں کے چلنے کی آواز سنی آواز اتنی صاف اور واضح تھی کہ شدید سردی کے باوجود پسینے کے بے شمار قطرے اس نے اپنے ماتھے پر محسوس کئے تھے اچانک اس کے حلق سے چیخ نکل گئی کیونکہ فرش پر قدموں کے نشان بننا شروع ہوگئے تھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ان پیروں پر خون لگا ہو۔۔۔ قدموں کے نشان دوسری آرام کرسی تک پہنچ کر رک گئے جو کہ فرح کی کرسی سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔۔۔۔ اچانک وہ آرام کرسی نے جھولنا شروع کردیا اس کی پشت بار بار پیچھے کی طرف جاتی اور پیر زمین سے ٹک جاتے۔

فرح کو اپنا سر تیزی سے گھومتا ہوا محسوس ہورہا تھا گھبراہٹ اور خوف کی شدت سے وہ کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اگر اس نے فوراً ہی دیوار کا سہارا نہ لیا ہوتا تو وہ ضرور گر جاتی اس کا سارا جسم زلزلے کی سی کیفیت کا شکا رتھا اس نے مضبوطی سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دعاؤں کا ورد کرنے لگی تھی اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی آنکھیں کھولیں تو وہاں قدموں کے نشان نہ تھے اور کرسی کی حرکت بند ہوچکی تھی۔

اوہ۔۔۔ خدا اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور کرسی پر گر گئی اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے فرح چند لمحات تک اسی طرح بے حس وحرکت کھڑی رہی پھر وہ اچانک بری طرح سے چونک پڑی تھی قدموں کی تیز آواز اس کو سنائی دی تھی یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کہ کوئی تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا چلا جارہا ہو اس کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی اس کا حلق خشک ہوگیا۔

اچانک اس نے دیکھا کہ مطالعہ گاہ کے دروازے کی کنڈی گھومی اور دروازہ کھل گیا قریب تھا کہ اس کے حلق سے چیخ نکل جاتی لیکن اندر آنے والے کو دیکھ کر اس کی جان میں جیسے جان آگئی وہ ڈاکٹر کاشان تھے جو کہ اسپتال سے واپس آئے تھے فرح نے طویل سانس لی اور ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگی تھی اور فوراً ہی اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانے کی کوشش کی تھی تاکہ اس کے شوہر کو یہ اندازہ نہ ہوسکے کہ وہ پریشان ہے۔

مجھے معلوم تھا جان تم اسی جگہ ملو گی۔۔۔ لاکھ دفعہ کہا ہے تم سوجایا کرو۔

میں نے بھی آپ سے لاکھ دفعہ کہا ہے کہ آپ کا انتظار کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔۔۔ وہ مسکرا کر بولی۔

کیا بات ہے تم پریشان ہو۔۔۔ ڈاکٹر نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا ڈاکٹر اس کے چہرے پر موجود پریشانی کو بھانپتے ہوئے بولا۔

نن۔۔ نہیں تو۔۔۔ وہ گڑبڑا کر بولی۔

اس کی بات سن کر ڈاکٹر کاشان مسکرا کر بولا جب تم پریشان ہوتی ہو ناں تو تمہارا چہرہ بولتا ہے۔۔۔ خیر تم نہیں بتانا چاہتی تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

پورا جسم پسینے سے عرق آلود ہوگیا یکا یک اس کے دانت بجنے لگے تھے فرح کو ایسا لگا کہ وہ کسی برفانی علاقے میں کھڑی ہو اچانک اس کو اپنے کانوں کے پاس کسی کے سانس لینے کی آواز سنائی دی اس کے ہاتھ از خود چھری کے دستے پر مضبوطی سے جم گئے اسی پل اس نے چھری اُٹھا کر فضا میں یوں گھمائی جیسے کسی پر وار کر رہی ہو۔

جواب میں فرح نے کھنکتا ہوا قہقہہ سنا تھا جو کہ کسی مرد کا تو ہو نہیں سکتا تھا وہ قہقہہ کسی عورت کا تھا۔

''کک۔۔کون ہو تم۔۔۔۔'' فرح نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

لیکن جواب ندارد۔۔۔

''جواب دو۔۔۔کک کون ہو تم۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔۔۔''

جواب میں قہقہہ سنائی دیا تھا چند لمحے گزرے ہوں گے کہ فرح کو ایسا لگا جیسے کہ وہ کسی گہرے سناٹے میں موجود ہو اچانک اس کو ایسا لگا کہ جیسے کسی نے گہرے سانس لئے ہوں اسی پل اس نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا وہ منظر اس قدر خوفناک تھا کہ وہ کسی سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگی تھی وہ گھبراہٹ اور خوف کے عالم میں پیچھے ہٹ گئی۔۔۔۔

اس نے دیکھا کہ برتنوں کی شیلف از خود کھلی ہے۔۔اس برتنوں کی شیلف سے ایک استخوانی پنجہ برآمد ہوا ۔۔۔وہ پنجہ آہستہ آہستہ شیلف سے باہر آیا اور پھر جیسے ہی وہ پنجہ باہر آیا اسی پل فرح کی چیخ نکل گئی اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی فرح کے گرتے ہی وہ ہاتھ جس طرح باہر آیا تھا اسی طرح اندر چلا گیا۔

فرح کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ریڈور میں پایا اور رات کا اندھیرا چھایا تھا اس کو ریڈور کو پہچاننے میں فرح کسی بھی طرح دشواری سے کام نہیں لیا تھا یہ اس کے اپنے گھر کا کوریڈور تھا چاروں طرف گہرا سناٹا طاری تھا کوریڈور میں مدھم بلب روشن تھا فرح کو اچھی طرح یاد تھا کہ کوریڈور میں کبھی بھی مدھم بلب روشن نہیں ہوتا تھا وہ ہمیشہ سے انرجی سیور پسند کرتی تھی نہ جانے کس نے یہاں پر بلب لگا دیا تھا فرح کو اس بات پر شدید حیرت تھی کہ وہ کچن میں سوپ تیار کر رہی تھی کہ اس کو ریڈور میں کیسے آ گئی اس نے سوچا نہیں سوپ جل نہ گیا ہو وہ واپس کچن میں جانے کے لئے مڑی ہی تھی کہ ایک عجیب سی آواز سن کر چونک پڑی۔

☆.....☆.....☆

وہ آواز نہایت عجیب سی تھی جیسے کوئی کسی چیز کو فرش پر گھسیٹ رہا ہو۔فرح نے ادھر ادھر دیکھا تو اس کی نظر خواب گاہ کے دوسرے دروازے کی جانب پڑی جو کہ کوریڈور میں کھلتا تھا اس نے دیکھا کہ کوئی آدمی اس دروازے سے برآمد ہوا ہے اور وہ آدمی کسی چیز کو گھسیٹتا ہوا باہر آ رہا تھا جو چیز باہر آئی اسے دیکھ کر فرح چونک پڑی مدھم بلب کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ انسانی جسم تھا جس کو وہ آدمی گھسیٹ رہا تھا وہ آدمی اس کے جسم کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھینچ رہا تھا فرح یہ منظر دیکھ کر خوف زدہ سی ہوگئی کہ اس کے گھر میں کوئی اجنبی تھا جو کہ کسی لاش کو گھسیٹ رہا تھا فرح اس کے چہرے کو مدھم روشنی میں ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ پا رہی تھی اس نے چیخ کر کاشان کو آواز دی مگر اس کی آواز گونج کر رہ گئی سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے چلانے کا اثر اس اجنبی پر نہیں ہوا تھا بلکہ وہ بدستور اپنے کام میں لگا رہا تھا۔

اچانک فرح کو ایسا لگا کہ جیسے کسی نے اس کے کان میں اس کے پیچھے جانے کی سرگوشی کی ہو فرح تنویمی انداز میں اس کے پیچھے چل پڑی۔۔وہ شخص اب اسٹور میں داخل ہو چکا تھا فرح بھی اس کے پیچھے اسٹور میں داخل ہوگئی۔۔۔

وہ اجنبی اس بند دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔۔۔۔چند لمحے تک وہ رکا رہا پھر اچانک وہ وہاں سے غائب ہوگیا۔

فرح کے حلق سے چیخ نکل گئی اچانک ہی وایلن کی تیز آواز فرح کے کانوں سے ٹکرائی جو کہ اس دروازے کے پیچھے سے آ رہی تھی اچانک فرح کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اس کو خون کی بوندیں اس

تالے سے بہتی نظر آرہی تھیں اچانک بہت سارا خون دروازے سے باہر نکلنے لگا تھا، فرح کے حلق سے چیخ نکل گئی۔۔۔اور وہ لہرا کر فرش پر گر پڑی۔

ہوش میں آتے ہی فرح نے اپنے آپ کو خواب گاہ میں پایا تھا خواب گاہ میں ڈاکٹر کاشان کے علاوہ اس کے تمام ملازمین بھی موجود تھے۔

''اب۔۔کیسا محسوس کررہی ہو۔۔۔'' ڈاکٹر نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' فرح نے مختصراً جواب دیا۔

''تم کچھ پریشان ہو۔۔۔اور یہ بے ہوش کیسے ہوگئی اور تم اسٹور میں کیسے پہنچ گئی۔'' ڈاکٹر نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

اس کی بات سن کر فرح کے ذہن میں گزشتہ سارے واقعات گھوم کر رہ گئے اس کے چہرے سے خوف ظاہر ہونے لگا تھا فرح کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کاشان مسکرایا اور بولا۔۔۔''میں دیکھ رہا ہوں تم پریشان ہو اور خوفزدہ بھی ہو بہت دن سے۔۔۔بتادو دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے۔۔۔'' کاشان کی بات سن کر اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آنے لگے تھے اس کے چہرے پر تذبذب دیکھ کر کاشان نے سنجیدگی سے کہا۔''اگر تم نہیں بتانا چاہتی تو کوئی بات نہیں مگر تم شاید مجھ سے پیار نہیں کرتی اس لئے مجھے بھروسے کے قابل نہیں سمجھتی۔''

اس کی بات سن کر فرح خاموش رہی اس کو خاموش دیکھ کر کاشان ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''فری۔۔میں تو سمجھتا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے کھلی کتاب ہیں مگر میں غلط تھا۔'' کاشان کے لہجے میں طنز اور غصے کا عنصر موجود تھا۔

''ش۔۔نہیں۔۔ایسی بات نہیں ہے میں تم سے بھلا کیوں چھپاؤں گی۔۔۔مگر میری باتوں پر تم یقین نہیں کرو گے اور جہاں تک چھپانے کا تعلق ہے تو مجھے لگتا ہے کہ تم نے ضرور مجھ سے کچھ چھپایا ہے۔۔۔'' فرح نے کہا۔

مم۔۔۔میں نے۔۔۔کاشان گڑبڑا گیا۔

''میں نے تم سے اس کمرے کے متعلق پوچھا تھا جو ہمیشہ مقفل رہتا ہے مگر تم نے ٹال دیا۔''

''اوہ۔۔ہاں۔۔۔ڈاکٹر کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا فرح محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی کہ کمرے کے ذکر پر ڈاکٹر کاشان بے چین سا ہوگیا ہے اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے ہیں فرح اس کی جانب چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

فرح کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے بلآخر ڈاکٹر کاشان مسکرایا اور طویل سانس لے کر بولا۔''کیا جاننا چاہتی ہو اس کمرے کے متعلق۔'' کاشان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''صرف ایک بات۔۔۔۔'' فرح ہاتھ اُٹھا کر بولی۔۔''کہ وہ کمرہ ہمیشہ مقفل کیوں رہتا ہے۔۔۔''

''اوہ۔۔۔اس کمرے میں سالوں پرانا کاٹھ کباڑ پڑا رہتا ہے۔۔۔اور اس کو کھولنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔''

''کیا تم اسے میری خاطر کھول سکتے ہو۔۔۔۔ صرف تھوڑی دیر کے لئے۔۔۔'' فرح نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں۔۔۔'' کاشان چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''تم اسے کس لئے کھلوانا چاہتی ہو۔''

فرح اس کے اس طرح چونکنے پر حیران رہ گئی پھر طویل سانس لے کر بولی۔

''وہ اس لئے کہ میرے ساتھ جو واقعات پیش آرہے ہیں اس کا تعلق اس کمرے سے ہے میں نے اس کمرے سے وایلن کی آواز آتی سنی ہے یہ کمرہ بدارواح کا مسکن ہے اور میں نے کسی انسان کو ایک لاش گھسٹتے ہوئے دیکھا ہے۔۔۔''

''لاش۔۔۔۔۔'' کاشان زیرلب بڑبڑا کر بولا اور پھر اس کی آنکھوں سے خوف ظاہر ہونے لگا تھا اور مضطربانہ انداز میں پہلو بدل کر رہ گیا اس کے چہرے پر بے چینی اور خوف کے تاثرات فرح نے واضح طور پر

عجیب وغریب نقشوں اور زاویوں اور زائچے بنے تھے کہیں کہیں اشارے اور ہندسے بھی موجود تھے۔

اچانک فرح نے ٹیبل کی دراز کھول دی اس دراز کے اندر ایک چابی موجود تھی چابی کو دیکھ کر فرح چونک گئی، کہیں یہ چابی اس بند دروازے کی تو نہیں، فرح نے فوراً ہی اس چابی کو چھپا لیا اور کمرے سے باہر نکل آئی فرح کے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں اگر اسٹور میں کاٹھ کباڑ تھا تو اتنی حفاظت سے چابی رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

☆.....☆.....☆

فرح نے خواب گاہ میں داخل ہوکر بیڈ کے ساتھ رکھے ڈسپنسر سے ٹھنڈا پانی پیا اور بیڈ پر بیٹھ کر سوچنے لگی تھی اس کے دماغ عجیب تلاطم کا شکار تھا کہ اس چابی کا مطالعہ گاہ میں کیا کام کیا اس دروازے کے پیچھے کوئی بہت ہی خاص شے موجود تھی جس کو سب سے چھپانا مقصود تھا فرح کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اچانک خواب گاہ کا دروازہ ازخود کھلا اور بند ہوگیا جیسے کہ کوئی اندر داخل ہوا ہو اچانک فرح کی آنکھوں نے ایک تحیر خیز منظر دیکھا وہ سفید رنگ کا دھواں تھا جو کہ منجمد ہوکر انسانی روپ اختیار کرتا جارہا تھا چند لمحوں کے بعد وہاں سفید ساڑھی میں ملبوس ایک نہایت خوبصورت لڑکی موجود تھی اس کا سفید اور بے داغ جسم کسی سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آرہا تھا اس کے ناک و نقوش تیکھے اور جاذب نظر تھے بڑی بڑی آنکھیں جو کہ محصور کن تھیں، فرح کی چیخ نکل گئی اس کے چہرے پر دہشت اور خوف نظر آنے لگے تھے اس کے سرخ یاقوتی ہونٹوں پر نہایت خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

''کک۔۔کون ہو تم۔۔۔'' فرح نے دہشت بھری آواز میں پوچھا۔

''میں ایک روح ہوں مگر مجھ سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''رررر۔۔۔روح۔۔۔'' فرح کانپ گئی۔

''ہاں۔۔۔روح جو بے چین ہے۔۔۔جس کو اس کے جسم سے الگ کردیا گیا ہے۔۔۔جو کبھی تمہاری طرح ایک جیتی جاگتی لڑکی تھی اب موت کے اندھیرے اس کا مقدر ہیں۔'' اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

''تو وہ تم تھی جو مجھے ڈرا رہی تھی۔۔۔۔۔''

فرح نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔۔'' وہ مسکرائی۔

''مگر۔۔ کیوں اور تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔۔۔'' فرح نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا اس کی آواز میں خوف کی آمیزش تھی۔

''میرا نام سلوانا ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیسی مدد۔۔۔'' فرح نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے تمہارے جسم کی ضرورت ہے۔۔ میری روح تمہارے جسم میں قیام کرنا چاہتی ہے۔۔۔'' سلوانا کا لہجہ بے تاثر تھا۔

''کک۔۔کیوں۔۔۔ میرا جسم۔۔۔ کیوں۔'' فرح دہشت زدہ ہوگئی۔

''بدلہ۔۔۔ بدلہ۔۔۔'' یہ جملہ کہتے ہوئے سلوانا کی آنکھوں میں غصہ نظر آنے لگا تھا۔

''کس سے بدلہ۔۔۔لوگی تم۔۔۔'' فرح نے خوف سے کہا۔

''یہ چھوڑو۔۔ مجھے جس سے بدلہ لینا ہے وہ تو میں لوں گی مگر میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارا جسم مقررہ وقت کے بعد چھوڑ دوں گی کیونکہ میں تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے جسم میں نہیں جاسکتی۔۔۔'' سلوانا نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں۔۔۔چلی جاؤ۔ میں کوئی تمہاری مدد نہیں کرسکتی جاؤ یہاں سے۔'' فرح نے چلا کر کہا۔

فرح کے اس طرح چلانے پر سلوانا کے چہرے پر مایوسی نظر آنے لگی تھی دوسرے ہی لمحے وہ مسکرا کر بولی۔

''تم کو بہت جلد میری ضرورت پڑے گی۔۔۔
کیونکہ تم نہیں جانتی کہ تم کس قدر خطرے میں ہو۔۔۔
''اتنا کہہ کر سلوانا کی روح وہاں سے غائب ہوگئی۔

اس کے غائب ہونے کے بعد فرح سوچ میں پڑ گئی کہ سلوانا کی روح کس سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔ اچانک اس کو اس چابی کا خیال آیا جو کہ اس نے مطالعہ گاہ سے اُٹھائی تھی اس نے وہ چابی اپنے دوپٹے میں چھپائی اور اسٹور کی طرف چل پڑی اور جیسے ہی وہ اسٹور کے پاس پہنچی اچانک وایلن کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ کانپ کر رہ گئی موسیقی کی آواز تیز تھی فرح نے کانپتے ہاتھوں اس چابی کو دروازے پر لگے تالے میں گھمایا کلک کی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا۔۔۔۔اور دھڑکتے دل سے دروازہ کھولا اور لرزتے قدموں سے اندر داخل ہوگئی۔۔۔۔۔۔۔۔فرح کو یہ معلوم نہ تھا کہ بنگلے کے گیٹ سے ایک شخص جو کہ سرتاپا سیاہ رنگ کے لباس میں ملبوس تھا وہ سیاہ پوش بنگلے کے داخلی گیٹ سے اندر داخل ہوگیا یہ وہی سیاہ پوش تھا جو کہ معصوم بچوں کے اغوا میں ملوث تھا۔

فرح جیسے ہی اندر داخل ہوئی وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی وہ ایک بڑا کمرہ تھا ڈاکٹر کا یہ بیان تھا کہ یہ کمرہ کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا ہے مگر ایسا کچھ نہ تھا یہ کمرہ نہایت صاف اور گندگی سے پاک تھا۔۔۔مگر کمرے میں عجیب سی بو پھیلی تھی جو کہ مدھم اور ناگوار سی تھی کمرے کے اندر سفید دودھیا روشنی پھیلی تھی جو کہ دیواروں پر لگے انرجی بورڈ سے نکل رہی تھی فرح نے دیکھا کہ کمرے میں چھوٹے سائز کے اسٹریچر رکھے ہوئے تھے جو کہ اسپتالوں میں استعمال ہوتے ہیں ان سٹریچرز میں سے دو پر تابوت رکھے تھے جو کہ لکڑی کے تھے ان تابوتوں کے بالکل پیچھے ایک چھوٹا دروازہ نظر آرہا تھا اس دروازے پر ایمرجنسی والا بلب روشن تھا فرح حیرت یہ سب دیکھ رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر کمرے کی دیواروں پر پڑی ان دیواروں پر عجیب وغریب قسم کی اشکال بنی ہوئی تھیں فرح نے آگے بڑھ کر پہلا تابوت کھول دیا تابوت کے اندر جو بھی چیز تھی اس کو دیکھ کر فرح چونک گئی وہ چیز ایسی ہی تھی جس کو دیکھ کر فرح اپنے جسم کی لرزشوں پر قابو نہ پاسکی تھی۔

اس تابوت میں ایک گلی سڑی لاش موجود تھی جو کہ کسی عورت کی تھی اس گلی سڑی لاش سے نہایت ناگوار قسم کی بدبو اُٹھ رہی تھی فرح کا دل فوراً ہی متلانے لگا تھا اس اپنے ڈوپٹے سے اپنی ناک کو ڈھک لیا تھا اچانک وہ چونک گئی اس لاش کے گلے میں نہایت ہی خوبصورت قسم کا ہار موجود تھا اور ہاتھوں میں کنگن تھے یہ وہی ہار اور کنگن تھے جو کہ فرح نے اس روح کے گلے میں دیکھے تھے بدبو بہت زیادہ ہی ناگوار تھی جو تابوت کے اندر دب گئی تھی اور تابوت کھل جانے کی وجہ سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی فرح نے سوچا کہ دوسرا تابوت بھی کھول لینا چاہیے یہ تو وہ سمجھ گئی تھی کہ اس دوسرے تابوت میں بھی کسی کی لاش ہوسکتی ہے۔۔۔

فرح نے آگے بڑھ کر تابوت کھول دیا اندر ایک مرد کی گلی سڑی لاش موجود تھی فرح نے فوراً ہی تابوت کا ڈھکن بند کردیا کیونکہ بو نہایت ناگوار تھی فرح ڈھکن بند کر کے مڑی تھی کہ اچانک اس کی نظر اس دروازے پر پڑی اس کے دل میں نہ جانے کیا آئی تو وہ دروازے کی جانب بڑھنے لگی دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے اس دروازے کو کھول دیا دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈ کے شدید احساس سے دوچار ہوگئی تھی وہ ڈرتے ڈرتے کمرے کے اندر داخل ہوگئی کمرے کی دائیں اور بائیں دیواروں کے ساتھ دو بڑے بڑے AC لگے تھے جن کی وجہ سے پورا کمرہ ٹھنڈا تھا کمرہ بعقہ نور بنا ہوا تھا پہلی نظر میں وہ کمرہ ایک لیب معلوم ہوتا تھا پورے کمرے میں دو بڑی بڑی مشینیں لگی تھیں جن سے نکلتی ربڑ کی نلکیاں اور تاریں آپریشن ٹیبل پر پڑے بہت سے ڈھانچوں سے منسلک تھیں۔

ڈھانچے تعداد میں چار یا پانچ تھے جو کہ الگ الگ ٹیبل پر رکھے تھے ڈھانچوں کو دیکھتے ہی فرح کو پہلی نظر میں ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ ڈھانچے چھوٹے بچوں

آسیب

ایم اے راحت

پہلی قسط

ہر دل عزیز اور کہنہ مشق رائٹر کے قلم سے لکھی گئی اپنی نوعیت کی بے مثال کہانی، اس کہانی کو پڑھنے والے عش عش کر اٹھیں گے اور برسوں اس کہانی کو نہ بھلائے بھولیں گے، پڑھ کر تو دیکھیں۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ..... جادو ٹونا سر چڑھ کر بولتا ہے، اپنی نوعیت کی شاہکار کہانی

میں ادیب نہیں ہوں۔ واقعات کو کس طرح افسانوی شکل دی جاتی ہے میں نہیں جانتا لیکن ایک بات سے بخوبی واقف ہوں وہ یہ کہ ہر شخص ادیب بن سکتا ہے۔ وہ ایک کہانی ضرور لکھ سکتا ہے اور وہ اس کی اپنی زندگی کی کہانی ہوتی ہے۔ آپ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں اگر آپ کے اندر واقعات کو مربوط کرنے کا شعور ہے اور اس ترتیب کو زیر قلم لا سکتے ہیں تو آپ ادیب بن سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کی داستان رقم کر سکتے ہیں۔

اب جب کہ میری زندگی ایک مرکز پر آ گئی ہے۔ ٹھہر گئی ہے اور میں وہ ڈھلان دیکھ رہا ہوں جو سانسوں کے اختتام پر رکتے ہیں تو دل میں یہ خواہش بیدار ہوتی ہے کہ ماضی کو دہراؤں۔ ان لمحات کو رقم کروں جن سے گزر چکا ہوں۔ یہ ایک بہترین مشغلہ ہے خود کو صفحات میں محفوظ کر دوں تاکہ وقت مجھے یاد رکھے۔

شعور سے پہلے کیا تھا، انسان خود نہیں جانتا۔ دوسرے جانتے ہیں کوئی بتانے والا ہو تو ٹھیک ہے۔ نہ تو سب کچھ کھو جاتا ہے۔ میری زندگی کے وہ سال گم شدہ ہیں جب بے شعوری کی عمر تھی۔ شعور کی سوچ میں ابا جی موجود تھے۔ کہیں نوکری کرتے تھے۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ خوشحالی تھی، پھر نہ جانے کیا ہوا اماں نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔ ابا دوبارہ گھر نہیں آئے۔ اور پھر گھر میں فاقے ہونے لگے۔ ماں نے روٹی پکانا چھوڑ دی۔ وہ ابا کے بارے میں بھی کچھ نہ بتاتی میں پوچھتا تو وہ رونے لگتی تھی۔ میں دوسروں کی باتیں کر کے صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک دن خالہ احمدی کو کہتے ہوئے سنا۔

''حسینہ اس سے تو اچھا ہے تو زہر کھا لے۔''

''دل تو یہی چاہتا ہے احمدی آپا..... مگر.....''

''ہاں..... ہاں..... بول مگر۔'' احمدی خالہ نے کہا۔ اماں نے میری طرف دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی میں نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کھانے پینے کی باتیں سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔

''اس کا خیال ہے نا؟'' احمدی خالہ میری طرف اشارہ کر کے بولیں۔

''ہاں احمدی آپا۔''

''نہیں نہیں اماں۔ تمہارا جو دل چاہے کھا لو۔ میں تم سے نہیں مانگوں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے احساس تھا کہ ماں بھی بھوکی ہے۔ اسے کچھ کھانے کے لئے مل رہا ہے تو ٹھیک ہے۔

''خدا سے ڈر حسینہ۔ ایسے مرنے سے کیا فائدہ۔''

''تو بتاؤ۔ کیا کروں؟''

کوئی خاص بات نہیں تھی۔ گھر کے کام معمول کے مطابق کئے تھے۔ پھر اٹھنی حلال کرنے کا خیال آیا۔ الیاس بھائی کو جواب بھی دینا تھا۔ محمود چچا کے ہاں پہنچ گیا۔ محمود چچا پہلوانی کرتے تھے۔ ان کے دونوں بیٹے بھی یہی کام کرتے تھے۔ حمیدہ باجی صحن میں نظر آئی۔ البتہ محمود چچا اور فیاض بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔

''حمیدہ باجی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو اپنی نانی کے ہاں گئی ہے۔'' فیاض بھائی نے کہا۔

''کب آئے گی؟''

''پتہ نہیں، کیا کام ہے؟'' محمود چچا نے پوچھا۔

''کام ہے!''

''کیا بات ہے مجھے بتا دے میں اسے کہہ دوں گا!'' محمود چچا بولے۔

''میرا نہیں الیاس بھائی کا کام ہے!''

''کس کا؟'' دونوں باپ بیٹے چونک پڑے۔

''وہ الیاس بھائی ہیں نا۔ بلیا پار جو رہتے ہیں۔''

''ابے ہاں۔ آگے تو بول۔''

''انہوں نے سلام کہا ہے حمیدہ باجی کو۔''

''کیا؟'' محمود چچا چارپائی سے نیچے اتر آئے۔

''ہاں۔ سلام کہا ہے انہوں نے۔''

دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ فیاض بھائی کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

''اس کی تو...... انہوں نے نیفے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ لیکن محمود چچا نے انہیں پکڑ کر نیچے بٹھا دیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ ان دونوں کی یہ کیفیت میرے لئے حیران کن تھی۔

''ابا تم۔'' فیاض بھائی بھنچے بھنچے لہجے میں بولے۔

''ابے تو چپ ہو گا یا نہیں؟'' محمود چچا دہاڑے پھر مجھ سے بولے۔ ''بیٹھ جا بیٹا نادر بیٹھ جا۔''

''بس چچا گھر جاؤں گا۔''

''ہاں چلے جانا تجھ سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''پوچھو۔'' میں بیٹھ گیا۔

''کیا کہا تھا الیاس بھائی نے؟''

''یہی کہ حمیدہ کو میرا سلام کہہ دینا اور جواب میں وہ جو کچھ کہے وہ انہیں بتا دوں۔''

''کہیں بلایا ہے اس نے حمیدہ کو!''

''ایں...... نہیں تو۔''

''اچھا تو نے پہلے کبھی حمیدہ کو اس کا سلام کہا ہے''

''نہیں کبھی نہیں۔''

''ان دونوں کو باتیں کرتے تو سنا ہو گا۔''

''نہیں محمود چچا۔''

''ہوں۔ اچھا تو پھر یوں کر نا رات کو آ جانا۔ حم آ جائے تو اسے سلام کہہ دینا۔''

''ٹھیک ہے۔ اب میں جاؤں۔''

''ہاں۔ لیکن کسی کو یہ بات بتانا نہیں۔''

''نہیں بتاؤں گا۔'' میں نے کہا اور باہر نکل آ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ نہ جانے کیا بات ہے را کو گھر میں ماچس ختم ہو گئی تو فضل خان نے پیسے د ہوئے کہا۔

''چل بے، ماچس لے آ۔'' میں پیسے لے کر پڑا۔ الیاس بھائی اور حمیدہ کا خیال آیا۔ دو منٹ کی تو با تھی۔ محمود چچا کا گھر دور ہی کتنا تھا۔ ماچس خرید رہا تھا فیاض بھائی آ گئے۔

''نادر۔'' انہوں نے آواز دی۔

''جی فیاض بھائی!''

''حمیدہ آ گئی ہے؟''

''میں خود آ رہا تھا فیاض بھائی۔'' میں نے ما لے کر جیب میں رکھی۔ دکاندار کو پیسے دیئے اور فی بھائی کے ساتھ چل پڑا۔

''سن۔'' وہ بولے۔

''جی فیاض بھائی۔''

''حمیدہ کو یہ مت بتانا کہ تو نے ہمیں یہ سب دیا ہے۔ سمجھ گیا نا اگر تو نے اسے بتا دیا تو کاٹ کر دوں گا۔''

''کیسے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تجھے اور کسے؟''

''نن.....نہیں بتاؤں گا مجھے کیا پڑی ہے۔'' میں نے فیاض بھائی کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے تو ان سے ویسے بھی ڈر لگتا تھا۔

پھر وہ دروازے پر ہی رک گئے اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں اندر داخل ہوگیا۔ حمیدہ باجی محمود چچا کے پلنگ پر بستر بچھا رہی تھیں۔ محمود چچا موجود نہیں تھے۔ مجھے دیکھ کے حمیدہ باجی مسکرائی۔

''آنادر خیر ہے۔''

''ہاں باجی۔ وہ۔''

''کیا بات ہے؟''

''وہ الیاس بھائی۔''

''کون الیاس بھائی؟''

''وہ جو مامار مضان کے گھر کے سامنے رہتے ہیں۔''

''ہاں تو پھر؟'' حمیدہ باجی کا منہ بگڑ گیا۔

''وہ جی۔ انہوں نے سلام کہا ہے۔''

''کسے؟''

''تمہیں باجی۔''

''کیوں؟ میں کیا اس کی ماں لگتی ہوں یا بہن لگتی ہوں؟''

''اس نے کہا کہ آپ جو کہیں میں اسے بتادوں۔''

''تو پھر اس سے کہنا ویرا کہ اپنی ماں کو سلام کر۔ بہن کو سلام کر۔ اور یہ بھی کہہ دینا اس سے کہ اب بہت ہو گیا۔ ابا کو بتانا ہی پڑے گا۔ میں تو اس لئے خاموش رہی کہ جھگڑا ہوگا بدنامی ہوگی۔ جا اب دفعان ہوجا۔''

حمیدہ باجی بہت بگڑ گئی تھی۔

اسی وقت فیاض اور محمود چچا اچانک نمودار ہوگئے۔ محمود چچا نے حمیدہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''جیتی رہ بیٹی۔ اب اسے تو ہم دیکھ لیں گے۔ اور تو فضل خاں تیرے ہاتھ ٹھیک کرتا ہے۔ چل نکل جا۔ اور خبردار دوبارہ ہمارے گھر میں قدم نہ رکھنا۔'' فیاض بھائی نے اپنے چوڑے ہاتھ سے میری گردن پکڑی اور دروازے سے باہر دھکا دے دیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ بہر حال میں خاموشی سے گھر واپس آ گیا۔ لیکن دوسرے دن صورت حال بہت بگڑ گئی تھی۔ مجھے تو اس وقت پتہ چلا جب میں گھر کا کام کر رہا تھا اور دروازہ بڑی زور سے کھلا تھا۔

فضل خان دودھ بانٹنے گیا تھا اور وقت سے پہلے اندر آ گیا تھا۔ اس نے مجھے آواز دی۔

''نادر!''

''جی ابا!''

''باہر آیا'' اس نے کہا۔ اور میں باہر نکل آیا۔ لیکن باہر بہت سے لوگ جمع تھے۔ الیاس بھائی کو رسی سے باندھ لیا گیا تھا ان کا منہ سوجا ہوا تھا۔ چہرے پر بہت سے نیلے نشان پڑے ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ ہمارے دروازے کے سامنے جمع تھے۔

''ادھر آنادر.....!'' محمود چچا نے کہا۔

''اوئے تو نے ان لوگوں سے جھوٹ کیوں بولا؟'' الیاس بھائی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''او تو چپ کر۔'' محمود چچا نے الیاس بھائی کے منہ پر ایک اور گھونسہ جڑ دیا۔

''اس نے جھوٹ بولا ہے چچا۔'' الیاس بھائی بولے۔

''میں کہتا ہوں چپ کر تو۔''

''کیا کہا تھا اس نے؟'' فیاض بھائی بولے۔

''سلام کہلوایا تھا حمیدہ باجی کو۔''

''اور کیا کہا تھا؟''

''کہا تھا کہ وہ جو جواب دے انہیں بتادوں۔''

''کیا کہا حمیدہ نے؟''

''یہ کہ اپنی ماں کو سلام کر۔ اپنی بہن کو سلام کر۔''

''سن لیا تم لوگوں نے؟''

''مارو اس کتے کو۔ بستی کی بہن بیٹیوں سے بد تمیزی کرتا ہے۔'' پھر سب مل کر الیاس بھائی کو مارنے لگے اور میرے اوسان خطا ہو گئے اسی وقت فضل خاں نے میرا کان پکڑ لیا مجھے اسی کا خدشہ تھا۔

''اور تو نے اب یہ کام شروع کر دیا ہے؟''

''میں نے تو کچھ نہیں کیا ابا!''

''اندر چل میں بتاتا ہوں۔'' فضل خاں بولا اور میرے کان کو بھین کی رسی سمجھ کر گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا۔

اس کے بعد کی تفصیل بے کار ہے۔ فضل خاں مجھے مارنے میں بڑی لذت محسوس کرتا تھا۔ دل بھر کر مارا..... ایک بار ماں بچانے آئی تو اسے بھی گدھے کی طرح لات ماری اور وہ دور جا پڑی۔ پھر اس ستم ظریف نے مجھے بھینس کے کھونٹے سے باندھ دیا۔

میرے ایک پاؤں میں رسی بندھی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھ پشت پہ کس دیئے گئے تھے۔

باہر کیا ہوا مجھے نہیں معلوم تھا لیکن میں بھوکا پیاسا کھونٹے سے بندھا یہ یاد کرتا رہا کہ صبح اٹھ کر کس کا منہ دیکھا تھا۔

رات ہوگئی۔ سب لوگوں کے عیش تھے۔ روشنی ہو چکی تھی۔ فضل خاں کھانا کھانے بیٹھا تو ماں نے عاجزی سے کہا۔

''سارا دن بھوکا رہا ہے۔''

''کون؟''

''نادر''

''تین دن بھوکا رکھنا ہے کتے کے پلے کو۔''

''مر جائے گا.....'' ماں کی آنسو بھری آواز ابھری۔

''ارے چھوڑ..... بڑا سخت جان ہے۔''

''معاف کر دو اسے۔''

''میں تو معاف کر دوں گا مگر الیاس خان اسے معاف نہیں کرے گا۔''

''کیوں؟''

''چھری لے کر اس کی تلاش میں نکلا ہے۔ کہہ رہا ہے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''ارے واہ..... قصور اس کا ہے۔ نادر کو کیوں مارے گا؟''

''مجھے کیا معلوم؟''

''تم نے بات نہیں کی اس سے؟''

''کہتا ہے اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ یہی جھوٹ بولتا ہے۔''

''وہ کیوں جھوٹ بولے گا؟''

''چل بکواس نہ کر مجھے روٹی دے۔'' فضل خان نے یہ کہہ کر بات گول کر دی اور ماں خاموش ہوگئی۔

لیکن میرے اوسان خطا تھے۔ تین دن تک بھوکا رہوں اور پھر الیاس بھائی مجھے چھری مار کر قتل کر دیں گے۔ کیا کروں؟

وقت گزرتا گیا۔ خوب رات ہوگئی تھی۔ میں زمین پر پڑا آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب کیا ہوگا۔ دوسرے بہن بھائی سو چکے تھے۔ فضل خان بھی ایک طرف سو رہا تھا۔ چاروں طرف گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بھوک پیاس نے مجھے نڈھال کر دیا تھا اور مجھ پر نیم غشی طاری تھی۔

اچانک مجھے اپنے قریب سرسراہٹ سنائی دی۔ آنکھیں کھولیں تو چکر آ گیا۔ کچھ نظر نہیں آیا۔ تبھی کان کے پاس سرگوشی سنائی دی۔

''نادر میں ہوں۔''

''کون..... اماں؟''

''ہاں ٹھہر میں تیرے ہاتھ پاؤں کھولتی ہوں۔''

کچھ دیر کے بعد میرے ہاتھ پاؤں کھل گئے اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''اماں!'' میرے منہ سے آواز نکلی۔

''تو بھاگ جا یہاں سے نادر۔ بھاگ جا بیٹا۔''

''کہاں اماں؟''

''کسی اور گاؤں میں چلا جا بیٹا۔ کسی کے گھر نوکری کر لینا۔ کسی کی بھینس کا کام کر لینا تجھے دو وقت کی روٹی مل جائے گی۔''

''اماں، میں بھوکا ہوں۔''

''یہ روٹی ہے بیٹا گڑ ہے۔ بوتل میں پانی ہے۔ گاؤں سے باہر نکل کر کھا لینا!''

''اماں مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔''

''ہمت کر بیٹا۔ فضل خاں جاگ گیا تو تجھے بھی مارے گا اور مجھے بھی۔ بیٹا ہمت کر۔'' ماں کی آواز میں

آنسو گندھے ہوئے تھے۔

''اماں!''

''ہمت کر میرے لعل۔ جو کچھ میں کر بیٹھی ہوں۔ اب اس کا کوئی مداوا نہیں ہے میرے پاس۔''

''ٹھیک ہے اماں۔''

''تو بس نکل جا یہاں سے اللہ تیرا اٹھکانہ کرے۔''

''تو کیا کرے گی؟''

''میں ٹھیک ہوں نادر۔ میری فکر مت کر!''

''تو میں چلتا ہوں۔''

''یہ تھوڑے سے پیسے بھی ہیں۔ سنبھال کر رکھ لے۔''

''اچھا اماں!'' میں نے ساری چیزیں سمیٹیں۔ اماں نے ایک بار مجھے سینے سے لگایا اس وقت مجھے ایک ماں کی کیفیت کا ادراک نہیں تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ماں پر کیا گزر رہی ہے۔ میں وہاں سے باہر نکل آیا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ہر گھر کا چراغ بجھ چکا تھا۔ دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس وقت بھوک نے نڈھال کر رکھا تھا۔ روٹی پاس تھی اور بس دل میں ایک خیال تھا کہ کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں بیٹھ کر روٹی کھالوں۔ یہی لگن تیز چلا رہی تھی۔ ڈر تھا نہ خوف، جستی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ کچھ دیر کے بعد ماما رمضان کے کھیتوں پر نکل آیا۔ مجھے پتہ تھا کہ یہاں کوئی نہیں ہوتا۔ ایک جگہ بیٹھ گیا اور پھر بے چینی سے روٹی کا کپڑا کھول لیا۔

ماں نے بہت سی روٹیاں پکا دی تھیں گڑ بھی کافی تھا..... دو روٹی اور گڑ کھایا۔ جان میں جان آئی تھی۔ پھر پانی پیا تو پورے بدن میں سنسناہٹ دوڑنے لگے۔ دل چاہا کہ یہیں لیٹ جاؤں۔ مگر لیٹنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ کوئی جگہ تلاش کرنی چاہئے۔ اور یہاں سے دور نکل جانا بھی ضروری ہے..... ماں نے کہا تھا۔

''تو یہاں سے چلا جا..... کسی اور گاؤں میں جا رک نوکری کر لینا.....!'' میں چونک پڑا اور میں نے سوچا۔

''کیا کوئی اور گاؤں بھی ہے..... ہاں ضرور ہے۔ ورنہ بستی میں مہمان کہاں سے آتے تھے؟''

کیسا ہوگا دوسرا گاؤں.....؟ میں نے زندگی میں کوئی دوسرا گاؤں نہیں دیکھا تھا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ کبھی رانی تال کے میلے میں گیا تھا جو بستی سے کچھ دور سال میں ایک بار لگتا تھا۔ وہ جگہ بھی زیادہ دور نہیں تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ رانی تال چلوں۔ میلہ لگتا تھا اور وہاں کچی مٹی کی دوکانیں بنی ہوئی تھیں۔ میلہ ختم ہو جاتا تو یہ دکانیں بھی خالی ہو جاتی تھیں اور پھر سال بھر خالی پڑی رہتی تھیں۔ میں وہاں آرام سے سو سکتا تھا۔ چنانچہ اپنی جگہ سے اٹھ کر چل پڑا۔

اور پھر رات کی تاریکی میں میرا یہ سفر جاری رہا۔ ہوا چل رہی تھی۔ کھیت لہلہا رہے تھے۔ اچانک مجھے خوف کا احساس ہوا۔ پہلی بار یہ احساس میرے دل میں جاگا کہ میں اکیلا ہوں اور چاروں طرف تاریکی ہے۔ لیکن اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ یہاں کون آئے گا اور کوئی آ بھی جائے تو میرا کیا بگاڑ لے گا۔ ہمت کر کے میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔

پھر گاؤں پیچھے رہ گیا۔ اب کچھ نہیں نظر آ رہا تھا..... پھر تھوڑی روشنی پھیل گئی۔ یا پھر اب میری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ مجھے بھورے مٹی کے ٹیلے..... جنگل کے درخت نظر آنے لگے۔ پھر دور سے رانی تال بھی نظر آ گیا۔ ویران دکانداروں کی قطار بکھری ہوئی تھی۔ میری رفتار اور تیز ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد رانی تال آ گیا اور میں دوکانوں کے پاس پہنچ گیا۔ سب سے پہلے جو دکان سامنے آئی اس میں داخل ہو کر میں نے اپنا مختصر سامان نیچے رکھا۔ میں تھکن سے چور تھا۔ اول تو مار پڑی تھی۔ پھر دن بھر بھوکا پیاسا رہا تھا۔ اس لئے نڈھال ہو رہا تھا۔ ماں کی دی ہوئی روٹیوں کے کپڑے پہ سر رکھا اور لیٹ گیا۔

ایسا وقت کبھی نہیں پڑا تھا..... اب کیا ہوگا..... دوسرا گاؤں کیسا ہوگا؟ نوکری کیسے ملی گی؟ یہ تمام خیالات دماغ میں آنے لگے اور دل چاہا کہ چیخ چیخ کر روؤں..... آنسو آنکھوں سے باہر نکل پڑے۔ رونے میں بہت مزا آ رہا تھا۔ ایک عجیب سی فرحت دل کو ہو رہی تھی۔ پھر

اچانک ایک آواز ابھری..... ایک عجیب سی آواز..... اور میرا دل اچھل پڑا..... یہ کیسی آواز ہے..... میں سہم کر اٹھ گیا آہ کوئی ہے۔ ضرور کوئی آس پاس موجود ہے۔ مگر کون؟''

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں گھور رہا تھا اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کوئی چل رہا ہے۔ کہیں کوئی خطرناک جانور نہ ہو۔ کبھی کبھی بستی میں درندہ گھس آتا تھا۔ بکریوں کو اور چھوٹے بچوں کو زخمی کر دیتا تھا۔ اب کیا ہوگا۔ میرے پاس تو کوئی ڈنڈا بھی نہیں ہے۔ میں نے ٹٹول کر آس پاس کوئی پتھر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ پانی کی بوتل سے ہاتھ لگا اور بوتل گر کر دور سرک گئی۔ رات کے سناٹے میں اس کی آواز ابھری تھی لیکن اس آواز کی وجہ سے دوسری آواز رکی گئی۔

میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ شدید خوف سے جان نکلی جا رہی تھی۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دی۔ اب مجھے ایک انسانی ہیولا اپنی طرف بڑھتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لئے کہ کہیں چیخ نہ نکل جائے۔ لیکن پھر ایک آواز ابھری۔

''کون ہے؟''

میں نے اور مضبوطی سے منہ بھینچ لیا۔ ہیولا اب بالکل قریب آ گیا تھا۔ آواز دوسری بار سنائی دی۔

''کون ہے؟'' اس کے ساتھ ہی ماچس کی تیلی جلی اور میرے حلق سے چیخ نکل ہی گئی۔

''ایں..... کون ہے؟'' اس بار آواز میں حیرت تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ یہ آواز کچھ جانی پہچانی سی ہے۔ ماچس کی دوسری تیلی جلی اور وہ جو کوئی بھی تھا میرے قریب آ گیا۔ ''بولتے کیوں نہیں۔ کون ہو۔ اس بار بھی نہ بولے تو چھری مار دوں گا!'' آواز نے کہا۔ اور میں نے آواز پہچان لی۔ یہ الیاس بھائی کی آواز تھی۔

''نہیں الیاس بھائی۔ مجھے چھری نہ مارنا۔''

''ایں..... کون ہے تو؟''

''ن..... نادر.....''

''نادر؟'' حیرت سے کہا گیا۔

''ہاں''

ماچس کی تیلی پھر جلی۔ اس بار اس کی روشنی میں الیاس بھائی نے میرا چہرہ دیکھا دیکھتے رہے پھر نرم لہجے میں بولے۔

''تو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''سو رہا تھا۔''

''یہاں؟''

''ہاں۔''

''مگر کیوں؟''

''گھر سے بھاگ آیا ہوں۔''

''اوہ، کیوں؟''

''اماں نے کہا ہے کہ نادر کہیں اور چلا جا..... ابا نے بہت مارا ہے الیاس بھائی کہہ رہا تھا کہ تین دن بھوکا رکھے گا۔''

''تو ہے بھی تو الو کا پٹھا..... ابے وہاں انکار نہیں کر سکتا تھا؟''

''مجھے کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔''

''بے وقوف کہیں کا۔''

''الیاس بھائی۔'' میں نے سہمی آواز میں کہا۔

''ہوں۔''

''تم مجھے چھری مارو گے؟''

''کس نے کہا تھا؟''

''فضل خاں نے۔''

''دل تو یہی چاہ رہا تھا مگر۔''

''مگر کیا؟''

''کچھ نہیں۔ ٹھیک ہے ڈرمت کچھ نہیں کہوں گا تجھے۔ وہ سالی ضرورت سے زیادہ ہی پار سا بن گئی۔ اپنا دل اکھڑ گیا یہاں سے..... لعنت ہے..... ایک بات بتا۔''

''جی الیاس بھائی؟'' مجھے تسلی ہو گئی۔

''گھر واپس آئے گا؟''

''نہیں الیاس بھائی۔ اب گھر واپس جاؤں فضل خاں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔''

''چل پیارے۔ اب یہ نگر چھوڑ دیں۔''

''میں تو چھوڑ دیا الیاس بھائی۔''

''جائے گا کہاں؟''

''بس چلتا رہوں گا کہیں کوئی جگہ مل جائے گی۔''

''مجھ سے دوستی کرے گا؟''

''آپ تو میرے بڑے بھائی ہیں۔''

''ٹھیک ہے پھر میرے ساتھ ہی رہنا۔''

''کیا آپ بھی جارہے ہیں؟''

''گھاں اب یہاں اپنا بھی ٹھکانہ نہیں ہے۔ سب دشمن بن گئے ہیں۔ مگر ٹھیک ہے سیانے کہتے ہیں کہ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے ہم بھی قسمت آزمائیں گے۔ شہر چلیں گے ہم کسی بڑے سے شہر۔''

''شہر کیا ہوتا ہے الیاس بھائی؟''

''جو ہوتا ہے دیکھ لینا۔ بھوک لگ رہی ہے۔ صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔ چل اب آرام سے سو سوجا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''وہ الیاس بھائی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بولو۔ کیا بات ہے؟''

''تمہیں بھوک لگ رہی ہے میرے پاس گڑ اور روٹی ہے۔ کھاؤ گے۔''

''او بے قسم اللہ کی کہاں ہے ابے۔'' الیاس بھائی خوشی سے اچھل پڑے۔

''یہ لو.....'' میں نے دونوں چیزیں ان کے حوالے کردیں۔ پھر پانی کی بوتل بھی تلاش کر کے ان کے حوالے کردیا۔ الیاس بھائی سب چٹ کر گئے۔ پھر پانی پی کر کئی ڈکاریں لیں اور پھر میرے قریب ہی لیٹ گئے۔

دوسرے دن صبح ہونے سے پہلے ہم جاگ گئے اور وہاں سے چل پڑے۔ اب مجھے ہمت ہوگئی تھی۔ ایک بڑا ساتھ تھا اب کیا ڈر۔ ہم چلتے رہے پورے دن کا سفر طے کر کے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بہت سے گھر نظر آرہے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک عجیب سی جگہ نظر آرہی تھی۔ یہاں بڑا مجمع لگا تھا۔ سب سے زیادہ حیرانی کی چیز وہ تھی جسے دیکھ کر میں سہم گیا۔ بہت سے کمرے ایک ساتھ دوڑ رہے تھے۔

میں سہم کر الیاس بھائی سے چمٹ گیا۔

''کیا ہوا؟'' وہ حیرت سے بولے۔

''وہ..... وہ الیاس بھائی وہ کیا ہے.....؟'' میں نے دوڑتے کمروں کی طرف اشارہ کیا۔

''ریل ہے..... اور کیا ہے تو نے کبھی ریل نہیں دیکھی؟ ابے ہاں تو نے کہاں دیکھی ہوگی۔ یہ ریل ہے۔''

پھر الیاس بھائی مجھے ریل کے بارے میں بتانے لگے اور میں حیرت سے دنگ رہ گیا۔ کمال ہے اس دنیا میں ریل بھی ہوتی ہے۔

ہم آگے بڑھ کر اس بہت لمبے چبوترے پر پہنچ گئے جس پر زبردست مجمع لگا ہوا تھا۔ ریل گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ روشنیاں ہو رہی تھیں لوگ ریل سے اتر رہے تھے اس میں چڑھ رہے تھے دکانیں بھی لگی ہوئی تھیں ان رپ نہ جانے کیا کیا بک رہا تھا بالکل رانی تال کا میلہ لگ رہا تھا۔ الیاس بھائی ایک ایسی دکان پر جا کر کھڑے ہوئے جہاں نان کباب بک رہے تھے۔

''چار نان۔ آٹھ کباب۔'' انہوں نے کہا۔ اور دوکان دار کے ہاتھ جلدی جلدی چلنے لگے۔ وہ دوسرے لوگوں کو بھی نان کباب دے رہا تھا۔ پیسے لے رہا تھا، پیسے دے رہا تھا۔

پھر اس نے الیاس بھائی کو بھی نان کباب دے دیئے اور دوسرے گاہک کو نمٹانے لگا۔ پھر اس نے کہا۔'' اڑتیس روپے صاحب!''

''بارہ روپے واپس کر بھائی!'' الیاس بھائی بولے۔

''آپ نے کیا دیا ہے صاحب!''

''پچاس کا نوٹ۔''

''پچاس کا نوٹ؟'' دکاندار یاد کرنے لگا۔

''او جلدی کر یار..... ریل چھوٹ جائے گی۔ بعد میں یاد کر لینا.....'' الیاس بھائی بولے اور دوکاندار نے بارہ روپے انہیں واپس کر دیئے۔ الیاس بھائی میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے آگے بڑھے اور پان والے کی دکان پر پہنچ گئے۔

''چار پان ڈبل..... ایک پیکٹ سگریٹ ایک ماچس.....'' دکاندار جلدی جلدی پان بنانے لگا۔ تمام

چیزیں لینے کے بعد الیاس بھائی بولے۔ ''پیسے واپس دے بھائی۔ جلدی ریل چل پڑے گی۔''

''صاحب آپ نے کیا دیا ہے؟''

''بیس روپے۔''

''جی صاحب۔'' دوکاندار نے الیاس بھائی کو دیکھا اور باقی پیسے ان کے حوالے کر دیئے۔ پھر وہم میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے ایک طرف چل دیئے۔ میں سخت حیران تھا لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔ کافی دور لال رنگ کے بہت سے ڈبے کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ بند ے تھے کچھ کھلے ہوئے۔ الیاس بھائی نے ایک کھلا ڈبہ تاکا۔ مجھے سہارا دے کر اوپر چڑھایا پھر خود بھی اوپر آ گئے۔ ڈبے میں تالا تعداد ٹاٹ کی بوریاں چنی ہوئی تھیں۔ بیٹھنے کے لئے بہترین جگہ بنی ہوئی تھی۔ وہ آرام سے بیٹھ گئے اور کاغذ کھول کر نان کباب سامنے رکھ لئے۔

''لے یار، ڈٹ کر کھا!''

دن بھر کی بھوک تھی۔ دو روٹیاں اور تین کباب میں چٹ کر گیا۔ الیاس بھائی نے بھی جی بھر کر کھایا۔ اس دوران وہ ریل چھک چھک کرتی ہمارے سامنے سے گزر گئی تھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر نلکا لگا ہوا تھا۔ ہم نے نیچے اتر کر پانی پیا اور پھر دوبارہ اس ڈبے پر آ بیٹھے۔ الیاس بھائی نے ایک پان منہ میں دبا کر سگریٹ سلگایا اور اس کے گہرے گہرے کش لینے لگے۔ پھر مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔

''پیٹ بھر کر کھایا ہے نا؟''

''جی الیاس بھائی لیکن۔''

''ہاں کیا ہے؟''

''ایک بات بتائیں۔''

''پوچھو!''

''وہ نان کباب والے کو آپ نے پچاس کا نوٹ دیا تھا؟''

''ابے دماغ خراب ہوا ہے کیا؟''

''کیوں؟''

میں نے پچیس سال سے پچاس کا نوٹ آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ دیتا کہاں سے؟''

''تو پھر.....؟''

''ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔''

''اور پان والے کو بھی بیس روپے نہیں دیئے تھے؟''

''کل بارہ روپے جیب میں تھے اس وقت۔ آٹھ روپے اس نے واپس کئے۔ اب کہیں جا کر بیس روپے ہوئے ہیں۔''

''اوہ.....'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''یہ بچی ہوئی روٹیاں اور کباب اچھی طرح کاغذ میں لپیٹ کر رکھ لے۔ صبح کا ناشتہ اسی سے ہوگا اور رزق کی بے حرمتی نہیں کرتے۔''

میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ الیاس بھائی نے کئی سگریٹ پیئے۔ پھر بولے۔

''گھر یاد آ رہا ہے؟''

''نہیں۔''

''تو پھر آرام سے سو جا۔'' وہ خود بھی بوریاں بچھا کر لیٹ گئے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ تاریک آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے مجھے گھر واقعی یاد آ رہا تھا۔ لیکن وہ گھر مصیبتوں بھرا تھا..... ماں کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا..... اور ماں..... اسے یاد کرتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن رونا بے کار ہے۔ اس نے فضل خاں سے شادی کیوں کی تھی۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ فضل خاں نے مار مار کر میرا بھرکس بنا دیا۔

نہ جانے کب نیند آ گئی۔ گہری نیند سو رہا تھا کہ بڑی زور کا دھکا لگا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ کیا ہوا کہ دوبارہ دھکا لگا اور پھر روشنی کے کھمبے بھاگنے لگے۔

''الیاس بھائی۔'' میرے منہ سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

''سو جا یار۔ کچھ نہیں ہے۔ سو جا۔''

''یہ کھمبے کیسے بھاگ رہے ریل چل پڑی ہے۔''

''کہاں؟''

''اوسو جا۔ پتہ چل جائے گا۔'' الیاس بھائی نے کروٹ بدل لی۔ میں سہما ہوا بیٹھا رہا۔ ریل نہ ہوئی بیل گاڑی ہوگئی۔ پھر آخری روشنی بھی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

یہ اس نئی زندگی کا آغاز تھا۔ یوں تو بچپن سے عمر کی ایک منزل تک کی کہانی دلچسپیوں سے خالی نہیں ہے۔ میں نے شہر دیکھا۔ شہر دیکھ کر مجھ پر جو بیتی آج بھی یاد کرتا ہوں تو خود پر ہنستا ہوں۔ کیا کیا لطیفے ہوئے تھے۔ الیاس بھائی نے کافی ساتھ دیا لیکن وہ چار سو بیس آدمی تھے۔ شہر میں بھی انہوں نے اپنا وہی کاروبار جاری رکھا۔ کئی جگہ مار کھائی مجھے اس میں بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔ پھر ایک بار وہ پکڑے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ مقدمہ چلا دونوں کو جیل ہوگئی مجھے بچہ جیل میں بھیجا گیا تھا۔ ابس یہیں سے الیاس بھائی کا ساتھ چھوٹ گیا۔ جیل سے رہا ہو کر انہیں تلاش کیا وہ نہیں ملے۔ پھر ماسٹر غیاث علی ملے۔ نیک دیندار آدمی تھے۔ مجھے گھر لے گئے۔ گھر کے کام کاج کرتا تھا۔ وہ مجھے پڑھاتے تھے۔ یہاں سے میں پڑھنا لکھنا سیکھ لیا اور ماسٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ ان کی پانچ بیٹیاں تھیں بیٹا کوئی نہیں تھا۔ سب سے بڑی لڑکی فرزانہ مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی مگر چند سال بڑی لگتی تھی۔ میں اسے فرزانہ باجی کہتا تھا۔

ایک دن صحن میں پیپل کے پیڑ کے نیچے سو رہا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ کوئی میرے پاس آ کر لیٹ گیا تھا۔

''کون ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا تو میرے منہ پر ایک ہاتھ آ جما۔

''شور کیوں مچا رہا ہے۔'' سرگوشی فرزانہ باجی کی تھی۔

''باجی!''

''کیا باجی باجی لگا رکھی ہے۔ چھوٹی ہوں تجھ سے۔''

''یہاں کیوں آ گئیں؟''

''اندر بڑی گرمی ہے۔ دیکھ تو پسینے میں بھیگ رہی ہوں۔'' انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے قمیض کے نیچے پسینے دکھایا۔ عجیب پسینہ تھا۔ میں نے جلدی سے ان سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اور پلنگ سے نیچے اتر آیا۔

''میں کہیں اور سو جاتا ہوں۔''

''پاگل ہوا ہے کیا۔ چپکا پڑا رہ۔''

''نہیں باجی۔''

''پھر باجی۔''

''باجی۔ آپ جائیں یہاں سے۔''

''نہیں جاؤں گی۔''

''میں ماسٹر صاحب کو آواز دے لوں گا۔''

''نادر..... تو جوان ہو چکا ہے۔ کیا تجھے اپنی جوانی کا احساس نہیں؟''

''بس آپ جائیں.....'' میں نے کہا۔ اسی وقت ماسٹر غیاث کی کھانسی کی آواز ابھری اور فرزانہ باجی بجلی کی طرح تڑپ کر اٹھ گئیں اور پھر دبے پاؤں اندر چلی گئیں۔

دوسرے دن میں ماسٹر غیاث علی کے ساتھ اسکول گیا تو انہوں نے کپڑوں کی ایک پوٹلی مجھے دے کر کہا۔

''نادر بیٹے۔ تو بہت اچھا ہے۔ خدا تجھے خوش رکھے۔''

''مگر یہ کیا ہے ماسٹر صاحب!''

''تیرے کپڑے!''

''کیا کروں ان کو؟''

''یہ دو سو روپے ہیں۔'' ماسٹر نے مجھے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

''کہیں جانا ہے؟''

''ہاں!''

''کہاں؟''

''اپنی تقدیر پر بھروسہ کر۔ جہاں بھی تجھے لے جائے بیٹے اب میں تجھے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ بچیاں جوان ہوگئی ہیں۔ لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں۔''

میں نے خاموشی سے یہ چیزیں ان سے لے لیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ رات کو ماسٹر صاحب جاگ رہے تھے۔ واقعی میں جوان ہو گیا تھا۔ کیونکہ میں نے ماسٹر صاحب سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اور خاموشی سے وہاں سے چل پڑا تھا۔

بہت کچھ ملا تھا مجھے اس گھر سے۔ اتنا علم مل گیا تھا

کہ دنیا کو سمجھ سکوں۔ اعتماد بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ شہر بھی چھوڑ دیا اور ایک نئے شہر میں آ گیا۔ یہاں ریلوے کے ایک مال خانے کے منشی صاحب تھے۔ نام فیض خاں تھا۔ انہوں نے مجھے حساب کتاب کی نوکری دے دی جس کے تنخواہ وہ اپنے پراسرار وسائل سے ادا کرتے تھے۔ ریلوے کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک بیٹا ریاض خان تھا بیوی تھیں۔ مجھے بھی اسی گھر میں ہی پناہ مل گئی۔

ریاض خاں آوارہ منش تھا پورا نہ گھرانہ دلچسپ تھا۔ فیض خاں کے بارے میں پتہ چلا کہ دنیا کا ہر نشہ کر چکے ہیں اور اب ہر نشہ ان پر بے اثر ہے۔ پھر بھری اخلاقاً افیون کھالیا کرتے تھے۔ وہ کسی خاص مشن پر کام کر رہے تھے۔ عجیب عجیب بھٹیاں بنا رکھی تھیں عجیب بھٹیوں میں وہ کچھ پکاتے رہتے تھے۔

''یہ آپ کیا کرتے ہیں فیض چچا؟''

''اپنے کام سے کام رکھا کر.....!'' انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔

''میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔''

''میرے ساتھ کام کرے گا؟''

''کام کام!''

''یہی جو میں کرتا ہوں۔''

''میں نے پوچھا تو تم نے ڈانٹ دیا۔''

''رازداری کا وعدہ کر۔''

''کیا.....'' میں نے کہا۔

''سونا بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کیمیا بنا رہا ہوں۔''

''یہ کیا ہوتا ہے؟''

''اس سے سونا بنتا ہے۔''

''تو پھر.....؟''

''بس ذرا سی کسر رہ جاتی ہے لیکن کامیاب ہو جاؤں گا۔'' پھر میں نے بھی ان کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ نہ جانے کیسی کیسی جڑی بوٹیاں تلاش کرتے پھرتے تھے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ جھک مارنی پڑتی تھی۔ ایک دن ریاض نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو آج کل تم بھی ابا کے ساتھ سونا بنا رہے ہو؟''

''پتہ نہیں۔'' میں نے بے زاری سے کہا۔

''یہ دونوں پاگل ہیں۔''

''دونوں کون؟''

''اماں اور ابا۔''

''کیا بکواس ہے؟ اپنے ماں باپ کے بارے میں ایسے باتیں کرتے ہو؟''

''کیا کروں؟ بچپن سے یہی دیکھ رہا ہوں۔''

''مگر چچی کیا کرتی ہیں؟''

''دیکھا نہیں تم نے؟''

''کیا؟''

''الٹے سیدھے وظیفے پڑھتی رہتی ہیں۔ جنات اور آسیب کو قبضے میں کرنے کے لئے۔''

''کیا.....؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''دونوں ہی مریض ہیں.....'' ریاض خاں اپنے ماں باپ کی ذرا بھی عزت نہیں کرتا تھا ویسے خود بھی کوئی بہتر انسان نہیں تھا، لیکن مجھے ان تمام باتوں سے کیا غرض، وقت گزر رہا تھا اور میں بہت کچھ سیکھتا جا رہا تھا۔ فیض خاں کیمیا بنانے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کرتا رہا اور پھر ایک دن آدھی رات کے وقت جب تمام لوگ گہری نیند سو رہے تھے اچانک فیض خان کی چیخوں سے سارا گھر لرزنے لگا۔ سب ہی جاگ گئے۔ فیض خان شعلوں میں گھرا ہوا تھا اور پورے گھر میں لوٹتا پھر رہا تھا جیسے اس کے بدن کی کھال جل رہی ہو، گوشت جلنے کی چراند اور نیلے شعلوں نے اس کے پورے بدن کو اپنے لپیٹے میں لیا ہوا تھا۔ ریاض خاں کمبل لے کر اس کی طرف دوڑا تو اس کی ماں نے ریاض خاں کا کالر پیچھے سے پکڑ لیا اور اسے ایک جانب دھکیلتی ہوئی بولی۔

''اگر تو اس کے قریب پہنچا تو تیری کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں ہوگی.....''

''مم.....مگر.....وہ مگر جائے گا۔''

''اس نے یہ موت خود خریدی ہے، حالانکہ میں

نے اسے منع کیا تھا.....''

''کیا مطلب.....؟'' ریاض خاں بولا۔

''کیا یہ مطلب بتانے کا وقت ہے۔'' اس کی ماں نے جسے میں چچی کہا کرتا تھا سخت لہجے میں کہا۔ مجھے بہت عجیب سا محسوس ہوا چچی کی کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ فیض خان کو جلنے دینا چاہتی ہے لیکن کیوں.....؟ آخر کیوں.....؟ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی فیض خان زمین پر گر کر تڑپتا رہا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد جھلس کر چرمر ہو گیا۔ میرے لئے یہ نہایت سنسنی خیز لمحات تھے، ریاض خان بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے باپ کو موت کی آغوش میں جاتے دیکھ رہا تھا، چچی جان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا.....

''میرا سہاگ ختم ہو گیا، لیکن کیا کروں اس انسان کو کس طرح سمجھاتی پوری زندگی ہی سمجھاتے سمجھاتے گزری ہے، نہ باپ نہ کبھی کچھ کیا نہ بیٹے نے، کانٹوں کی سیج پر جھلتی رہی ہوں میں۔''

''لل.....لیکن.....لیکن''

''نہیں بے کار ہے نادر بیٹے بے کار ہے۔ نہ تم کچھ کر سکتے ہو نہ میں اور نہ ریاض خان کچھ کر سکتا تھا۔ فیض خان کو مرنا ہی تھا۔ میں جتنی کوشش کر سکتی تھی کر لی کامیاب نہیں ہو سکی.....'' اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ عجیب کردار تھا اس عورت کا کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آئی تھی میرے۔

بہر حال اہل محلہ کو علم ہوا کہ فیض خان جھلس کر مر گیا ہے۔ سب ہی اس سے نالاں معلوم ہوتے تھے۔ میں حالانکہ خاصے دن یہاں گزار چکا تھا لیکن نہ جانے کیوں یہ خاندان میری نگاہوں میں بے حد پراسرار تھا۔ اب دنیا کو سمجھنا آ گیا تھا، ویسے بھی عمر کم نہیں رہی تھی وقت کے ساتھ ساتھ کافی آگے بڑھ گیا تھا اور دنیا کو بہت گہری نگاہوں سے دیکھ چکا تھا پھر آہستہ آہستہ باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ چچی جان اپنا سہاگ لٹ جانے کی وجہ سے دل برداشتہ رہنے لگی تھیں۔ انہوں نے بیوگی خود پر طاری کر لی تھی لیکن شوہر کے سلسلے میں جب بھی کبھی گفتگو ہوتی ان کا لہجہ تلخی سے بھرپور نظر آتا تھا، بالآخر ایک دن یہ راز بھی کھل گیا۔ ریاض خان تو اپنی آوارہ گردی میں مصروف رہتا تھا صرف میں تھا جو چچی جان کا رازدار، ہمدرد، مونس اور غم خوار تھا انہوں نے کہا۔

''شادی کے بعد سے آج تک۔ یعنی اس وقت تک جب تک فیض خان زندہ رہا صحیح معنوں میں مجھے یہ احساس ہی نہیں ہو سکا کہ عورت کو زندگی میں کبھی مرد کا تحفظ مل سکتا ہے یا نہیں، میں ان تمام چیزوں سے محروم رہی ہوں۔ زندگی کے ہر شعبے سے گزرنے کے لئے مجھے اپنے طور پر ہی سب کچھ کرنا پڑا ہے.....''

''لیکن چچی جان بات کیا ہے.....؟''

''بات کیا ہوتی میں خود بھی ایک معمولی سے گھرانے کی فرد ہوں، دیکھو بیٹے ہر انسان زندگی اپنے طور پر اپنے انداز میں گزارتا ہے۔ جیسے اس کے وسائل ہوتے ہیں، لیکن اگر کوئی وسائل کی تلاش میں زندگی کھو دینے پر تل جائے تو اس کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔ فیض خان ابتدا ہی سے کچھ کرنے کے قائل نہیں تھا، بلکہ اسی طرح جیسے اب اس کا بیٹا ریاض کچھ نہ کرنے کے قائل ہے۔ آوارہ گردی کی زندگی بسر کرنے کے بعد اپنے لئے پیٹ بھر روٹی حاصل کر لیتا ہے، تن پر کپڑا حاصل کر لیتا ہے اور بس اس کے بعد اس دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''ہاں یہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔''

''جبکہ زندگی ایسی چیز نہیں ہے۔''

''مجھے اندازہ ہے چچی جان.....''

''یہی کیفیت فیض خان کی تھی مجھ سے شادی ہو گئی میں نے تمہیں بتایا کہ ایک معمولی سے گھرانے کی فرد ہوں میں بھی، میرے ماں باپ نے بھی مجھے یوں سمجھ لو اپنے شانے کے بوجھ کی مانند اتار دیا تھا اور یہ بوجھ فیض خان نے کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اپنے مشاغل میں مصروف رہا اور اس نے ساری زندگی سونا بنانے کے چکر میں گزار دی، مجھے بھی اس نے اسی راستے پر لگا دیا نہ

جانے کیسے کیسے گنڈے، تعویذ اور عمل، نیک اور بد میں کچھ نہیں جانتی بس کچی عمر میں آئی تھی اس کے پاس اس کے رنگ میں رنگ گئی۔ لیکن جوں جوں زندگی آگے بڑھی مجھے یہ احساس ہوتا چلا گیا کہ ایک انتہائی نکمے اور بدنیت انسان کے ساتھ زندگی کا یہ سفر کرنا پڑے گا، بہر حال نادر انسان کا اپنا ایک ماحول ہوتا ہے میرا بھی یہی ماحول تھا، رفتہ رفتہ میں نے یہ سب کچھ قبول کرلیا لیکن فیض خان کی کارکردگی سے مجھے کبھی اطمینان نہیں حاصل ہوا۔ میں بھی چلے وظیفوں کی عادی ہوگئی اور اپنے طور پر اسی انداز میں کام کرنے لگی۔ پھر یہ کم بخت ریاض خان میری زندگی میں آیا لیکن اس نے بھی جوان ہونے کے بعد جو روپ اختیار کیا اب وہ تمہارے سامنے ہے۔''

''لیکن چچی جان وہ آگ کیسی تھی جس نے فیض خان کو جھلسا دیا.....؟'' چچی جان کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پھیل گئی، تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔

''اس نے بھیروں جگانے کی کوشش کی تھی.....''

''کیا.....؟''

''ہاں..... وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہتا تھا، تمام کوششیں کرلی اس نے۔ اس کا کہنا تھا کہ کیمیا بنانے کے لئے بس ایک ایسی کسر باقی رہ جاتی ہے جو آج تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر وہ کسر بھی پوری ہوجاتی تو وہ سونا بنا کر دنیا کا امیر ترین انسان بن سکتا تھا۔''

''پھر.....؟'' میں نے سوال کیا۔

''پھر میں نے اسے بھیروں کو جگانے کی ترکیب بتادی.....''

''کیا.....؟''

''ہاں.....''

''آپ نے بتادی چچی جان.....؟''

''ہاں..... مجھے معلوم تھا.....''

''مگر کیسے؟''

''یہ نہ پوچھو بیٹے.....'' چچی جان نے کہا۔

''لیکن چچی جان اس ترکیب کے بعد تو فیض خان کی زندگی ہی نہ رہی۔''

''آسان کام نہیں تھا، بہت مشکل کام تھا۔ جن، بھوت، پریت، آتما، آسیب، آسانی سے قابو میں تو نہیں آتے وہ کسی انسان کی غلامی کیوں پسند کریں گے، لیکن ہاں اگر انسان کے پاس طاقت ہو تو وہ یہ غلامی قبول کرسکتا ہے، اور یہی بابا سفیدے کا کہنا ہے.....''

''بابا سفیدے.....'' میں نے چونک کر پوچھا۔! اور محسوس کیا کہ چچی جان بھی ایک دم چونک گئی ہیں۔

''بہت زیادہ باتیں نہیں کرتے.....''

''لیکن چچی جان میرے دل میں یہ خیال ہے کہ میں آپ سے اس کے بارے میں تفصیلات معلوم کروں۔'' وہ مجھے غور سے دیکھنے لگیں پھر بولیں۔

''بابا سفیدے..... ایک عجیب وغریب انسان ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان، کون سے مذہب سے تعلق رکھتا ہے، بہت فاصلے پر اس نے اپنی ایک جھونپڑی بنا رکھی ہے اسی میں رہتا ہے، بہت کم لوگوں سے ملتا ہے، کبھی کبھی کسی کا کوئی کام بھی کردیتا ہے مجھ پر خاص طور سے مہربان ہے، یقین کرو میں نے پورے خلوص کے ساتھ اس سے بھیروں جگانے کی ترکیب پوچھی تھی۔''

''مگر بھیروں ہے کیا چیز.....؟''

''کالے علم کا ایک دیوتا جو اگر قابو میں آجائے تو بہت سے کام آسان ہوجاتے ہیں اگر بھیروں کو جگالیا جاتا تو سونا بنانے کی وہ ترکیب آسانی سے فیض خان کو حاصل ہوجاتی اور اس کے بعد اس کا کام بن جاتا، وہ میرے پیچھے پڑا ہوا تھا، بہت عرصے سے پیچھے پڑا ہوا تھا لیکن بابا سفیدے نے صاف صاف کہہ دیا تھا.....''

''کیا کہہ دیا تھا.....؟''

''یہ کہ بھیروں جگانے میں اگر اسے ناکامی ہوئی تو پھر وہ زندگی نہ پاسکے گا۔''

''یعنی مرجائے گا.....!''

''ہاں.....''

''تو پھر؟''

''میں نے وہ ترکیب فیض خان کو بتادی۔''

''اور فیض خان اس سلسلے میں مصروف ہوگئے؟''

''ہاں.....''

''آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے چچی جان کہ وہ ہیروں جگانے کی اس ترکیب کو صحیح طور پر استعمال ہی نہیں کرسکے۔''

''یہی بات ہے۔''

''اور ان کے بدن کو آگ لگ گئی۔''

''اس آگ کو کوئی نہیں روک سکتا تھا وار اسے بجھانے کی کوشش کرنے والا خود بھی اسی آگ کا شکار ہو جاتا اسی لئے میں نے ریاض خان کو اور تمہیں اس سے منع کیا تھا۔''

''یہ تو بہت بری بات ہوئی.....''

''دیکھو بیٹے ویسے تو انسان بڑی کمزور شخصیت کا مالک ہوتا ہے لیکن بہتر یہی ہوتا ہے کہ اسے اپنے طور پر اپنی زندگی گزارنے کا بندوبست کرنا چاہئے اور ایسے طریقوں سے دولت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔''

''مگر انسان چاہتا تو یہی ہے چچی جان.....''

''ہاں یہی چاہتا ہے، تمہیں ہنسی آئے گی کہ اب میں خود بھی اس کی عادی ہوچکی ہوں.....''

''کیا؟''

''طویل زندگی پڑی ہے میرے سامنے نہ جانے اس طرح وقت گزرے، نہ جانے کیا ہو، کچھ نہیں کہا جا سکتا.....''

''ٹھیک ہے لیکن اب آپ کیا کریں گی؟''

''کیا کرسکتی ہوں؟ تم دیکھ رہے ہو کہ ریاض خان میرا بیٹا ہونے کے باوجود میرے لیے بالکل ہی ناکارہ ہے، غالباً اس کے ذہن میں یہ تصور کبھی بھی نہیں آیا کہ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اور ماں کی زندگی کے لئے اسے کچھ کرنا چاہئے۔ میں نے بھی دوسری ماؤں کی طرح اس کے لئے طرح طرح کے خواب دیکھے تھے اس گھر کو ایک اچھے گھر کی مانند سجانا چاہا تھا اپنے بیٹے کی زندگی، اس کا مستقبل شروع کرنے کی خواہش کی تھی میں نے لیکن کیا کروں ہر خواہش پوری تو نہیں ہوجاتی، وہ میرے ساتھ کسی طور پر تعاون نہیں کرتا۔ تم خود دیکھ رہے ہو آوارہ گردی کرتا رہتا ہے بس اس کے علاوہ اسے کسی اور شے سے دلچسپی نہیں ہے لیکن میرے سامنے میری ایک طویل زندگی پڑی ہے.....''

''چچی جان میں آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں.....'' میں نے کہا اور چچی جان کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بیٹے میں نے زندگی میں کبھی غیر حقیقی وقت نہیں گزارا۔ میں جانتی ہوں کہ جب اپنا خون ہی اپنے ساتھ وفا نہ کرسکے تو دوسروں پر کیا بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟''

''چچی جان لیکن کبھی کبھی غیر بھی اپنوں سے زیادہ بہتر ثابت ہوتے ہیں۔''

''ہاں یہ ایک کہانی تو ہے لیکن میں نے صرف کہانی کے طور پر اسے سنا ہے اپنی آنکھوں سے کبھی ایسا نہیں دیکھا.....''

''میں کوشش کروں گا کہ اس کہانی کو حقیقت ثابت کرسکوں.....'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہوگئیں اور میں اس گھرانے کے بارے میں سوچتا رہا، واقعی اب سوچنے کا انداز تبدیل ہوگیا تھا۔ عمر اب اس منزل پر آگئی تھی کہ اپنی آنکھوں سے دنیا کی ان حقیقتوں کو دیکھ سکوں۔ بہرطور اس کے بعد ریاض خان کا وہی وطیرہ تھا آوارہ گردی کرتا، رات کو واپس آجاتا، کبھی نشے کے عالم میں کبھی کسی اور کیفیت میں۔ بھلا میں اسے کیا ٹوک سکتا تھا جب کہ اس کی ماں اس کی اصلاح نہیں کرپائی تھی، لیکن میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ چچی جان کے چلے اور وظیفوں کا وہی عالم ہے، راتوں کو جاگتی رہتی ہیں ویسے میں نے کبھی اسے نماز وغیرہ پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ جبکہ تہجد گزار اور دین دار لوگ اپنی بقاء کے لئے اپنی عاقبت کے لئے اس قسم کے وظائف کیا کرتے ہیں، چچی جان کا سلسلہ کچھ مختلف ہی تھا اور مجھے یہ احساس ہورہا تھا

کہ اس کے راستے بھی درست نہیں رہے، نہ جانے اب اسے دولت کی خواہش کیوں تھی، ہوسکتا ہے اپنے بیٹے کو ایک بہتر مستقبل دینا چاہتی ہو، یوں زندگی کا ایک یہ دور بھی گزرا اور ذہن مختلف تبدیلیاں قبول کرتا رہا، یہاں تک کہ ایک دن چچی جان نے کچھ عجیب سے الفاظ میرے سامنے کہے۔

''نادر اب تم اتنے بڑے ہو چکے ہو کہ تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہئے..... کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے تمہیں، میں نہیں چاہتی کہ ریاض کی طرح تم بھی ایک بے مقصد اور بے نام سی زندگی گزار دو'' میں سوچ میں ڈوب گیا، ماضی کے جو نقوش میرے ذہن پر چسپاں تھے وہ کبھی کبھی مجھے اپنا گھر یاد دلا دیتے تھے، لیکن اب میں یہ سوچتا تھا کہ واقعی دنیا میں رہنے والے جس انداز میں زندگی گزارتے ہیں مجھے اس سے مختلف زندگی نہیں گزارنی چاہئے۔ مجھے کچھ سوچنا چاہئے اپنے بارے میں بھی، لیکن کیا..... یہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا، میں نے کہا.....

''چچی جان میں خود بھی یہی چاہتا ہوں.....''

''صرف چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، ہر کام کے لئے کچھ نہ کچھ عمل کرنا ہوتا ہے۔''

''میں کیا عمل کرسکتا ہوں؟''

''دیکھو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وقت بہت بدل گیا ہے نئی دنیا کے نئے لوگ ذرا مختلف انداز میں سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم ان ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کرسکتے، جو بہر حال اپنا ایک مقام رکھتی ہیں.....''

''میں سمجھا نہیں چچی جان!''

''دولت..... دولت..... دولت..... اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس دنیا میں صرف دولت کی عزت کی جاتی ہے، تم خود کتنی ہی اچھی شخصیت کے مالک کیوں نہ ہو کوئی مقام کبھی نہیں حاصل کرسکتے، کسی خوبصورت سی عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کرو، دروازے کا چوکیدار تمہیں دروازے پر ہی روک دے گا، ہاں اگر تم کسی اعلیٰ درجے کی کار میں بیٹھ کر اس دروازے تک پہنچو تو وہ پہلے تمہیں سلام کرے گا اور اس کے بعد ادب سے گیٹ کھول کر کھڑا ہو جائے گا۔ یہ جانے بوجھے بغیر کہ تم کون ہو.....''

''یقیناً چچی جان ایسا ہوتا ہے.....''

''تو کیا تم اپنے آپ کو ان لوگوں میں شامل کرنا چاہتے ہو جو دروازے پر کھڑے ہو کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرتے ہیں یا پھر ان لوگوں میں جو کھلے دروازے با آسانی اندر داخل ہو جاتے ہیں؟''

''چچی جان دنیا کا ہر شخص اپنے لئے تمام دروازے کھلے ہی دیکھنا چاہتا ہے۔''

''لیکن یہ اتنا آسان تو نہیں.....''

''میں جانتا ہوں.....''

''اب تمہیں تجربہ بھی ہو چکا ہوگا.....''

''کافی حد تک.....''

''تو پھر اس کے لئے کوشش کیوں نہیں کرتے؟''

''میں نہیں جانتا کہ یہ کوشش میں کیسے کرسکتا ہوں.....''

''ہاں میں تمہیں بتا سکتی ہوں.....''

''تو بتایئے.....''

''ہر جمعرات کو بابا سفیدے کے پاس جایا کرو.....''

''یہ بابا سفیدے کیا چیز ہیں؟''

''اس انداز میں ان کے بارے میں گفتگو نہ کرو، بہت کارآمد شخصیت ہیں، اگر ان کی نظر تم پر ہوگئی تو یوں سمجھ لو کہ تمہارے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔''

''چچی جان میں چاہتا ہوں.....''

''تو پھر ٹھیک ہے میرے ساتھ چلنا.....'' اور پھر پہلی بار میں بابا سفیدے کی خانقاہ پر پہنچا۔ ایک ویران سی جگہ آباد کر رکھی تھی اس نے قرب و جوار میں پہاڑی ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ تھوڑے سے ناریل کے درخت بھی اگے ہوئے تھے، پانی کا ایک چشمہ بھی تھا اور اس کے

درمیان بابا سفیدے نے اپنی جھونپڑی بنا رکھی تھی، عقیدت مند اپنی کاروں میں بیٹھ کر وہاں جایا کرتے تھے۔ اور نہ جانے کیا کیا حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے، بابا سفیدے ایک بھاری بدن کا آدمی تھا، سر گنجا، داڑھی بہت بڑی لیکن چہرے پر ایک ایسی کرختگی ایسی خشونت اور آنکھوں میں ایک ایسی کیفیت نظر آتی تھی کہ اسے دیکھ کر ایک کراہیت کا احساس ہوتا تھا۔ حالانکہ چچی جان کا کہنا تھا کہ وہ ایک پہنچی ہوئی شخصیت ہے، لیکن پتہ نہیں وہ شخصیت کہاں تک پہنچی ہوئی تھی کم از کم مجھے تو اس کا اندازہ نہیں ہوسکا، چچی جان نے مجھے ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔

''یہ نادر ہے.....''

''میں جانتا ہوں.....'' بابا سفیدے کے ان الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ لیکن چچی جان کے چہرے پر کوئی خاص بات نہیں پیدا ہوئی البتہ میں نے ہی جرأت سے سوال کیا۔

''آپ جانتے ہیں مجھے؟'' میرے ان الفاظ پر بابا سفیدے نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔

''تیرا کیا خیال ہے کیا میں نہیں جانتا؟''

''نہیں میں اس لئے پوچھ رہا تھا کہ پہلے میری آپ سے ملاقات نہیں ہوئی.....''

''کس وقت کی بات کرتا ہے کیا اس وقت کی جب تیرا باپ اس دنیا سے اٹھ گیا تھا؟''

''جی.....''

''یا پھر اس وقت کی جب تیری ماں نے فضل خاں سے شادی کر کے تجھے زندہ درگور کر دیا تھا.....'' اس نے کہا اور میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے خوف بھری نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگا تو بابا سفیدے پھر بولا۔

''اور اب تو یہ سوچ رہا ہے کہ کہیں میں تیری بستی کا کوئی آدمی نہ ہوں، کیا تو یہ جاننا چاہے گا کہ اس آوارہ منش الیاس کے ساتھ تو نے اپنی بستی چھوڑ دی تھی یا پھر یہ جاننا چاہے گا کہ اس کے بعد تو فیض خان کے پاس کیسے آیا؟''

میرے ہوش وحواس جواب دے گئے تھے۔ یہ شخص جو کچھ بتا رہا تھا وہ ایک کھلی کتاب کی مانند تھا اور اب بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اس کے سامنے عقیدت گزار نہ ہو جاؤں، جبکہ چچی جان مسکرا رہی تھیں انہوں نے کہا۔

''کہو نادر کچھ اور بھی جاننا چاہتے ہو؟''

''نن.....نہیں.....'' میں نے جواب دیا۔

''کیا چاہتی ہے اس کے لئے؟''

''میں چاہتی ہوں کہ یہ بھی کچھ بن جائے.....''

''خدمت کرنا ہوگی اسے ہماری.....''

''کرے گا.....''

''نہیں کر سکے گا.....''

''نہیں بابا صاحب اگر آپ چاہیں تو ضرور کر سکے گا.....''

''تو اگر اس کی سفارش کرتی ہے تو میں کچھ سوچنے کے لئے تیار ہوں لیکن یہ بھی جان لے کہ اسے جو کچھ کرنا ہوگا وہ راز داری میں رہے گا۔ اس لڑکے کو کل پھر میرے پاس بھیج دینا۔''

''کس وقت بابا صاحب؟''

''کل دوپہر کو ایک بجے.....'' بابا سفیدے نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔''

''تو پھر اب بھاگ جا تیرا یہاں رکنا اب بے مقصد ہو گیا ہے.....'' بابا سفیدے نے کہا اور چچی جان مجھے وہاں سے اٹھا کر لے چلیں، میں حیرت سے اب بھی گنگ تھا، جو باتیں بابا سفیدے نے بتائی تھیں وہ تو چچی جان کو بھی نہیں معلوم تھیں، تاہم راستے میں نے ان سے کہا۔

''چچی جان یہ سب کیا ہے، اس شخص کو میرے بارے میں کیسے معلوم ہو گیا؟''

''میں نے تم سے کہا تھا نا نادر کہ وہ بہت پہنچی ہوئی شخصیت کا مالک ہے۔''

''لیکن اتنی ساری باتیں میرے بارے میں جاننا

کیسے ممکن ہوسکا؟''

''تم کیا سمجھتے ہو اس قسم کے لوگ حالات سے واقف نہیں ہوتے!''

''نہیں اب تو میں بھی اس کا قائل ہوگیا ہوں۔''

''بابا سفیدے تمہیں جو کچھ بتائے یا تم سے جو کچھ چاہے نادر ہوسکتا ہے وہ سخت ہو، لیکن تمہیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا۔''

''چچی جان میں نہیں سمجھتا کہ وہ میں کر پاؤں گا یا نہیں۔''

''یہ بات وہ خود تمہیں بتادے گا.....'' چچی جان نے کہا..... بہر حال دوسرے دن میں مقررہ وقت پر اس کے پاس پہنچ گیا اب میرے دل میں بھی لگن پیدا ہوگئی تھی ایک ایسا شخص واقعی قابل حیرت ہوتا ہے جو کسی کو کسی کے ماضی کے بارے میں وہ باتیں بھی بتادے جو باتیں خود اس کے اپنے ذہن سے نکل چکی ہوں۔ اس وقت بابا سفیدے کے پس کوئی موجود نہیں تھا، میں اس کے پاس پہنچ اور میں نے اسے سلام کیا لیکن اس نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا تھا اس بات پر مجھے حیرت ہوئی تاہم اس شخص نے جس طرح مجھ پر اپنا اثر قائم کر رکھا تھا اس کے تحت مجھے اس بات کو نظر انداز کرنا پڑا، بابا سفیدے نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا تھا نہ جانے کیوں اس وقت مجھے اس کے چہرے کے خدوخال بدلے بدلے نظر آئے اس نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں بیٹھ گیا، پھر تقریباً پانچ منٹ وہ آنکھیں بند کئے خاموشی سے کچھ سوچتا رہا تھا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے، لیکن بہر طور میں نے خاموشی اختیار کئے رکھی تھی، پھر کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں، میری جانب دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

''زندگی کے یہ راستے بہت کٹھن ہوتے ہیں لڑکے، کیا تم اپنی زندگی کو ایک بہتر شکل دینے کے لئے ان کٹھن راستوں سے گزر سکو گے؟''

''میں کوشش کروں گا.....''

''اور اس وقت جب تم اس کام کو سرانجام دے لو گے تو تمہیں بہت سی ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا جن سے شاید تم اکتا جاؤ۔''

''میں کوشش کروں گا کہ نہ اکتاؤں.....''

''ہوں..... تو اب ایسا کرو کہ ایک پتہ ذہن میں رکھ لو۔ کل تمہیں اس جگہ جانا ہے وہاں تمہیں جو کوئی بھی ملے گا اور تم سے جو کچھ کہے گا تمہیں اس کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔''

''آپ مجھے پتہ بتادیجئے.....'' میں نے کہا۔

''اور سنو تم جس عورت کے ساتھ آئے تھے وہ اچھی ہے، میری تابعدار ہے لیکن اب میرا اور تمہارا براہ راست واسطہ ہے یہاں جو کچھ ہو یا تمہیں جو کچھ کرنا پڑے اس کا کسی سے تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وقت لگتا ہے ہر کام میں اور تمہیں بھی اس کام میں وقت لگے گا۔''

''میں جانتا ہوں.....''

''بس تو پھر ٹھیک ہے میں تمہیں پتہ بتائے دے رہا ہوں.....'' اس نے مجھے جو پتہ بتایا وہ میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا اور بالآخر اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر دوسرے دن منصوبے کے مطابق میں چل پڑا اس علاقے میں، میں شاید پہلی بار آیا تھا۔ شہر سے دور دراز کا علاقہ تھا کچھ تھوڑی سی الگ ہٹ کر آبادی تھی جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مکانات بنے ہوئے تھے۔ زیادہ تر مکانات ٹوٹے پھوٹے تھے کوئی ایک آدھ مکان ثابت ایک یا دو منزلہ نظر آجاتا تھا، گلیاں گندی تھیں اور یہاں کتوں کی تعداد بھی کافی تھی۔

بہر حال جس گھر کا مجھے پتہ بتایا گیا تھا وہ اس آبادی کے آخری سرے پر تھا میں بالآخر تیز قدموں سے چلتا ہوا اس مکان کے سامنے پہنچ گیا نہ جانے اندر سے کیسی آواز اٹھ رہی تھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں واپس لوٹ جاؤں اور اس خیال کو دل سے نکال دوں لیکن نہ جانے کون سے جذبے کے تحت میرے قدم رک گئے، دیکھنا تو چاہئے کہ بابا سفیدے کے کہے ہوئے اس مکان میں کیا چیز ہے۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر زور سے دستک دی اور انتظار کرنے لگا، تھوڑی ہی دیر کے بعد قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ سنائی دی۔ جو دروازے کے قریب آرہی تھی، میرا دل دھڑکنے لگا پھر دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد اس کے دونوں پٹ کھل گئے، میرے سامنے دبلی پتلے بدن کا ایک بھدی سی شکل کا بوڑھا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر پیلے رنگ کا لباس تھا جو گردن سے لے کر ٹخنوں تک ایک ہی رنگ کا تھا، وہ کچھ عجیب سی شکل کا مالک تھا، گول مول آنکھیں، ناک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی اور ہونٹ بھی عجیب سے بدنما ایک ہونٹ نیچے لٹکا ہوا تھا جس سے اس کے نچلے دانت نظر آرہے تھے۔ نہ جانے کیوں میرا دل پر دہشت کا ایک تاثر قائم ہوگیا۔ بہر حال وہ آہستہ سے بولا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تمہیں بابا سفیدے نے بھیجا ہے، کیا میرا خیال غلط ہے؟"

"نہیں....." میں نے گردن ہلائی۔

"آؤ اندر آجاؤ....." اس نے کہا اور میرے دروازے کے دوسری طرف جانے کے بعد دروازے کی کنڈے واپس لگا دی، پھر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ مکان باہر سے بالکل بوسیدہ اور بد شکل نظر آتا تھا اندر سے ایسا نہیں تھا بلکہ خاصا وسیع تھا، بوڑھا مجھے اندرونی کمرے میں لے گیا اور پھر اس کے آخری سرے پر بنی ہوئی چھ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ایک تہہ خانے میں۔ تہہ خانہ بہت عجیب سا تھا، چھتوں سے جالے لٹکے ہوئے تھے۔ پرانا فرنیچر پڑا ہوا تھا جن میں سے بعض کرسیاں ایسی تھیں جن کے نیچے اینٹیں لگا کر ان کے پایوں کی کمی پوری کی گئی تھی۔ وہ مجھے ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے سامنے بیٹھ گیا یہاں اچھی خاصی تاریکی پھیلی ہوئی تھی جبکہ باہر کا ماحول روشن تھا لیکن تہہ خانہ ہونے کی وجہ سے اس میں تاریکی تھی کوئی ایسا روشن دان وغیرہ بھی نہیں تھا جس سے روشنی اندر آئے، میں اس وقت بوڑھے کے خدوخال بھی نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور اس نے ایک طرف رکھے ہوئے مٹی کے تیل کے لیمپ کو جلا دیا جس سے کمرے میں زرد روشنی پھیل گئی اس زرد روشنی میں مجھے اس کا چہرہ بے حد بھیانک نظر آرہا تھا پھر اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں میرے ساتھ کچھ وقت قیام کرنا ہوگا....."

"کتنے وقت؟" میں نے سوال کیا۔

"اس کا کوئی تعین نہیں کیا جاسکتا، بس یوں سمجھ لو جب تک مجھے تمہاری ضرورت پیش آئے..... اور اس نے مجھے یہی بتایا تھا۔"

"کس نے؟"

"جس کے پاس سے تم یہاں آئے ہو....."

میں خاموش ہوگیا کچھ لمحے سوچنے کے بعد میں نے کہا۔

"تو پھر مجھے میرے قیام کے لئے جگہ بتادو۔"

"یہ جگہ سب سے بہتر ہے ویسے سیڑھیاں عبور کرنے کے بعد تم باہر بھی آسکتے ہوں۔ یہاں تم پر کوئی پابندی ہے نہ قید، سمجھ رہے ہو نا؟"

"ہاں....." میں نے آہستہ سے کہا، وہ تھوڑی دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا اور اس کے بعد کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"تو اب تم اس جگہ کے مکین ہو....." یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر نکل گیا، ایک عجیب سا احساس میرے دل میں جاگزیں تھا اندر کشمکش ہو رہی تھی، جو کچھ میں کر رہا ہوں یا چچی جان نے جو کچھ کرنے کے لئے کہا ہے، کیا موزوں رہے گا، کیا یہ انوکھی زندگی مجھے راس آسکتی ہے، کیا یہ سب کچھ جو میرے اپنے ذہن میں بالکل نہیں تھا ممکن ہو سکتا ہے؟ یہ تمام تصورات اور خیالات میرے دل و دماغ کو الجھا رہے تھے، لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں نے وہ سب کچھ تسلیم کر لیا تھا جو اس نے کہا تھا، چنانچہ اب کوئی انحراف ممکن نہیں تھا اور وہ بھی ان پراسرار لوگوں سے، جن کی حقیقت سے میں واقف تھا، چنانچہ اب حالات کچھ بھی ہوں، مجھے وہی کرنا تھا جو میری تقدیر

کا ایک حصہ بن چکا تھا، اس ویران اور بوسیدہ قید خانے میں زندگی بڑی عجیب وغریب تھی، اپنی اس رہائش گاہ کو میں نے بغور دیکھا تو میرے دل میں خوف کا ایک احساس جاگ اٹھا۔

''کتنی بھیانک جگہ ہے، ہر شے سے نحوست ٹپکتی ہے، بابا سفیدے نے نہ جانے مجھے اس شخص کے پاس کیوں بھیج دیا ہے، ویسے اب میں ناسمجھ نہیں رہا تھا، اتنی عمر ہوگئی تھی کہ نیک و بد کی تمیز کرسکوں..... بابا سفیدے مسلمان تھا اور یہ شخص جس نے مجھے نہ تو اپنا نام بتایا تھا اور نہ ہی اپنے بارے میں کچھ اور..... ہندو معلوم ہوتا تھا۔ کم از کم اس کی زبان اور حلیے سے مجھے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ نہ جانے بابا سفیدے کا اس سے کیا گٹھ جوڑ ہے۔ لیکن اب یہ تمام باتیں فضول تھیں، بعض اوقات میں سوچنے لگتا کہ چچی جان نے مجھے واقعی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ پورا گھرانہ ہی منحوسوں کا گھرانہ تھا۔

فیض خان اچھی خاصی ملازمت کرتا تھا۔ ایمانداری سے کام کرتا تو تین افراد کا گھرانہ تھا۔ اسے زندگی گزارنے میں کیا دقت پیش آتی، لیکن وہ سونا بنانے کے چکر میں اپنی زندگی کھو بیٹھا تھا، ریاض خان آوارہ شخص تھا اور نہ جانے کہاں کہاں گھومتا پھرتا تھا اور وہ محترمہ چچی جان بھی چکروں میں پڑی ہوئی تھیں..... آخر وہ اس عمر میں اپنے لئے کیا حاصل کرنا چاہتی تھیں..... اور پھر وہ بابا سفیدے..... مجھے سارے کا سارا ایک جال محسوس ہو رہا تھا جو میرے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ساری کڑیاں ایک زنجیر کی کریاں ہی معلوم ہوتی تھیں..... لیکن میں بھی اب تن بہ تقدیر ہوگیا تھا، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

میں اس قید خانے میں رہنے لگا۔ ہاں میں اسے قید خانہ ہی کہہ سکتا ہوں حالانکہ بوڑھا مجھے کہہ کر گیا تھا کہ میرے اوپر کوئی پابندی نہیں ہے..... لیکن کچھ ایسی بے زاری مجھ پر سوار تھی کہ میں خود بھی یہاں سے نکل کر کہیں جانا نہیں چاہتا تھا۔

کیا فائدہ کون ہے میرا..... کہاں جاؤں، کیا واپس چچی جان کے پاس جاؤں تو یہ بھی حماقت کی بات ہے، کیونکہ وہ خود ہی مجھے ان لوگوں کے سپرد کرگئی تھیں۔

چار دن چار راتیں اسی تنہائی میں گزار چکا تھا، اس دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی سوائے اس کے کہ بوڑھا آتا تھا اور مجھے کھانے پینے کی چیزیں دے جاتا تھا، ترکاری پوریاں اور ایسی ہی چیزیں ہوا کرتی تھیں جو بہر حال پیٹ بھر دیا کرتی تھیں..... پانچویں دن دوپہر کے وقت جب میرے اندازے کے مطابق دن کا ڈیڑھ بجا ہوگا، بوڑھا میرے پاس آیا اور مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے دیکھنے کا انداز بے حد عجیب تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''کیا نام ہے رے تیرا؟''

''نادر۔''

''ناموں کی پرواہ کرتا ہے؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

''نام کوئی اہمیت رکھتے ہیں؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''نام ایک دوسرے کو پکارنے کے لئے ہوا کرتے ہیں ایک دوسرے کی شناخت ہوتے ہیں۔''

''ہوں، ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''اگر میں تیرا نام رام رکھ دوں تو.....!''

''نہیں یہ ہندوانہ نام ہے۔''

''کیا ہندو کیا مسلمان یہ سب بے کار کی باتیں ہیں نادر!'' وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا میں اسے دیکھنے لگا۔

''کیا کہتا ہے تو؟''

''کس سلسلے میں؟''

''میں نے جو کہا ہے۔''

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔ بہر حال انسان کی شناخت تو ہوتی ہے۔''

''ہوں اچھا تو یہ بتا تیرے پتا کا کیا نام تھا؟''

''بس ایک نام تھا ان کا، لیکن وہ مٹ گیا۔''

''مسلمان تھا؟''

''ظاہر ہے۔''

''کیا وہ اپنے دھرم کی ساری باتیں پوری کرتا تھا؟''

''کیا مطلب؟''

''دیکھ جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں، اس کا کوئی خاص مطلب نہیں ہے بس سوال ہے جس کا تجھے جواب دینا چاہئے، کیونکہ بہر حال میں تیرا گرو ہوں۔''

''میں نہیں جانتا کیونکہ وہ بہت جلد مر گیا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر میری ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔''

اس بات پر بوڑھا خوب ہنسا تھا پھر بولا۔

''کیا سمجھتا ہے تو..... ارے پاپی اس سنسار میں سب اپنے لئے جیتے ہیں۔ تیری ماں نے دوسری شادی کر لی نا!''

''ہاں!''

''کیوں؟''

''وہ تمہارا رہنا چاہتی تھی۔''

''یہی ہوانا..... یہی میں کہہ رہا ہوں تجھ سے۔''

''بہر حال یہ اس کا کام تھا۔''

''اور تو..... اس کے بعد تو نے کیا کیا؟''

''کچھ نہیں.....''

''کچھ تو کیا ہوگا.....!''

''بس سوتیلے باپ کے ڈنڈے کھائے اور اس کے بعد گھر سے بھاگ آیا۔'' جواب میں بوڑھا خوب ہنسا تھا۔

''کیوں بھاگ آیا؟''

''اس لئے کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ تھا۔ وہ لوگ مجھے مار مار کر ہلاک کر دیتے۔''

''تو تو نے اپنے بارے میں سوچا!''

''تو کیا میں نہ سوچتا!''

''ضرور سوچنا چاہئے تھا۔ اچھا خیر ٹھیک ہے، اس کے بعد کیا ہوا؟''

''بس اس کے بعد کچھ نہیں ہوا میں اب تک بھٹکتا پھر رہا ہوں۔''

''دین دھرم کا کوئی کام کیا تو نے؟''

''نہیں۔''

''یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ منش سب سے پہلے اپنی ذات کے بارے میں سوچتا ہے پھر اپنے دین دھرم کے بارے میں..... نادر کا نام اگر رام ہو جائے تو کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے۔ مگر چھوڑو۔ میں کونسا دھرم سیوک ہوں کہ تجھے دھرم داس بناؤں، جو تیری مرضی آئے اپنا نام رکھ۔ ویسے میرا نام رادھن لال ہے۔''

''جی.....'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''کیا کہے گا تو مجھے۔''

''رادھن لال!''

''بس.....؟''

''اور کیا کہوں؟''

''گرو رادھن لال۔ گرو جانتا ہے کسے کہتے ہیں؟''

''ہاں.....!''

''کسے کہتے ہیں؟''

''استاد کو۔''

''ہاں وہ جو کچھ سکھاتا ہے۔''

''بے شک۔''

''تو بابا سفیدے نے تجھے میرے پاس جو بھیجا ہے وہ اسی لئے بھیجا ہے کہ میں تجھے کچھ سکھاؤں۔''

''بابا سفیدے نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''تو پھر بابا سفیدے کے پاس کیوں گیا تھا؟''

''اس سے کچھ سیکھنے.....''

''ٹھیک، ٹھیک، ٹھیک..... کیا تجھے اس بات کا علم ہے کہ وہ جو تیرا بابا سفیدے ہے نا اس کا بھی کوئی دھرم نہیں ہے.....''

''کیا مطلب؟''

''پھر وہی بات..... میں کہہ رہا ہوں نا کہ اس کا بھی کوئی دھرم نہیں ہے۔''

''لیکن وہ تو مسلمان ہے لوگ اس کے پاس

بڑی عقیدت سے آتے ہیں۔'' میں نے کہا اور بوڑھا پھر ہنسنے لگا۔

''ہاں اس لئے آتے ہیں کہ وہ دوسروں کے کام کر دیتا ہے۔ مگر دھرم کے ذریعے نہیں۔''

''تو پھر؟''

''وہ بھی میرا چیلا ہے!''

''تمہارا؟''

''ہاں.....!''

''گویا اس نے.....''

''ہاں اس نے جو کچھ سیکھا ہے مجھ سے ہی سیکھا ہے۔ مگر چونکہ اس نے اپنا نام بابا سفیدے رکھا ہوا ہے، اس لئے وہ اس نام سے کام کرتا ہے۔ میں رادھن لال ہوں سو رادھن لال کے نام سے کام کرتا ہوں، تجھے رام بنا دوں تو تو رام کہلائے گا۔ نادر بننا چاہتا ہے تو نادر بن کر رہ۔ کام جو کرنا ہے اس کا معاملہ الگ ہی ہوتا ہے۔''

میں اس کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''خیر یہ ساری باتیں تو ایک طرح سے بے کار ہیں، یہ بتا من سے اپنا گرو مانتا ہے مجھے؟

''اب تو ماننا ہی پڑے گا.....!''

''کیا مطلب، مجبوری ہے کوئی؟''

''نہیں.....!''

''تو پھر.....؟''

''میں آیا ہی اس لئے ہوں.....!''

''دیکھ لڑکے میں کبھی کسی کو اپنا چیلا نہیں بناتا۔ ورنہ اگر میں چیلا بنانے پر تل جاؤں تو یہاں اتنا مجمع جمع ہو جائے کہ دوسرے آدمی کے بیٹھنے کی جگہ نہ رہے، کیا سمجھتا ہے تو رادھن لال کو.....''

''نہیں گرو جی، آپ یقیناً مہان ہوں گے۔''

میرے ان الفاظ پر اسے جیسے خوشی ہوئی اس نے کہا۔

''مگر میں نے تیرے اندر بھی کچھ دیکھا ہے۔ یہ دیکھا ہے میں نے تیرے اندر کہ اگر میں تجھے کچھ سکھاؤں تو.....تو سیکھ جائے گا!''

''یہ تو آپ نے بہت اچھی بات بتائی ہے مجھے.....!''

''مگر ایک بات اور سیکھ لے۔ جسے من سے گرو مان لیا جاتا ہے اس کی کسی بات میں دخل نہیں دیا جاتا اور اس کی ہر بات کی آنکھیں بند کر کے تعمیل کرنا ہوتی ہے۔''

''یہ تو میں جانتا ہوں.....ظاہر ہے آپ مجھے اپنا علم سکھائیں گے تو مجھے آپ کی عزت تو کرنا ہوگی۔''

''جو کچھ میں کہوں گا کرے گا؟''

''ضرور کروں گا.....!''

''وچن دے۔''

''جی وعدہ کرتا ہوں۔''

''نہیں مجھے وچن دے۔'' بوڑھے نے اپنا ہاتھ سامنے پھیلا دیا۔

''میں کیا کروں؟'' میں نے سوال کیا۔

''اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دے۔'' اس نے کہا اور میں نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنے بدن میں ایک عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ویسے بھی بوڑھے کا ہاتھ کوئی انسانی ہاتھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ پتھر کی طرح سخت اور برف کی طرح ٹھنڈا.....وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گردن ہلا کر مطمئن انداز میں کہا۔

''بہت بڑا دل ہے تیرا۔ بہادر ہے دلیر ہے۔ اچھا خیر اب سن میری بات۔''

''جی گرو مہاراج.....!''

''میں تجھے ایک جاپ بتا رہا ہوں، تجھے سات دن یہ جاپ کرنا ہوگا اس سے جانتا ہے کیا ہوگا؟''

''میں نہیں جانتا.....''

''من صاف ہوگا تیرا۔ تیرے من سے یہ ساری فضول باتیں نکل جائیں گی کہ دین کیا ہے، دھرم کیا ہے، انسانیت کیا ہے، شرافت کیا ہے، جب تو اندر سے صاف ستھرا ہو جائے گا تب میں تجھے دوسرا جاپ بتاؤں گا۔ اور

تو ایک بات سن لے اگر یہ دوسرا جاپ تو نے مکمل کرلیا تو پھر تو اتنی بڑی قوت کا مالک بن جائے گا کہ بعد میں ہماری طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گا۔"

"نہیں مہاراج، میں ایسا نہیں ہوں۔"

"تجھے جو کچھ بھی کرنا ہوگا، ہمارے حکم کے مطابق کرنا ہوگا۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔"

"یہ نہیں سوچے گا کہ ایسا کرنے سے تجھے فائدہ ہو رہا ہے یا نقصان، یہ بہت بڑا کام ہوتا ہے، بہت بڑی تپسیا ہوتی ہے، جو تجھے کرنی ہے۔"

"آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر سن۔" بوڑھے نے کہا۔ اور اس کے بعد اس نے مجھے کسی عجیب و غریب زبان کے کچھ لفظ بتائے اور بار بار انہیں دہرانے لگا۔ میں یہ الفاظ سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"اب ایسا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جا۔" میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دوزانو بیٹھ کر اسے دیکھا تو وہ بولا۔

"جو الفاظ میں نے کہے ہیں انہیں دہرا.....!"

وہ ایک ایک لفظ مجھے بتانے لگا۔ اور جب میں نے پہلی بار یہ الفاظ اپنے منہ سے نکالے تو مجھے اپنے اندر ایک گڑگڑاہٹ سی محسوس ہوئی، میرا دل سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا..... نہ جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کوئی اندر سے مجھے کہہ رہا ہو کہ یہ الفاظ اپنی زبان سے ادا نہ کروں۔ لیکن میں نے اس کی آواز پر کان نہ دھرے اور ایک ایک لفظ دہرا کر پوری لائن دہرا دی۔ بوڑھے نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔

"میرے ساتھ تین دفعہ یہ الفاظ دہرا اور میں بوڑھے کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ دہرانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے اندر سکون پھیل گیا اب وہ کیفیت نہیں رہی تھی، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے، لیکن جب تین دفعہ میں نے ان الفاظ کو دہرایا تو رادھن لال نے گردن ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب سات دن تجھے اس کا جاپ کرنا ہے۔ لیکن یہاں نہیں۔"

"پھر کہاں....."

"اس عمارت کے پیچھے ایک چھوٹی سی پوکھر ہے۔ اس تالاب کے کنارے بیٹھ کر تجھے یہ جاپ کرنا ہے اور شام کو جب سورج چھپ جائے تو اس وقت سے لے کر جب تک چاند نہ نکلے اس وقت تک تجھے یہ جاپ کرنا ہوگا اس کے بعد واپس آ جان اور آرام سے سو جانا۔ بہت مشکل کام نہیں ہے۔ پر ایک بات تجھے بتائے دیتا ہوں۔"

"کیا گرو مہاراج.....!"

"ہمت سے کام لینا ہوگا....."

"میں نہیں سمجھا۔"

"تجھے بہت سی چیزیں ڈرائیں گی..... اگر کہیں ڈر گیا تو سمجھ لے مر گیا....."

"مطلب!"

"مطلب صاف ہے پھر وہی مطلب مطلب میرے سامنے کرتا ہے، مجھے یہ الفاظ اچھا نہیں لگتا۔ ایک بار جو بات زبان کی ادا کی جائے اس کو سننا ہے سمجھنا ہے اور اس کے بعد اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرنا ہے۔"

"جی گرو مہاراج۔"

"تو جاپ یاد ہے....."

"جی گرو مہاراج۔"

"تو دہرا میرے سامنے....."

اب میں نے نہایت صفائی سے وہ لائن وہ الفاظ دہرائے۔ پھر اس نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، اب آ میرے ساتھ میں تجھے وہ جگہ دکھا دوں جہاں تجھے جاپ کرنا ہے۔"

میں نے خاموشی سے گردن ہلا دی اور اٹھ کر بوڑھے کے ساتھ باہر نکل آیا۔

(جاری ہے)

بھیانک مخلوق

صبا شاہ بخاری- جڑانوالہ

اچانک رات کے اندھیرے میں ایک ایسی کرخت آواز گونجی کہ قبلے والے تھرا کر رہ گئے، اور زیادہ تر لوگوں پر کپکپی طاری ہوگئی کہ اتنے میں.....

دل و دماغ پر.....سکتہ کرتی اور لرزہ براندام کرتی ہولناک.....خونی.....کہانی

میں اور میرا کزن سمندر کے کنارے چل رہے تھے کہ اچانک سے میرا پاؤں پھسلا اور میں پانی میں گر گئی، ساتھ ہی آفتاب نے مجھے بچانے کے لئے پانی میں چھلانگ لگادی اور ہم پانی کی تہہ میں گرتے چلے گئے۔ پانی میں طرح طرح کی مچھلیاں تھیں۔ پانی کی تہہ میں جاتے ہوئے آفتاب بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں آفتاب کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ پانی میں میرا بھی سانس لینا محال ہوگیا تھا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری۔

اچانک سے میرے پاس رنگ برنگے چھوٹے چھوٹے بال کی طرح کیڑے رینگتے ہوئے آئے او رکہا۔ ''اے لڑکی کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہی ہو اور یہ لڑکا کون ہے؟

میں نے کہا میرا نام ثنا ہے اور یہ میرا کزن آفتاب ہے اور ہم دونوں سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ میرا پاؤں پھسل گیا اور میں سمندر میں گر گئی۔

پھر میں نے ایک بال کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن بے سود بال ہاتھ لگانے سے ہی پھٹ گیا۔ پھر ایک کیڑا بولا۔ ثنا بہن جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ ورنہ تم ماری جاؤ گی۔''

میں نے کہا۔ ''کیا مطلب؟''

پھر انہوں نے کہا۔ ''پراتنی بھیانک مخلوق رہتی ہے، سراس کا انسان جیسا اور دھڑ اس کا سمندری گھوڑے جیسا کانٹے دار اگر اس کو پتہ چل گیا کہ اس کی دنیا میں انسان آتے ہیں وہ تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا اور ہم سب پر بھی مصیبت ٹوٹ پڑے گی تم یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جاؤ، ثنا بہن جاؤ یہاں سے۔''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے، میں اپنے دوست کو لے کر جاتی ہوں۔''

میں آفتاب کو لے کر پانی کے اوپر آ گئی۔ اتنے میں میرے گھر والے اور میری جان سے پیاری دوست اقصیٰ اور اس کے گھر والے بھی آ گئے۔ ابھی میں سب سے مل ہی رہی تھی کہ اچانک سے آفتاب نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تو ہم نے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود ہم ناکام رہے، میرا رو رو کے برا حال ہوگیا تھا۔

میری امی نے کہا۔ ''ثنا چلو گھر چلتے ہیں۔''

تو میں نے کہا۔ ''نہیں امی میں نہیں جاؤں گی۔''

میری امی نہیں مانیں تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی

گھر جانے کو تیار ہوگئی۔ کافی دور چلنے کے بعد میری نظر ایک نالے پر پڑی، وہاں پر کوئی تھا۔ میں نے اقصیٰ سے کہا۔ ''وہاں دیکھو وہاں پر کوئی آدمی ہے چلو چل کر اس آدمی کو بچاتے ہیں۔''

ہم سب نے مل کر اس آدمی کو پلٹا تو دیکھا کہ اس کے منہ پر بہت سا کیچڑ جما ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے کچھ بھی پتہ نہیں چل پا رہا تھا کہ یہ کون ہے۔ اقصیٰ نے مجھے پانی کی بوتل دی اور کہا۔ ''اس کے منہ پہ چھینٹے مارو۔''

میں نے جونہی اس کے منہ پہ چھینٹے مارے تو میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی سب لوگ بہت حیران تھے۔

کیونکہ وہ کوئی اور آدمی نہیں بلکہ میرا کزن آفتاب تھا۔

لیکن یہ کیا اس کا یہ حال کیسے ہوگیا اس کے بال شانوں تک بڑھ چکے تھے رنگ پیلا زرد ہوگیا تھا آنکھیں اس کی انگارے برسا رہی تھیں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر یہ کیوں کر ایسا ہوگیا تھا مجھے تو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی آفتاب ہے۔ میں نے آفتاب کو شانوں سے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔ ''آفتاب ہوش میں آؤ۔''

اچانک سے آفتاب نے میرا گلا پکڑ کر زور سے دبانے لگا۔ میری سانس رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی، سب گھر والوں نے مل کر آفتاب کو پکڑا اور کہا کہ ''اسے چھوڑ دو اور ہوش میں آؤ کیا کر رہے ہو تم، اپنی ہونے والی بیوی کو مار ڈالو گے کیا۔''

اتنے میں آفتاب کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنا گلہ پکڑتے ہوئے کھانسنا شروع کر دیا، اتنے میں آفتاب پھر سے بے ہوش ہو چکا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگیا۔

کچھ دیر بعد ایک غیبی آواز آئی۔

''یہ سب مایا جال ہے جو ہم دیکھتے ہیں وہ ہوتا نہیں اور جو ہم نہیں دیکھتے وہ ہو جاتا ہے۔'' پھر آواز آنا بند ہوگئی۔

آواز میرے اور اقصیٰ کے علاوہ کسی کو سنائی نہ دی۔ اقصیٰ میری طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ ''ثنا یہ کیسا مایا جال ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

اقصیٰ نے کہا۔ ''ثنا اپنے علم سے جاننے کی کوشش کرو یہ آواز کس کی تھی اور یہ کیا چکر ہے۔''

میں نے کہا اقصیٰ میں اتنا علم نہیں جانتی مجھے تو داداجان نے بس تھوڑا بہت ہی جادو سکھایا ہے۔'' اور ہم

سب چل دیئے جب ہم بہت آگے نکل چکے تو پتہ چلا کہ ہم راستہ بھول چکے ہیں چاروں طرف جنگل ہی جنگل تھا، دور سے ہمیں کچھ چمکتا ہوا نظر آیا، پاس آنے پر پتہ چلا یہ تو بہت ہی خوبصورت محل ہے اور اس کے میناروں پر سورج کی کرنیں پڑنے سے چمک پیدا ہو رہی تھی۔ داخلی دروازے کے دونوں طرف پہرے دار کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں بڑی بڑی بندوقیں تھیں اور وہ ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے گارڈز ہم کو گھیر چکے تھے اور ہمیں لئے محل کے اندر داخل ہوئے۔ جسے دیکھ کر میں ٹھٹک گئی تو اتنے بڑے جنگل میں اتنا پیارا محل بھی ہو سکتا ہے۔

اور جونہی میری نظر سامنے کی طرف اٹھی تو دیکھا کہ ایک شخص کرسی پر ہماری طرف پشت کئے بیٹھا تھا۔

وہ جیسے ہی پلٹا تو ہمارے اوپر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کیونکہ وہ آفتاب ہی تھا۔ پہلے سے خاصا وہ بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ وائٹ ڈریس میں کسی ملک کا شہزادہ لگ رہا تھا اور اس کے بال بھی پہلے کی نسبت چھوٹے چھوٹے تھے میرا دل چاہا کہ میں اس کے گلے لگ جاؤں۔

میری سوچ دھری کی دھری رہ گئی۔ جب اس کے لب ہلے تو اس نے اپنے گارڈز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پکڑلو اس لڑکی کو پہلے بھی میرے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔''

اقصیٰ نے کہا۔ ''ثنا جلدی سے کچھ کرو ورنہ ہم سب مارے جائیں گے۔ گارڈز ہماری طرف بڑھنے لگے تو میں نے دادا جان کے بتائے ہوئے اسم اعظم کا ورد کرنا شروع کر دیا، جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے پاؤں کے پاس جادوئی قالین تھا اور ایک اقصیٰ کے پاؤں کے پاس تھا، میں نے کہا۔ ''اقصیٰ جلدی سے قالین پر سوار ہو جاؤ۔'' اور قالین اڑتا ہوا ہمیں محل کے باہر جنگل سے اُڑتا اُڑتا سڑک پر لے گیا۔

لیکن یہ کیا قالین آسمان کی طرف اڑنے کے بجائے زمین کی طرف جا رہا تھا۔ اقصیٰ نے کہا۔ ''ثناء یہ کیا ہو رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پتہ نہیں میرا جادو کیوں نہیں کام کر رہا۔'' اتنے میں گارڈز نے ہمارے قالین کو پکڑ لیا اور ہم نیچے گرنے لگے۔ پھر میں نے دوبارہ سے ورد کرنا شروع کر دیا تو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ قالین ہوا میں اُڑنے لگا اور ہم اب اس محل سے بہت دور نکل چکے تھے، اتنے میں اقصیٰ نے کہا۔ ''ثنا تم کو وہ آواز یاد ہے جو ہم دیکھتے ہیں وہ نہیں ہوتا اور جو ہم نہیں دیکھتے وہ ہوتا ہے۔''

''اور ہاں اقصیٰ میں تو اس کے بارے میں بھول ہی گئی تھی اس بات کا جواب تو دادا جان ہی دے سکتے ہیں۔''

اتنے میں ہم بس اسٹاپ پر آ گئے تھے اور ہم سب بس پر سوار ہو گئے۔ سب اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان تھے، باتوں ہی باتوں میں اقصیٰ کو پیاس کی شدت محسوس ہوئی اس نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے بہت پیاس لگی ہے۔''

اتنے میں دو آدمی پانی کی بوتل لئے ہماری طرف آ رہے تھے، پانی کو دیکھ کر اقصیٰ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

میری نظر ان آدمیوں پر تھی، مجھے وہ آدمی کچھ عجیب سے لگے۔ ایک آدمی نے پانی کی بوتل اقصیٰ کی طرف بڑھائی، اور وہ دونوں پانی پلانے والے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں، پھر میں نے اقصیٰ کو اشارہ کیا کہ پانی نہ پینا لیکن میرے منع کرنے کے باوجود بھی اقصیٰ نے پانی پی لیا۔

پھر میں نے سب کو اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے قالین سیٹوں پہ بچھا دیئے اور پھر جیسے ہی ہم سب قالین پر بیٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے قالین سمیت سب لوگ کنول کا پھول بن کر بس کی کھڑکی سے نیچے کی طرف نالے میں بہہ گئے اور میں بھاگ کر گاڑی سے نیچے اتری اور ایک پھول کو پکڑنے کی کوشش کرنے

لگی لیکن پھول میرے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

میں بہت روئی چلائی لیکن کیا کرسکتی تھی میری آنکھوں کے سامنے آفتاب کا یہ حال ہوگیا اور اب میری جان سے زیادہ عزیز دوست اقصیٰ کا یعنی میں ان دونوں کو بچا نہ سکی۔

''میں ان سب سے بدلہ لے کر رہوں گی جنہوں نے مجھے بہت رلایا ہے اب ان کے رونے کی باری ہے۔''

میں نے اپنے آنسو صاف کئے اور گھر کی طرف چلی گئی۔ مجھے دیکھ کر دادا جان بولے۔ ''ثنا بیٹا کیا ہوا تم نے اپنا حال کیا بنا رکھا ہے میری پھول جیسی بیٹی اتنی مرجھائی ہوئی کیوں ہے۔ تم اکیلی آئی ہو۔ باقی سب کہاں ہیں؟

میں دادا جان کے گلے لگ کر بہت روئی اور جب رو رو کر میرے دل کا غبار نکل گیا تو میں نے دادا جان کو شروع سے آخر تک بتا دیا تو دادا جان بولے۔ ''ان سب کو صحیح سلامت واپس لانے میں، میں تمہاری مدد کروں گا۔''

تو میں نے کہا۔ ''دادا جان جیسے کہ میں نے آپ کو بتایا۔ ''جو جیسا دیکھتا ہے ویسا ہوتا نہیں جو نہیں دیکھتا وہ ہوتا ہے۔'' اس کا کیا مطلب ہے؟

تو دادا جان نے کہا۔ ''بیٹا یہ سب سمندری گھوڑے کا کیا دھرا ہے وہ ماورائی دنیا اس کی اپنی دنیا ہے اس نے اصل آفتاب کو قید کر رکھا ہے اور اس نے آفتاب جیسے دو ہم شکل بنائے ہیں ایک کو تم نے نالے میں دیکھا اور دوسرا کنول میں۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ تم نے نقل کو دیکھا جو وہ تھا نہیں اور جو اصل آفتاب ہے اس کو دیکھا نہیں اب سمجھ میں آئی۔''

''جی دادا جان آ گئی سمجھ اب میں اس سمندری گھوڑے سے آفتاب کو کیسے بچا کے لاؤں۔''

میری بات سن کر دادا جان بولے۔ ''ثنا بیٹی تم پریشان نہ ہو میں ہوں ناں، میں تم کو کچھ جادوئی چیزیں دیتا ہوں اس سے تم ہر مشکل کا خاتمہ با آسانی کرسکتی ہو۔'' پھر دادا جان نے اپنی آنکھیں بند کیں اور منہ میں کچھ پڑھنے لگے پڑھنے کی دیر تھی کہ ان کے ہاتھوں میں ایک تلوار اور ایک چھڑی تھی، پھر دادا جان نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بولے۔ ''لو بیٹا اس چھڑی سے جس چیز کو چھوؤں گی وہ چیز برف بن جائے گی پھر تم کو کوئی چیز بھی نقصان نہیں پہنچا پائے گی اور یہ تلوار صرف اور تم صرف سمندری گھوڑے پر ہی چلا سکتی ہو اور کسی چیز پر نہیں، اگر تم بھول کر بھی کسی چیز پر وار کرو گی تو الٹا تم خود برف کی بن جاؤ گی پھر کوئی بھی تمہاری مدد نہیں کر پائے گا اس بات کا خاص خیال رکھنا اچھا اب تم جاؤ ان سب باتوں کو اپنے ذہن میں اتار لو۔''

''جی دادا جان مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے، اچھا دادا جان اب مجھے اجازت دیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹی خدا تم کو اپنے حفظ ایمان میں رکھے جیت کر ہی لوٹنا۔ خدا حافظ۔'' پھر میں نے دادا جان کا ہاتھ چوما اور اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگی۔

☆.....☆.....☆

ابھی میں سمندر کے کنارے پر ہی کھڑی تھی کہ مجھے ایسا لگا کہ شاید کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے، میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی بھی نہیں تھا، میں نے اپنا وہم سمجھا اور دل ہی دل میں اللہ کو یاد کیا اور بسم اللہ پڑھ کر میں پانی میں کود گئی۔ پانی میں، میں سانس با آسانی لے سکتی تھی۔ کیونکہ دادا جان نے مجھے ایک موتی بھی دیا تھا منہ میں رکھنے کے لئے۔ اب پانی میں تیرتے تیرتے بہت آگے نکل آئی تھی۔ پانی میں بہت سی مچھلیاں میرے استقبال کے لئے ادھر ادھر منڈلا رہی تھیں کہ اچانک ایک مچھلی بولی۔ ''ثنا بہن تم کدھر جا رہی ہو اور تمہارا ساتھی کہاں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں اپنے ساتھی کو تو لینے آئی ہوں۔ وہ سمندری گھوڑے کی قید میں ہے۔''

قریب ہی بے شمار کیکڑے بھی تھے، ان میں سے ایک بولا۔ ''لو بھلا بات کرلو۔ یہ لڑکی تو ایسے کہہ رہی ہے کہ یہ دیس اس کے ماموں کا دیس ہے۔ ارے بہن

کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑی ہو تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''ہاں میں جانتی ہوں میں اپنی موت کو دعوت دے رہی ہوں لیکن مجھے اپنی جان کی کوئی پروا نہیں ہے میری دوست اقصیٰ اور آفتاب اس سمندری گھوڑے کے قبضے میں ہیں۔ آپ سب میرے لئے بس دعا کریں کہ میں ان کو صحیح سلامت لاسکوں۔'' پھر سب نے مجھے دعاؤں کے ساتھ رخصت کردیا۔

راستہ میں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرتے کرتے آخر کار میں سمندری گھوڑے تک پہنچ ہی گئی۔

لیکن یہ کیا، وہ گھوڑا کوئی عام گھوڑا نہیں تھا اتنا خوفناک اور بھیانک کہ اسے دیکھ کر میرا حلق خشک ہونے لگا۔ چیخیں نکلنے والی تھیں، میری جگہ اگر کوئی اور انسان ہوتا تو وہ ڈر کے مارے مر ہی جاتا۔

راستے میں ہر آنے والی مشکلوں کو میں باآسانی جادوئی چھڑی سے برف بناتی آرہی تھی لیکن اس بھیانک مخلوق کا کیسے سامنا کروں۔ میں ایک پتھر کے پیچھے کھڑی دیکھ رہی تھی کہ اچانک سے وہ غرایا۔

''اچھا تو تم آ ہی گئی، آدم زاد دیکھو اب میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہو، تم اپنے ساتھیوں کو چھڑانے آئی ہوں، اب تمہارا بھی وہ حال کروں گا کہ تم موت مانگو گی پر تمہیں موت نہیں آئے گی، بہت برا حشر کروں گا کہ آئندہ کوئی بھی آدم زاد میرے علاقے میں آنے کی ہمت نہیں کرے گا، جو بھی انسان یہاں آیا وہ زندہ لوٹ کر واپس نہیں گیا تم بھی زندہ واپس نہیں جاؤ گی۔'' ہاہاہا۔

اس کا اتنا بھیانک قہقہہ تو لرزا کر ہی رکھ دیا تھا۔

''اب سامنے آجاؤ۔ ورنہ تمہارے دونوں دوستوں کو ماردوں گا۔''

اس کی باتیں سن کر میں ہوش کی دنیا میں واپس آگئی لیکن اب میں نے پکا ارادہ کرلیا کہ کچھ بھی ہو اس مخلوق کو مار کر ہی دم لوں گی۔ چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ پھر میں اس کے سامنے آگئی تو وہ قہقہے پہ قہقہہ لگائے جارہا تھا۔

جیسے ہی میں نے اپنی دائیں طرف دیکھا وہاں پر آفتاب رسیوں میں جکڑا بے ہوش پڑا تھا، اور بائیں طرف ایک کنول کا بڑا سا پھول ایک ٹہنی پر لٹک رہا تھا۔ مجھے ایک پل کے لئے خوشی مل گئی تھی یہ دیکھ کر سمندری گھوڑے نے مجھ پر کئی وار کئے لیکن ہر وار اس کا ناکام ہو رہا تھا۔

یہ دیکھ کر اس کو شدید غصہ آیا۔ ایک بار پھر اس نے حملہ کرنا چاہا اس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔

میں نے ہمت یکجا کی اور آنا فانا دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے جا کر تلوار سے اس کا سر دھڑ سے الگ کردیا تو اس کے جسم کو آگ لگ گئی، آگ لگنے کی دیر تھی کہ آفتاب رسیوں سے آزاد ہوگیا اور اب سارے پھول بھی اپنی اصلی حالت میں آگئے تھے، وہ سب بے ہوش تھے۔

میں ان کو لے کر سمندر کے کنارے پر آگئی اور ان کو ہوش میں لانے کی کوشش کی، سب کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو سب ہوش میں آگئے۔

اقصیٰ نے اٹھ کر مجھ کو گلے سے لگالیا اور میرا شکریہ ادا کیا اور آفتاب نے بھی مجھے گلے سے لگالیا، آفتاب نے کہا۔ ''ثنا آج تم نہ ہوتی تو ہم سب مارے جاتے شاید کبھی، لوٹ کے واپس نہ آتے تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

میں نے کہا۔ اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔ یہ تو میرا فرض تھا۔''

امی جان نے کہا۔ ''چلو سب گھر چلتے ہیں تمہارے دادا جان راہ دیکھ رہے ہوں گے۔'' پھر ہم سب گھر چلے گئے۔ دادا جان نے ہمیں صحیح سلامت واپس لوٹنے کی مبارکباد دی اور میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

آشا

مونا شہزاد۔ کیلگری کینیڈا

مجرم نے نوجوان کو اپنی سرد سیاہ آنکھوں سے گھورا تو نوجوان کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی مجرم اس کی حالت دیکھ کر شیطانی انداز میں ہنس پڑا پھر بولا.....

نوجوان سے پوچھا گیا مرنے سے پہلے تمہاری کوئی آخری خواہش ہے تو بتاؤ، خونی کہانی

آج اماوس کی رات مجرم کی پھانسی کا دن تھا۔ شہر بھر میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ ملک بھر کے اخبارات شہ سرخیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے چالیس سرکردہ اور بااثر ترین افراد جن میں سیاستدان، بیوروکریٹس اور ریاض نگر کو بسانے والے اکابرین شامل تھے ان سب کو ایک ویران حویلی میں منعقد نجی محفل میں بلا کر خنجر گھونپ گھونپ کر ہلاک کر دیا تھا۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ مقتولین میں قاتل کا سگا باپ اور بھائی بھی شامل تھا۔ قاتل نے سب سے برا حال اپنے باپ کی لاش کا کیا تھا۔ رپورٹرز کے مطابق اس نے اپنے باپ کو سب سے آخر میں سب سے اذیت ناک انداز میں قتل کیا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کو دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے کاٹا تھا اور ساتھ ساتھ چبا کر کھاتا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے اس کے کلیجے کو چاک کر کے دانتوں تلے چبایا تھا اور

سب سے آخر میں اس کی آنکھیں نکال کر چبالی تھیں موقع واردات پر پہنچنے والے پولیس افسران اور پیرا میڈیکل کا عملہ اس بہیمانہ قتل کی واردات سے اتنا دہشت زدہ ہوا تھا کہ اب تک وہ ماہرین نفسیات کے ساتھ سیشنز کروا رہے تھے۔ ان میں سے کئی افسران نے پولیس کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ پولیس کے دو اعلیٰ افسران نے ذہنی دباؤ سے تنگ آکر خودکشی بھی کرلی تھی۔ ریاض نگر پر خوف و دہشت کا پہرہ تھا۔ قاتل کے محرک کو سمجھنے سے سب لوگ قاصر تھے۔ اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا نہیں جاسکا تھا کہ چالیس لوگ ایک فرد واحد کے سامنے بے بس کیسے ہوگئے تھے؟ ایک فرد واحد نے سفاک بھیڑیئے کی طرح کس طرح اتنے بڑے ریوڑ کا شکار کیا تھا؟

ان سوالات کے جوابات کسی کے پاس نہیں تھے۔ ماہر نفسیات نینا عالم نے مجرم کے ساتھ کئی سیشنز کئے تھے۔ مگر وہ بھی حقیقت پر سے پردہ اٹھانے سے قاصر نظر آتی تھی۔ مجرم کی یادداشت مکمل طور پر مٹ چکی تھی اور وہ واردات کے متعلق کچھ بھی بتانے سے گریزاں نظر آتا تھا۔

آج پہلی بار پھانسی دینے والا جلاد عباد بھی متزلزل تھا۔ اس کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری موت کی سزا پانے والے مجرموں کی دیکھ بھال بھی تھی۔ اس لئے وہی مجرم کو کال کوٹھری میں کھانا بھی پہنچاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مجرم عام مجرموں سے جدا تھا۔ اسے اکثر اس کی کال کوٹھری سے ایک نوجوان لڑکی کی باتیں کرنے اور ہنسنے کی آوازیں آتی تھیں۔ جب کہ مجرم کے رونے اور آہ وزاری کی آوازیں آتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے مجرم اس لڑکی سے معافی تلافی کرتا تھا مگر وہ اسے بخشنے پر راضی نہیں ہوتی تھی۔ مگر وہ جب بھی دروازہ کھولتا تو مجرم اکیلا ہی ہوتا تھا۔ اس کال کوٹھری میں کسی دوسرے شخص کی موجودگی ناممکن تھی کجا ایک جوان لڑکی۔

عباد نے مجرم کو کھانے کو ہاتھ لگاتے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ پانی پیتا تھا اس کے بجائے وہ کال کوٹھری کے چوہے پکڑ کر ان کے گوشت سے اپنی بھوک اور ان کے خون سے اپنی پیاس بجھاتا تھا۔ وہ جلاد تھا اور اپنے کام کے باعث وہ ایک مضبوط قوت ارادی کا حامل شخص تھا۔ وہ زندگی میں کبھی کسی سے خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ مگر اب زندگی میں پہلی بار وہ اس سزائے موت کے مجرم سے شدید خوفزدہ تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ مجرم کسی بدروح کے زیر اثر تھا۔ مجرم نے ایک دو بار اسے بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ مگر عباد کے گلے میں لوح قرآنی اور اس کے ذکر الٰہی کے باعث وہ اسے چھو بھی نہیں پایا تھا۔

مجرم کی کوٹھری سے شدید بدبو کے جھونکے آتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی مردہ وہاں سڑ رہا تھا۔ مجرم اکثر زنانہ آواز میں سنسکرت بولتے ہوئے پایا جاتا تھا۔ عباد جب بھی اس کی کوٹھری میں جاتا تھا اپنے اردگرد آیت الکرسی کا حصار باندھنا نہیں بھولتا تھا۔

مجرم اسے کینہ توز نظروں سے گھورتا رہتا مگر اس کے نزدیک آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ آج بھی عباد نے پھانسی گھاٹ کا جائزہ لیا۔ اسی دوران میں سپاہی مجرم کو لے آئے۔ آج پھانسی گھاٹ میں شہر کا شہر اُمنڈ آیا تھا۔ حکومت نے خاص اجازت نامہ دیا تھا کہ جتنا اس بھیڑیئے کا انجام اپنی آنکھوں دیکھ سکے۔ بطور جلاد اس نے مجرم کو سپاہیوں سے وصول کیا اور پھانسی گھاٹ پر کھڑا کرتے ہوئے اس سے پوچھا:

''مرنے سے پہلے تمہاری کوئی آخری خواہش ہے تو بتاؤ۔''

مجرم نے اپنی سرد سیاہ آنکھوں سے اسے گھورا۔ عباد کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈک کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ مجرم اس کی حالت دیکھ کر شیطانی انداز میں ہنس پڑا۔ وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا:

''میں چاہتا ہوں کہ میری پریمیکا کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنی آپ بیتی سنا سکے اور آپ سب جان سکیں کہ میں نے چالیس افراد کو کیوں جاں بحق کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سوال کا جواب تو آپ سب جاننا چاہتے ہوں گے۔ میں اگر اس راز سے پردہ ہٹائے بغیر اگر مر گیا تو یہ راز ہمیشہ کے لئے میرے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔''

پولیس کمشنر اور جیلر نے بے چینی سے پہلو بدلے اور ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ مرنے والے قیدی کی

آخری خواہش پوری کرنا جیلر کا اخلاقی فریضہ ہوتا تھا اس لئے جیلر نے اپنے اختیارات کے باعث مجرم کو آدھا گھنٹہ آپ بیتی سنانے کے لئے منظور کردیا۔

جیلر نے تحکمانہ انداز میں کہا:

''اپنی پریمیکا کو کہو کہ آگے آئے اور کہانی سنائے۔'' مجرم یہ سن کر دیوانہ وار ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی کی آواز سن کر پورا ہجوم ساکت وصامت رہ گیا۔ مجرم کے حلق سے نکلنے والی آواز مردانہ نہیں زنانہ تھی۔

مجرم نے سر اٹھا کر مجمعے کی جانب دیکھا اور بولا:

''جج! جج جیلر صاحب دھیرج رکھو۔ پریمیکا تو مجرم کے اندر ہی بستی ہے۔ اس لئے مجھے علیحدہ سے بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آپ بیتی میری یعنی آشا دیوی ہے۔ میں جو بھگوان داس راؤ کی اکلوتی سپتری تھی اور ریاض نگر کی قانونی وارث تھی۔ وہ ریاض نگر جس کی بنیاد ہمارے خون ناحق پر رکھی گئی ہے۔ آج میرا انتقام پورا ہوجائے گا۔ کیونکہ مجھے مارنے والے کا یہ آخری ونش بھی آج پھانسی چڑھ جائے گا۔ اس شہر کے پرانے لوگ بخوبی جانتے ہوں گے کہ ہم کون تھے؟''

شہر کے بوڑھے شہری دم بخود سے رہ گئے تھے۔ انہیں بھگوان داس راؤ اور اس کی سپتری آشا دیوی بخوبی یاد تھے۔ ریاض خان ان کا فیملی ڈاکٹر تھا اور اس نے یہی بتایا تھا کہ باپ بیٹی اپنی جائیداد اس کے ہاتھ بیچ کر انڈیا چلے گئے تھے۔ مجمع میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔

ماہر نفسیات نینا عالم نے بھی فوراً اپنا ٹیپ ریکارڈر آن کردیا اور قلم مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس شہر کے بہیمانہ قتل کی واردات کا سرا آج اس کے ہاتھ لگنے والا تھا۔ مجرم نے مائیکروفون ہاتھ میں پکڑا اور بولنا شروع کردیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی باریک زنانہ آواز کسی طور بھی اس کے بھاری تن وتوش سے میل نہیں کھا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مجرم کوئی اور ہی شخصیت کا حامل شخص تھا۔ نینا عالم نے سوچا:

''یہ split personality کا کیس معلوم ہوتا ہے۔''

مگر نجانے کیوں اس کے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار شدید خوف محسوس کررہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اماوس کی رات کی تاریکی ہر طرف برائی کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ شب نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ جھینگروں کے ٹرانے سے احساس ہوتا تھا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی شب گزیدہ تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے نیلے، پیلے دائرے سے ناچ رہے تھے مگر وہ اس کے باوجود اندھا دھند بھاگتی جارہی تھی۔ اس کے پیر لہولہان ہوچکے تھے مگر وہ ہر تکلیف سے بے نیاز بھاگے جارہی تھی۔ اسے آج احساس ہوا تھا کہ باپو ہمیشہ درندوں کے بجائے انسانوں سے ہی کیوں خوف کھاتے تھے۔ وہ سنسان جنگلوں کو آبادیوں پر ترجیح کیوں دیتے تھے۔ اسے آج احساس ہورہا تھا کہ انسان سے زہریلی اور عیار مخلوق کرہ ارض پر کوئی اور نہیں تھی۔ اسے تو پتا ہی نہیں چلا کہ کب اس کا مسیحا درندہ بن گیا تھا۔ اسے اب معلوم ہوچکا تھا کہ آج کی رات ایک اتفاق نہیں تھی۔ دشمن کو پتا تھا کہ وہ باپو کی خراب حالت دیکھ کر ضرور مدد حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے گی۔ آج کی رات حادثات کی رات تھی۔ تمام چہروں سے نقاب اتر چکے تھے۔ اس کے جانے پہچانے لوگوں کے کریہہ چہرے بے نقاب ہوچکے تھے۔ اس کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں۔ سینے میں آگ سی بھر گئی تھی۔ اس کی بصارت دھندلاتی جارہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا نازک دل ایک دھماکے سے پھٹنے والا تھا۔ اس کا جسم چور چور ہوچکا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ رکنے کا مطلب دشمن کی جیت تھا۔ اس کی ساڑھی جھاڑیوں کے کانٹوں میں پھنس کر تار تار ہوچکی تھی۔ وہ اب صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں ملبوس ہرنی کی طرح کلانچیں بھرتی چلی جارہی تھیں۔ اس کی ہزار کوششوں کے باوجود تعاقب کرنے والے شکاریوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں قریب آتی جارہی تھیں۔ اچانک ہی اس دشمن جان اس کے منگیتر کی آواز آئی۔

''سسری! دور نہیں گئی ہوگی۔ یہیں کہیں جھاڑیوں میں دبکی پڑی ہوگی۔ ایک ایک کونہ چھان مارو۔ مجھے اس کے دستخط چاہیے ہیں ورنہ باس اس جائیداد کا مالک نہیں پائیں گے اور تم سب کو الٹا لٹکا کر گولی مار دیں گے۔''

وہ بے اختیار ہی خاردار جھاڑیوں میں دبک گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ وہ اپنے کانوں میں سن سکتی تھی۔ اس نے اپنے منہ پر اپنے ہاتھ سختی سے جما دیئے وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس کے منہ سے خوف سے نکلنے والی بے معنی آوازوں کے باعث وہ درندے اس کی جانب متوجہ ہو جائیں۔ اس کے پاس اپنی عصمت کے علاوہ کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ اسے داغدار ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور اپنے انگنت دیوی دیوتاؤں کو دل ہی دل میں یاد کرنے لگی۔ اسے کسی چمتکار کی امید تھی۔ مگر شاید آج اس کی پرارتھنا میں اثر نہیں تھا یا شاید پتھر کے دیوی دیوتا واقعی بہرے تھے اور اس کی مناجات سن نہیں پا رہے تھے۔ اچانک کسی نے اسے گدی سے پکڑ کر کھینچا۔ اس کے حلق سے فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ اب جنگل مشعلوں کی روشنیوں سے روشن ہو چکا تھا۔ وہ گھگھیاتے ہوئے بولی:

''بھگوان کے واسطے! مجھے جانے دو۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ دیکھو تم تو مجھ سے پریم کا دعویٰ کرتے تھے۔''

اچانک دور سے ایک جانا پہچانا مہربان چہرہ اسے اپنی جانب آتا نظر آیا۔ اسے امید بندھی کہ شاید وہ اس کی داد رسی کرنے آیا تھا۔ مگر یہ کیا وہ تو شمبھو ناتھ کے کاندھے پر ہاتھ مار کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولی:

''ڈا، ڈاکٹر انکل آپ کیسے ہمارے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں؟ آپ تو میرے بچپن سے میرے باپو کے دوست ہیں۔ میرے باپو کے متر ہیں۔''

ڈاکٹر انکل مسکراتے ہوئے آگے بڑھے اور اسے چمکارتے ہوئے بولے:

''رانی! تیرے باپو کو سلو پوائزن بھی تو میں ہی سالوں سے کر رہا تھا۔ ایسے ہی تو بڈھا بیمار سے بیمار تر نہیں ہوتا جا رہا تھا۔ میری نظر روز اول سے اس کی جائیداد، روپے پیسے اور تجھ پر تھی۔ کمبخت بڈھا سانپ بن کر سب چیزوں کی حفاظت کر رہا تھا۔ مجبوراً مجھے انتظار کا پردہ چاک کر کے آج کی رات پلان کرنی پڑی۔''

اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔

وہ چلائی:

''ایسا وشواس گھات تو کوئی دشمن بھی نہیں کرتا۔''

بوڑھا ڈاکٹر چٹخارہ بھرتے ہوئے گویا ہوا:

''سالا بڈھا! کروڑوں کی جائیداد پر سنگھاسن سجائے بیٹھا تھا۔ کہتا تھا یہ جنگلات زمین کا زیور ہیں۔ ارے بھئی نئے شہر کی منظوری ملے بھی تو اب دو سال بیت چکے ہیں۔ مگر بڈھا ٹس سے مس نہیں ہوا۔ پھر منسٹر صاحب کے کہنے پر ہمیں شمبھو ناتھ ملا۔''

وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولی:

''تو تو۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ سب منصوبہ تھا۔ شمبھو تم مجھ سے پریم نہیں کرتے۔ صرف مجھے بے وقوف بنانے کے لئے مجھ سے ناٹک کر رہے تھے۔''

شمبھو ناتھ نے اس کے سامنے کاغذات رکھے اور بولا:

''رانی! چھوڑ فضول کی بکواس۔ شاباش! دستخط کر دے۔ اپنے بابو جی کی زندگی چاہتی ہے اگر؟''

اس نے روتے ہوئے کہا: ''میں صرف اسی شرط پر کاغذات پر دستخط کروں گی کہ تم مجھے بابو جی کو لے کر سُرکشت یہاں سے جانے دو گے۔''

منسٹر کا چمچا ایاز آگے ہو کر غراتے ہوئے بولا:

''پاگل لڑکی! ہم سے بحث کر رہی ہے۔ جلدی کر آگے ہی تیرے باپ نے ہمارا کروڑوں کا نقصان کروا دیا ہے۔ منسٹر صاحب حکومت سے شہر بسانے کی مد میں کئی ارب روپے لے چکے ہیں۔''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

''جب تک مجھے گارنٹی نہیں ملے گی میں کسی قیمت پر کاغذات پر دستخط نہیں کروں گی۔''

شمبھو ناتھ نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

''رانی! میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔ میری ذمہ داری ہے کہ تجھے اور بابو جی کو سُرکشا سے یہاں سے بھیجنا۔''

اس کا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس ان کی باتوں پر یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ روتے ہوئے کاغذات پر جلدی جلدی دستخط کرتے ہوئے بولی:

''ہمیں شما کردو۔ ہم یہاں سے کہیں دور چلے جائیں گے۔ ہم کبھی مڑ کر یہاں نہیں آئیں گے۔ کہیں دور بس جائیں گے۔ میری اور میرے بابو جی کی جان بخش دو۔''

شمبھوناتھ نے کاغذات کو غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا:

''تیری جیسی سندر ناری کی بات ہم کیسے ٹال سکتے ہیں۔ پرنتو تیرے پتا کی تجوری کا مال ومتاع کون ہمیں دے گا۔''

اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگی:

''میں سب کچھ تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں۔ پرنتو ہمیں شما کردو۔ ہمیں جانے دو۔''

شمبھوناتھ نے اسے کاندھے پر ڈالا اور بولا:

''چل! واپس کوٹھی میں چل کر پھیصلہ (فیصلہ) کرتے ہیں۔''

اس نے مچل کر نیچے اترنے کی کوشش کی مگر شمبھو ناتھ کی گرفت بہت سخت تھی۔ شمبھوناتھ اور اس کے حواری جنگلی جانوروں جیسی طرح طرح کی آوازیں نکالتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کے بابو جی بھگوان داس راؤ ایک جدی پشتی رئیس تھے۔ مندھیر کے دیہی علاقے میں ایک بہت بڑی جائیداد کے مالک تھے۔ ان کی جائیداد کے بیشتر حصے پر گھنے جنگلات تھے۔ کافی عرصے سے کچھ بااثر لوگ ایک نئے شہر بسانے کے نام پر ان کی جائیداد ہڑپنے کے چکر میں تھے۔ ان کی زمینوں کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑی جھیل بھی تھی۔ جس پر دور دور سے مرغابیوں کی ڈاروں کی ڈاریں آتی تھیں۔ نایاب قسم کی ٹراؤٹ اور دیگر مچھلیوں کی بہتات تھی۔ جنگلات بھی جنگلی حیات سے بھرے ہوئے تھے۔ اس دور میں جہاں شیر، چیتے نایاب ہوتے جارہے تھے۔ ان کے جنگلات میں ان جانوروں کی بہتات تھی۔ کمیاب قسم کے ہرن، نیل گائے، پہاڑی بکریاں، مور اور رنگا رنگ پرندوں کی بھی بہتات تھی۔ سننے میں آتا تھا کہ جھیل کے پانی میں سونے کی آمیزش بھی ہے۔ اسی باعث لالچی سرمایہ داروں اور حکومت کے کرپٹ سیاستدان اور بیوروکریٹس ایک کاغذی شہر بسانے کی اسکیم لے کر اس کے باپو کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اس کے باپو زمین کو دھرتی ماں قرار دیتے تھے۔ ان کے مطابق درخت زمین کا جھومر تھے۔ وہ جنگلی حیات کے حقوق کے بھی شیدا تھے۔ آج ان کی یہی اصول پسندی اور زمین سے محبت ان باپ بیٹی کو مہنگی پڑ رہی تھی۔ اچانک اس کے خیالات کا ریلا منتشر ہوگیا۔ وہ حویلی پہنچ چکے تھے۔ حویلی کے تمام نوکر اس کے پائیں باغ میں بندھے پڑے تھے۔ اس کی نظر اچانک کھدی ہوئی زمین پر پڑی اور اسے سمجھ آگیا کہ وہ ظالم ان سب کو قتل کرنے والے تھے۔ اس کا سانس اٹک سا گیا۔ شمبھوناتھ تیزی سے اسے لئے حویلی میں داخل ہوا۔ اس کا نازک دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ بابو جی اپنے ہی لہو میں ڈوبے صدر دروازے کے قریب پڑے تھے۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ شمبھوناتھ نے اسے فرش پر پٹختے ہوئے کہا:

''جلدی بتا بڈھے کی تجوری کہاں چھپی ہوئی ہے؟ جلدی سے تجوری کھول۔ بڈھا تو اتنا ڈھیٹ تھا کہ خون تھوکتا مر گیا مگر اس نے زبان نہیں کھولی۔''

اس نے ہمت اکٹھی کی اور نفرت سے اس کے منہ پر تھوکتے ہوئے بولی:

''کم ذات! پاکھنڈی! کبھی نہیں۔ تم ہم سب کو مارنے والے ہو۔ میں نے پائیں باغ میں کھدی اجتماعی قبر دیکھ لی ہے۔''

شمبھوناتھ غصے سے پاگل ہوکر اس پر پل پڑا۔ وہ وحشت میں اسے نوچتے ہوئے بولا:

''میں تجھے اپنی رکھیل بنا کر رکھوں گا۔ تو تجوری تک مجھے لے کر بھی جائے گی اور پھر بھی اسے کھول کر تمام دولت میرے قدموں پر بھینٹ بھی کرے گی۔ میں تجھ سے عمر بھر اپنی سیوا کرواؤں گا۔''

اس نے اپنا بچاؤ کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے شمبھوناتھ کا چہرہ نوچ لیا۔ شمبھوناتھ مزید طیش میں آگیا۔ اس نے تین چار چانٹے اس کے چہرے پر رسید کیے اور گرج کر بوڑھے ڈاکٹر ریاض خان کو آواز دی۔ ڈاکٹر اس کی آواز پر بھاگا چلا آیا۔ اس نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''اس منصوبے کے اصل دماغ تو آپ ہیں۔ سالوں سے بڈھے بھگوان داس کی دولت ہتھیانے کا سپنا آج پورا ہوگیا ہے۔ اس کنیا کے دیوانے بھی آپ ہی تھے۔''

وہ کانپ اٹھی اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ بابو جی کے دیرینہ دوست نے ان کی کمر پر چھرا گھونپا تھا۔ اس نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑے، منتیں کیں مگر یوں لگتا تھا جیسے بوڑھے ڈاکٹر میں شیطانی روح حلول کر چکی تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا:

''پاپی! میں تیری بیٹی کی عمر کی ہوں۔ تم تو مجھے بیٹی کہتے تھے۔''

بڈھا ڈاکٹر شیطانی انداز میں مسکراتے ہوئے اسے قابو میں کرتے ہوئے بولا:

''پرنتو تو میری بیٹی تو نہیں ہے۔ صرف اس کی سہیلی ہونا کافی نہیں ہے۔''

اس نے جی جان سے مزاحمت کی کوشش کی مگر ایک نرم و نازک سی لڑکی ایک چھ فٹ کے جسیم شخص سے کیسے جیت سکتی تھی۔ ریاض خان کی حیوانیت جیت گئی اور اس کی نسوانیت ہار گئی۔ وہ ابھی آنسوؤں میں ہی ڈوبی ہوئی تھی کہ شیطان کے مزید حواری رال ٹپکاتے ہوئے نشست گاہ میں داخل ہوئے اور کہنے لگے:

''مہاراج! ہمیں بھی اس رس بھرے پھول کو سونگھنے کا موقع فراہم کیجیے۔''

اسے معلوم تھا کہ اب مزید اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ اسے بار بار زندہ درگور ہونا منظور نہیں تھا۔ اس نے یک دم ایک فیصلہ کیا۔ اب وہ ہر تکلیف اور خوف سے عاری ہو چکی تھی۔ اس نے اپنا شکستہ وجود سنبھالا اور سرعت سے دیوار پر لگا خاندانی خنجر اتار کر اپنے سینے میں بھونک لیا۔ خون کا فوارہ اس کے چہرے کو رنگین کرتے ہوئے قیمتی ایرانی قالین کو رنگنے لگا۔ اس نے کپکپاتے ہونٹوں سے کہا:

''تم سب کے پاپوں کا گھڑا بھر چکا ہے۔ میں تم سب کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تم سب کبھی شانتی سے جی نہیں پاؤ گے۔ تم اور تمہاری نسلیں کبھی چین سے جی نہیں پائیں گی یہ میرا شراپ ہے۔ میرا بھگوان تو مجھے تم حیوانوں سے نہیں بچا سکا۔ مگر میں کل جہان کے رب سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ وہ میرا انصاف کرے اور مجھے مر کر بھی مکتی نہ دے۔ مجھے واپس آنے دے۔ میرے لئے موت تو ایک نئی زندگی کی شروعات بنا ڈالے۔ وہ رحیم ہے۔ وہ ضرور مجھ بے گناہ کی سنے گا۔''

اس نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے ایک مرتبہ پھر اپنے قاتلوں کے چہرے دیکھے۔ اس کی ٹھٹھری ہوئی پتلیوں پر اس کے قاتلوں کا عکس منجمد ہو کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

فرقان خان نے گھڑی دیکھی وقت بہت ہو چکا تھا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ اس نے کسلمندی سے انگڑائی لی اور گلاس میں بچی کھچی شراب کو ختم کیا۔ اس نے اردگرد دیکھا اس کے دوست نشست گاہ میں اوندھے سیدھے گرے پڑے تھے۔ ام الخبائث نے اس کے علاوہ سب کے ہوش و حواس معطل کر دیئے تھے۔ خراٹوں کی آوازوں سے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کئی گیدڑ دانت نکو سے بھونک رہے تھے۔ اپنے تخیل کی روانی پر فرقان خان کو ہنسی سی آگئی اور اس کے ہونٹوں پر بے اختیار ہی مسکراہٹ چھا گئی۔ وہ سیٹی بجاتا ہوا اٹھا اور گاڑی کی چابی لے کر ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ مین گیٹ پر چوکیدار بھی کیبن میں بیٹھے بیٹھے سو چکا تھا۔ اس نے پہلے چوکیدار کو اٹھانا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ اس نے خاموشی سے گیٹ کھولا اور باہر آگیا۔ اسٹریٹ لائٹس کی ملگجی زرد روشنی میں وہ اپنی

...تھا۔ اس نے محبت سے گاڑی کے اسٹیئرنگ
...۔ اس نے پراڈو کا نیا ماڈل کچھ دن پہلے
...ایا تھا۔ اس نے سیٹی بجاتے ہوئے
...ی اور واپس نئے بسے شہر ریاض نگر کی
...ابا کا بسایا ہوا عظیم الشان شہر جس
...تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اسے شہر پہنچتے
...لگنے والے تھے۔ فرقان خان کو اس
...ہضم کہتے تھے۔ شراب کی دو تین
...اس پر ہلکی سی خماری کے علاوہ کچھ نہیں
...اس کے حواس بجا رہتے تھے۔ جب کہ اس
...بوتل پی کر لڑھک جاتے تھے۔ فرقان
...تھا۔ بے پناہ دولت، اختیار نے اسے
...وہ سمجھتا تھا کہ پیسہ خدا تھا۔ ہر چیز وہ پیسے
...تھا۔ فرقان خان صرف نام کا مسلمان
...تھا۔ آخری مرتبہ اس نے نماز کب پڑھی
...نے کے آداب بھی بھول چکے تھے۔ وہ
...پسند کرتا تھا۔ شراب، شباب، جوا اور
...زندگی کا حاصل تھے۔ انسانی جان کی وقعت
...ایک کیڑے مکوڑے جتنی بھی نہیں تھی۔ وہ
...عیار تھا۔ آج بھی اپنے دھیان میں چلا

...ایک لڑکی نظر آئی جو سڑک کنارے
...گاڑی روکنے کے لئے ہاتھ ہلا رہی تھی۔
...پر دھوکے کا گمان ہوا۔ پھر اس کے
...اختیار ہی ایک مکروہ سی مسکراہٹ آ گئی،
...سنسان سڑک پر ایک اکیلی دوشیزہ۔ اس کی رنگین
...اس نے گاڑی لڑکی کے پاس لے جا کر
...اس نے دیکھا گاڑی رکتے ہی لڑکی نے ہاتھ
...تھا۔ لڑکی نے سفید رنگ کی ساڑھی زیب تن
...کی۔ وہ سرو قامت تھی۔ اس کا بدن بہت ہی
...تھا۔ اس کی نگاہیں لڑکی کے بدن کے نشیب و
...الجھ کر رہ گئیں۔ لڑکی کی طویل زلفیں بکھری ہوئی
...اس کے چہرے کو چھپائے ہوئے تھیں۔ فرقان کو

حیرت ہوئی کہ رات کے اس پہر وہ لڑکی تنہا ایک سنسان اور ویران ہائی وے پر کیا کر رہی تھی؟

شاید قدرت آج اس پر مہربان تھی۔ اس نے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے کھنکھارتے ہوئے کہا:

"محترمہ! میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

لڑکی نے روئی روئی آواز میں سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"بابو جی! میرے باپو کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ بہت بیمار ہے۔ بھگوان کے واسطے میرے ساتھ چلو ورنہ وہ مر جائے گا۔"

یہ کہتے ہوئے لڑکی نے اپنا چہرہ اوپر کیا۔ فرقان کی دھڑکنیں تھم سی گئیں۔ لڑکی بہت ہی حسین اور کم عمر تھی۔ شاید عمر کی سترہ بہاریں ہی اس نے مشکل سے دیکھی تھیں۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ کجراری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر کپکپاہٹ سی طاری تھی۔ اس کے عارض آنسوؤں سے تر تھے۔ فرقان خان کا دل کیا کہ وہ اس کے آنسوؤں کو اپنے لبوں سے چن لے۔ اس نے اپنی دلی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"بیٹھو۔"

لڑکی گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ فرقان خان کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ اس نے لڑکی سے راستہ پوچھا۔ لڑکی کی ہدایات پر گاڑی گھماتا رہا، ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ لڑکی کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گئے اس نے دیکھا! ایک عظیم الشان حویلی گھنے جنگل کے بیچوں بیچ بنی ہوئی تھی۔ حویلی میں جلتی روشنیوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی تک شمع دان ہی جلائے ہوئے تھے۔ بجلی کی دستیابی یہاں نہیں تھی۔ اس نے حیرت سے حویلی کی جانب دیکھا اور اردگرد پھیلے جنگل کو دیکھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ لڑکی اسے کس راستے سے کہاں لے گئی تھی۔ اس کی یادداشت میں اس علاقے میں جنگل اور حویلی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس نے حیرت سے لڑکی کی جانب دیکھا اور کہا:

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

لڑکی نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

"بابو! جلدی کرو کہیں انرتھ نا ہو جائے۔"

لڑکی کے ہاتھ بہت سرد تھے۔ اس کے ہونٹوں پر اب ایک بہت دعوت دیتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ وہ سحر زدہ سا اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ بس وہ لڑکی ہی ایک حقیقت تھی۔ وہ لڑکی کے ہمراہ حویلی میں داخل ہوا۔ حویلی کی سج دھج نرالی تھی۔ اس نے دیکھا جوان اور خوبصورت خادمائیں حویلی میں شمع دان روشن کرتی پھر رہی تھیں۔ ان کے ماتھے کی بندیا اور ساڑھی کا ملبوس بتا رہا تھا کہ وہ ہندو خواتین تھیں۔ مرد خدام نے اسے دیکھ کر آپس میں کھسر پسر کی۔ فرقان کا دماغ الجھ سا گیا۔ اس نے لڑکی سے کہا:

"شاید تمہارے والد بیمار تھے۔ تم مجھے مدد کے لئے لے کر آئی تھی۔ میں ڈاکٹر ہوں۔"

لڑکی پراسرار انداز میں مسکرائی اور آنکھیں نچا کر بولی:

"دیا رے دیا۔ اتنی بے صبری بابو۔

دھیرج رکھو! بابو پاس ہی لے جا رہی ہوں۔"

اس نے ایک ادا سے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنے ساتھ لے کر ایک کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہاں ایک معمر شخص بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے لڑکی کے کہنے پر اس کا چیک اپ کیا۔ اسے فوری طور پر کوئی بیماری سمجھ نہیں آئی مگر اس نے اسے ایک دو انجکشن لگا دیئے۔ وہ لڑکی کا اعتماد ہر قیمت پر جیتنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے لڑکی کی جانب دیکھا اور بہت پیشہ ورانہ انداز میں کہا:

"مجھے ان کو دیکھنے چند دن روز آنا پڑے گا۔"

لڑکی اس کے قریب آ کر اس کے گلے میں بازو ڈال دیئے اور لہک کر بولی:

"یہاں سے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہیں رہ جاؤ ہمارے پاس۔ میں داسی بن کر تمہاری سیوا کروں گی۔"

لڑکی کے جسم سے اٹھتی بھینی بھینی خوشبو، اس کی سپردگی فرقان کو کسی اور جہان میں لے گئی۔ اس نے بولنا چاہا مگر لڑکی نے اپنے ہونٹوں سے اس کے ہونٹوں کو مہر لگ دی۔ وہ بے خود سا ہو گیا۔ وہ ایک روایتی لڑکی سے اس باکی کی امید نہیں کر رہا تھا۔ وہ بیرون ملک حسین و جمیل او طرح دار حسیناؤں کے ساتھ رہتا رہا تھا مگر ایسا نشہ، ایک بے خودی اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس کے لے عورت صرف ایک استعمال کی چیز تھی۔ وہ پرانا شکاری تھا اسے یہ اوصاف اپنے باپ ریاض خان سے تھے۔ لڑکی نے گھنیری پلکیں اٹھائیں اور سحر زدہ نگاہو سے اسے گھورتے ہوئے بولی:

"میرے پیچھے پیچھے یہ جملے دہراؤ۔

آشا! میں تمہارے لئے اپنا جسم، جان س چھوڑنے پر راضی ہوں۔ تم جب چاہو مجھے اپنے وش میں کر سکتی ہو۔ تمہارا پریم، تمہاری اچھا ہی میرے جیون مقصد ہے۔ میرا شریر تمہارا شریر بننے کے لئے حاضر ہے تم جو چاہو مجھ سے کروا سکتی ہو۔ میں تمہارا غلام ہوں۔"

فرقان نے مسکراتے ہوئے سر نفی میں ہلایا ا شرارت سے بولا:

"آشا جی! آپ تو مجھے انگریزی ہارر موویز کی دلا رہی ہیں۔ جہاں کوئی بدروح کسی بھولے بھا انسان کو قابو میں کرنے کے لئے اسے یہ جملے دہرانے مجبور کرتی ہے۔ آپ کی میری ملاقات بھی فل ہے۔ اندھیری رات، سنسان ہائی وے پر جوان لڑکی۔ کہیں آپ بدروح تو نہیں ہیں۔"

آشا اسے لگاوٹ سے دیکھتے ہوئے بولی:

"ارے آپ تو بہت سمجھ دار نکلے۔ سب حقیق جانتے ہیں۔ پھر بھی مجھ سے ڈر نہیں رہے اور نا ہی بھا رہے ہیں۔ یاد رکھیں۔ ایک دفعہ یہ جملے کہہ دیئے تو آپ یہاں سے رخصت نہیں لے پائیں گے۔"

فرقان کو اس کی حس ظرافت بہت پسند آئی کھلکھلا کر ہنس دیا اور بولا:

"آشا دیوی کی مہان آتما صاحبہ مجھے اجاز دیجیے۔ میرے گھر والے منتظر ہوں گے۔ میں کل دو بابو جی کو دیکھنے آجاؤں گا۔"

آشا نے اسے ناراضگی سے دیکھا اور اٹھ کر ایک جانب چل پڑی۔ فرقان اسے منانے کے غرض سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ آشا ایک سجی ہوئی خواب گاہ میں داخل ہوگئی۔ فرقان نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ اس پر ڈھیر ہوگئی۔ فرقان کی تمام مزاحمت اور قوت ارادی اس کے حسن جہاں سوز کے سامنے بہہ گئی۔ وہ تو ویسے بھی اسے حاصل کرنے کے لئے ہی ماہر شکاری کی طرح داؤ پیچ کھیل رہا تھا۔ یہ اس کا پرانا اصول تھا کہ صنف مخالف کو اتنا تڑپاؤ کہ خود بخود مچھلی جال میں پھنسنے کے لئے بے تاب ہونے لگے۔ فرقان خان بے اختیار ہی مسکرا اٹھا۔ آشا اس پر چھا گئی تھی۔ مگر وہ بار بار وہی جملے دہرانے کی ضد کر رہی تھی۔ فرقان نے سوچا:

''جب پھل خود میری گود میں گرنے کو تیار ہے تو چند جملے کہہ دینے سے میرا کیا جائے گا۔''

اس نے آنکھیں بند کیں اور اس کے بتائے ہوئے جملے اس کے پیچھے پیچھے دہرانے لگا۔ اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا اختیار اپنے جسم اور ذہن سے ختم ہوگیا ہو۔ وہ اپنے ہی جسم میں محصور ہو چکا ہو۔ اس نے دیوانہ وار آزادی کی کوشش کی مگر ہر کوشش آشا نے ناممکن بنا ڈالی۔ فرقان کو جب دوبارہ ہوش آیا تو وہ سر سے پاؤں تک خون میں لت پت تھا اور اس کے ارد گرد لاشیں ہی لاشیں تھیں۔

سب سے برا حال اس کے ابا اور بھائی کی لاش کا تھا۔ اس نے آہ و فغاں کرنی چاہی تو آشا کی کھنکتی ہنسی نے دہل گیا۔ آشا اس کے سامنے بیٹھی شعلہ بار نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب پولیس آئی اور کب وہ گرفتار ہوگیا۔

اسے سزائے موت بھی ملی تو بھی وہ ٹھس ہی رہا۔

آشا دن رات اس کے ساتھ رہتی اور اپنی داستان نا لر اس کی بے بسی کو آزماتی۔ وہ یہی کہتی کہ اس کے اعمال بد شراب نوشی اور زنا کاری نے اسے جسمانی طور پر اس قدر پلید کر دیا تھا اور اس کی روح کو اس قدر آلودہ کر دیا تھا کہ اس نے آشا کے اکسانے پر اس کے بتائے ہوئے جملے دہرا کر درحقیقت اسے اپنے جسم کا اختیار دے دیا تھا۔ آشا اس کے جسم میں حلول کر گئی تھی اس کا کہنا تھا:

''بابو! تم ہو تو ایک سچے مذہب کے پیروکار مگر محض مسلمان کے گھر پیدا ہونا یا مسلمانوں جیسا نام کافی نہیں ہوتا۔ تمہارے باپ نے بے ایمانی اور قتل و غارت گری کے ذریعے امیر ہونا چاہا۔ اس کا خدا صرف دولت تھی۔ وہ سزا جزا کو بھول چکا تھا۔ ایک مسلمان ہو کر اس نے بربادی کا راستہ چنا۔ میرے باپو نے اسے اپنا مترسمجھ کر اس پر وشواس کیا۔ مگر اس نے مجھے، میرے باپو کو اور ہمارے ملازمین کو موت کے گھاٹ اتار کر ہماری جائیداد ہڑپ کر لی۔

ریاض نگر کی بنیاد ہمارے خون، میری عصمت اور وشواس گھات پر رکھی گئی تھی۔ میرا انتقام آج پورا ہوگیا۔ میں اب تجھے چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ جلد ہی تیری گردن پھانسی کے پھندے کی نذر ہو جائے گی اور میرا شراپ مکمل ہو جائے گا۔''

مجرم خاموش ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے پورا مجمع بھی پتھر کا بن گیا ہو۔ اچانک فرقان خان اپنے ہوش و حواس میں آ گیا۔ وہ اب ایک عام انسان جیسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی گردن پر پھانسی کا پھندا کسا دیکھا تھا۔ تو بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ بار بار کہتا:

''میں بے قصور ہوں۔ آشا کی روح نے مجھے اپنے بس میں کر کے قتل کروائے۔ مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے واسطے مجھے جانے دو۔''

مجمع میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئی مگر جیلر نے جلاد عباد کو رسی کھینچنے کا حکم دے دیا۔ اس نے فرقان خان کے چہرے پر سیاہ کپڑا ڈالا اور رسی کھینچ ڈالی۔ فرقان خان کی گردن ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی اور اس کی آخری چیخ فضا میں گونج کر رہ گئی۔ ظالم کے ظلم کا سورج غروب ہوگیا۔ مجمع کھسر پھسر کرتا منتشر ہونے لگا۔ ریاض نگر کا قاتل انجام کو پہنچ چکا تھا۔

جہنمی دروازہ

راشد نذیر طاہر

قسط نمبر:5

قدم قدم پر حیرت و خوف کے لمحات میں لپٹی ہوئی پراسرار داستان اس دروازے کی کہانی جو کہ عرصہ دراز سے بند تھا کیونکہ اگر وہ کھل جاتا تو..... دروازہ کیوں نہیں کھلتا تھا جس کا راز کہانی میں پنہاں ہے

رات کے اندھیرے میں جنم لینے والی داستان جو کہ پڑھنے والوں پر لرزہ طاری کردے گی

بہت ہی جان لیوا تھے وہ لمحات..... جو موکل کے خاموش ہونے پر اس کمرے میں محسوس ہو رہے تھے۔

ہاں..... وہ احساس ہی تو ہوتا ہے۔ جو قوت کو مختلف معنی پہنا دیتا ہے۔ کبھی خوشی سے لبریز..... کبھی غم کی آندھیوں میں خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بکھرا بکھرا سا..... جب ہی تو کہا جاتا ہے کہ وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا۔

لیکن یہ لمحے عالی بابا کے لئے بار گراں ثابت ہو رہے تھے..... ہاں.....!!

''تو خاموش کیوں ہے؟'' موکل پوچھ بیٹھا۔

''آں.....!! وہ چونکے پھر جلدی سے بولے۔ کچھ نہیں.....''

''تو اٹل فیصلہ کرلے.....!''

''کس بات کا؟''

''دونوں راستے تیرے سامنے موجود ہیں۔ جواب ملا۔ نہ تو قبرستان کی طرف جانے میں کوئی روک ہے اور نہ ہی کوئی زبردستی.....! اگر تم جانا چاہو تو پھر پلٹو نہیں..... اور اگر وہاں سے گریزاں ہو تو اپنی زبان پر اس کا ذکر بھی مت لاؤ.....!!

''میں تو فیصلہ کر چکا ہوں.....''

''ایک بار پھر اس پر نظر ثانی کر لے.....!!''

موکل کی آواز گونجی۔ کیونکہ ابھی تو آزاد ہے..... لیکن تیری یہ آزادی اس تہہ خانے کے قیدی کی بھی آزادی بن سکتی ہے..... اس سے مقابلہ کرنے والا اور کوئی نہیں رہا۔ یہ مرشد کا ہی دم زور تھا کہ وہ اپنی منہ کی کھا رہا ہے اور زندان در گور ہے..... اب اگر تجھے مقابلہ کرنا ہے تو خود کو بھی موت کے کنوئیں میں دھکیلنا ہوگا.....!!''

''میں نے کہا نا کہ میں فیصلہ کر چکا ہوں.....''

''کیسا فیصلہ.....؟''

''میں قبرستان ضرور جاؤں گا۔''

عالی بابا نے پختہ لہجے میں کہا۔ جواب میں موکل کی کوئی آواز نہیں آئی تھی۔

شاید وہ جا چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

نادر نے بزرگ کا دیا ہوا تحفہ اپنے گلے میں ڈال لیا تھا..... پھر وہ اس پرانے قلعے سے باہر نکل آیا.....

ابھی نہ جانے کیوں حویلی کی طرف جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا..... وہ کافی دیر تک روڈ پر کھڑا ہوا سوچتا رہا..... پھر کچھ سوچ کر اس نے ایک چلتی ہوئی ٹیکسی کو

ہاتھ دے دیا۔
ٹیکسی چند قدم آگے جا کر رک گئی..... ڈرائیور نے بڑی مشکل سے بریک لگائے تھے۔
اس نے دیکھا۔ یہ ایک بڑے میاں تھے..... ان کے چہرے پر صرف مونچھوں کی جگہ بالوں کی ایک لمبی سی لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ باقی ٹھوڑی وغیرہ پر ایک بال بھی موجود نہیں تھا۔
عمر کے اس حصے میں بھی وہ کافی چاق و چوبند دکھائی دے رہے تھے.....
''ہاں بیٹا کہاں جانا ہے.....؟''
''بس جی قصبے میں ہی۔'' وہ مسکرایا۔
بڑے میاں نے سر ہلایا اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔ نادر بیٹھا تو ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔
یہ طویل سڑک خاموشی سے طے ہوئی، اگلا موڑ قریب آنے لگا تو بڑے میاں نے مڑ کر پوچھا۔
''اب بتا دو بیٹا.....! کیونکہ آگے دو راہا پوچھنے والا ہے کہ کہاں کی مسافت طے کرنی ہے۔''
''جی ہاں..... بتاتا ہوں۔'' وہ جلدی سے سر ہلا کر بولا۔ ''مجھے دراصل پرانی حویلی جانا ہے۔''
''پرانی بلڈنگ.....!'' بڑے میاں نے حیرت سے دہرایا۔
پھر وہ بولے۔ ''تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟''
''وہاں مجھے کسی نے بلایا ہے۔''
''ہوں.....!! کیا وہ تمہارا دشمن ہے۔ جو تمہیں بلا رہا ہے؟''
''نہیں.....! کیوں.....؟'' نادر حیرت سے بولا۔
بڑے میاں نے ایک طویل سانس لی اور بولے۔
''پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم پردیسی ہو؟''
''جی ہاں.....! گو کہ یہاں میرے آباؤ اجداد کی حویلی موجود ہے۔ لیکن میں شہر میں رہتا ہوں۔''
''یہ وجہ ہے.....!'' بڑے میاں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے تم سے مذاق کیا ہے۔''
''آخر بتائیں تو کہ مسئلہ کیا ہے.....!''
''میں اس قصبے کے چپے چپے سے واقف ہوں..... کیونکہ میں نے اپنی زندگی کے 62 سال اسی جگہ گزار دیے..... اور..... میں جانتا ہوں کہ پرانی حویلی ایک ایسی جگہ کا نام ہے جہاں پرانے وقتوں کے کھنڈرات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔''
''کیا واقعی.....؟''
''ہاں..... اور یہ بھی مشہور ہے کہ ان کھنڈرات میں بدروحوں کا بسیرا ہے۔ اب مجھے بتاؤ کہ ایسی جگہ پر کون تمہیں بلا سکتا ہے.....!''
نادر سوچ میں ڈوب گیا..... تو کیا وحیدہ نے واقعی اس سے مذاق کیا تھا.....؟ لیکن کیوں.....؟ شہر سے اتنی دور اسے بلا کر وحیدہ کو یہ مذاق کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی.....؟
اسے سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر بڑے میاں بولے۔
''اگر تمہیں میری باتوں کا یقین نہ ہو تو میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں۔''
''آں.....''
''ہاں..... تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا.....''
نادر کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔
''نہیں..... اب اس کی ضرورت نہیں ہے..... آپ پھول نگر چلیں..... میں اپنی حویلی واپس جاؤں گا.....!''

☆.....☆.....☆

سارہ تعریفی نگاہوں سے نواب انور کی طرف دیکھ رہی تھی۔
اور وہ خود اس وقت سارہ کے حسن کے بہتے ہوئے سمندر کی لہروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔
کئی بار ان کا دل چاہا کہ وہ ان اچھلتی کودتی ہوئی موجوں میں خود کو ضم کر دیں..... انہیں چھو لیں..... محسوس کریں.....!
اور پھر بے اختیار ہو کر انہوں نے جب سارہ کی

[illegible] چاہا۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔
[illegible] آپ صاحب خود پر قابو رکھیں...... ایسا تو نہ
[illegible]
[illegible] کیا کروں...... میں دل میرے بس
[illegible] ''نواب انور آہستہ سے بولے۔
[illegible] یب سے انداز میں ان کی طرف
[illegible]

[illegible] انام تماشہ ہے۔''
[illegible] ''نواب انور کے منہ سے نکلا۔
''وہ مسکرائی۔ یہ میرا پیار کا نام ہے......
[illegible] مجھے میری بہن پکارتی تھی...... آہ میری
[illegible] ں نے اسی کے مردہ جسم کی قسم کھائی ہے
[illegible] ں اس کے قاتلوں کو انجام سے دو چار نہ کر
[illegible] تک شادی نہیں کروں گی۔''
[illegible] ہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں
[illegible] لے۔ میں ضرور اس معاملے سے پردہ
اٹھاؤں [illegible]

[illegible] ں بہت خوش ہوئی۔'' سارہ نے کہا۔
[illegible] عالی بابا کو ٹکا سا جواب دیا تھا...... میرے دل کو
[illegible] ملا
[illegible] ہاری کہانی سننے کے بعد کوئی پتھر دل ہوگا۔
[illegible] ''نواب انور جذباتی لہجے میں بولے۔
[illegible] بارے میں کافی غور کیا ہے۔''
[illegible] ی خوش نصیبی ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔
[illegible] را یقین ہے کہ میری بہن کی روح کو ضرور
[illegible] گا۔''
''ہاں...... میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں مجرموں کو
[illegible] کامیاب کروں گا۔'' وہ سر ہلا کر بولے۔
[illegible] اب شدت سے اس وقت کی منتظر ہوں۔''

[illegible] آہستہ سے مسکرائی تھی۔
[illegible] اس کے بعد آپ کے قدموں میں اپنا سر رکھ
[illegible] تا کہ میں بھی سکون کی نیند سو سکوں۔''

''قدموں میں کیوں......؟'' وہ تڑپ گئے۔
''تمہاری جگہ تو میرے دل میں ہے میں تمہیں اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گا......''
وہ شرما سی گئی قوس قزح کے کئی رنگ اس کے چہرے پر بکھر گئے۔
پھر وہ بولی۔
''میں چاہتی ہوں کہ کم از کم اس عالی کے بچے کو تو فوراً ہی چھوٹی موٹی سی سزا ملنی چاہئے۔''
''میں سمجھا نہیں......'' وہ حیرت سے بولے۔
وہ نفرت انگیز انداز میں ہنسی اور بولی۔
''وہ بہت خطین انسان ہے...... جب آپ تہہ خانے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کریں گے تو وہ طرح طرح سے آپ کو روکنے کے لئے پریشان کرے گا اور روڑے اٹکائے گا۔''
''اچھا......تو پھر......؟''
''ایسا کام کریں کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری......''
''میں سمجھا نہیں......!''
میں بتاتی ہوں......وہ سر ہلا کر بولی۔ ''آپ کسی بھی بہانے سے عالی بابا کو......حویلی میں بلالیں......!''
''حویلی میں......؟''
''ہاں......جتنی جلد ممکن ہو...... کیونکہ اگر اسے بھنک پڑ گئی کہ آپ کو حقیقت کا علم ہو گیا ہے تو وہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا......''
''لیکن اسے یہاں بلانے کے بعد کیا کرنا ہو گا......؟''
''میں بتادوں گی......! آپ اسے بلالیں......! اوہ......!!'' دفعتاً وہ چونکی کافی دیر ہوگئی......اب میں جاتی ہوں......حویلی میں میرا کام بھی ادھورا پڑا ہے......کرم دین نے دیکھ لیا تو مجھ پر غصہ کرے گا۔''
یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف لپکی اور باہر نکل گئی۔ نواب انور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

☆......☆......☆

سیما کو اب بھی اس واقعے پر حیرت تھی کہ آخر وحیدہ اچانک کہاں غائب ہوگئی تھی۔

نادر اتفاق سے اس وقت حویلی میں موجود نہیں تھا، جب اچانک ہی وحیدہ پھر سے نمودار ہوئی۔

سیما اس وقت کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی..... سامنے سے وحیدہ ہاتھ ہلاتے ہوئے اسی جانب آتی ہوئی دکھائی دی۔

وہ بڑی عجلت میں قدم اٹھا رہی تھی، پھر اس نے کھڑکی کے قریب آ کر آواز لگائی۔

''دروازہ کھولو..... ذرا جلدی.....''

سیما کچھ سوچ کر کھڑکی سے پرے ہٹی اور دروازے کی طرف چل پڑی۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ وحیدہ سے ملنے پر خود کو مجبور محسوس کرنے لگی تھی۔

اس سے مل کر بھی دل میں ایک خلش سی ابھرتی تھی اور نہ مل کر یہ خلش مزید بڑھ جاتی تھی..... عجب حال تھا.....

اس نے دروازہ کھولا تو وحیدہ پھڑک کر اندر آ گئی۔ وہ غور سے سیما کی شکل دیکھ رہی تھی بولی۔

لگتا ہے تمہارا دل مجھ سے کافی پراگندہ ہے۔

کیا نہیں ہونا چاہئے.....؟ سیما نے غور سے اسے دیکھا۔

وہ مسکرائی اور بولی۔

''ہاں..... لیکن صورت حال ہی کچھ ایسی ہو جاتی ہے..... کیا کروں؟'' تم اس دن کہاں غائب ہوگئی تھیں؟''

''غائب.....؟'' وہ حیرت سے بولی۔ ''ارے میں کوئی جادوگر ہوں جو غائب ہو جاؤں..... بھئی میں تو تمہارے شوہر کے قدموں کی آہٹ سن کر چھپ گئی تھی.....!!''

''کہاں.....؟''

تمہارے دروازے کے ساتھ ہی ایک ستون ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں فوراً ہی اس کی آڑ میں چلی گئی تھی۔ دراصل میں اس حویلی کی چپے چپے سے واقف ہوں۔ تم ضرور نئی آئی ہو اس لئے تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ حویلی میں کہاں کہاں اور کیا کیا موجود ہے۔

''ہوں.....!!'' تو یہ بات ہے.....!! سیما نے طویل سانس لی۔

ہاں.....!! اس نے سر ہلایا۔ ''اس دن کچھ باتیں ادھوری رہ گئی تھیں..... میں ان ہی کو مکمل کرنے آئی ہوں.....!!''

''پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم یہاں آئی کیسے ہو؟'' سیما نے پوچھا۔ ''کیونکہ حویلی میں کوئی انجان انسان تو داخل نہیں ہو سکتا.....!!''

''میں نہ انجان ہوں..... اور نہ انسان.....''

وحیدہ آہستہ سے بولی۔ آواز اتنی دھیمی تھی کہ سیما سن نہ سکی۔

''کیا بول رہی ہو؟''

''میں کہہ رہی تھی کہ میں یہاں کے لئے ہرگز انجان نہیں ہوں.....!''

''وہ کیسے.....؟''

''میں نے تم سے اپنی بیٹی کا ذکر کیا تھا.....!'' وہ بولی۔ ''یاد کرو''

''ہاں..... مجھے یاد ہے.....!''

''میں اس کی معرفت حویلی میں آتی جاتی ہوں.....!''

''معرفت..... کیا مطلب.....؟''

''میری بیٹی اس حویلی میں ملازمت کر رہی ہے۔''

''اوہ..... اچھا!'' سیما چونکی۔ ''لیکن میں نے تو ملازموں میں اب تک کسی لڑکی یا عورت کو نہیں دیکھا.....''

کیا حویلی چھوٹی سی ہے؟'' وحیدہ برا مان گئی۔ ''ارے بیس کے قریب لوگ یہاں ملازمت کرتے ہیں.....''

''یہ تو ہے.....!''

''بس تو پھر..... وہ تمہیں اتنے ہجوم میں کہاں دکھائی دے گی..... ہاں البتہ میں اب اسے کہہ دوں گی کہ وہ تم سے ملاقات کر لے.....!!''

''اچھا.....!''

''وہ بہت حسین ہے۔'' وحیدہ پھر بولی۔ ''جوان ہے..... بس..... اس کا نصیب تھا کہ.....''

وہ بولتے بولتے رک گئی۔

''کیا نصیب.....؟''

''اسے طلاق ہوئی تھی.....!!'' وحیدہ کا لہجہ غم ناک ہوگیا۔ اس کا سابقہ شوہر اپنی سیرت میں بالکل ایسا تھا جیسے فرعون.....

''اوہ.....!!'' سیما کے منہ سے نکلا۔

''ہاں بیٹی.....!!'' وہ سر ہلا کر بولی۔ ''میں نے بہت جتن کئے بہت پاپڑ بیلے تو پھر نماشا کی جان چھوٹی۔''

''نماشا.....؟''

''ہاں.....!!'' وہ مسکرائی۔ ''میری بیٹی کا نام سارہ ہے۔ لیکن پیار سے اسے نماشا کہتے ہیں.....''

چند لمحے خاموشی رہی، پھر وحیدہ چونک کر بولی۔

''ارے..... میں دوسرا کام تو بھول ہی گئی تھی۔ آؤ..... میرے ساتھ میں تمہیں وہ کمرہ دکھا دوں جہاں ملنگ بابا آئیں گے۔''

☆.....☆.....☆

یہ محض اتفاق ہی رہا ہوگا کہ جس رات سے عالی بابا کو قبرستان میں چلے کا آغاز کرنا تھا..... اس گزرنے والے دن میں ان کے لئے حویلی سے بلاوا آ گیا۔

انہیں کافی حیرت بھی ہوئی۔ کیونکہ وہ دو روز قبل ہی حویلی کے نواب انور کا رویہ ان کے لئے کافی تکلیف اور اذیت کا باعث بن چکا تھا..... جبکہ وہ خود بھی اس بات سے لاعلم تھے کہ آخر نواب انور کو ان سے پرخاش کیوں ہوگئی تھی۔

ان کا رویہ اچانک ہی بدلا تھا۔ جو کہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ بہرحال وہ ایک بڑے آدمی تھے..... ہو سکتا تھا کہ وہ اس وقت کسی ذہنی الجھن میں ہوں اور اب اسی کے ازالہ کے لئے انہیں بلا رہے ہوں۔

یوں بھی آنے والے وقت کے لئے عالی بابا کو ادراک تھا کہ وہ حویلی میں اپنی آمد و رفت جاری رکھیں..... ان کے بغیر ان کی قبرستان میں ہونے والی محنت ضائع ہی ہو جاتی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ کیا واقعی وہ مخصوص چلہ کاٹنے کے بعد اس عفریت کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

وہ عفریت..... جسے ان کے مرشد نے تہہ خانے کی کال کوٹھری میں قید کر لیا تھا۔

جس کی تباہ کاریاں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے..... اس بلا نے راتوں رات نہ جانے کتنے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اور وہ بھی اس حالت میں کہ ان مرنے والوں کے جسم میں خون کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی تھی۔

''اف..... کتنے سنسنی خیز تھے وہ لمحات..... اس عفریت سے آخری اور خون ریز مقابلہ حویلی کے ہی کھلے صحن میں ہوا تھا..... یہ عالی بابا کی ہی قسمت تھی کہ اپنے مرشد کے توسط سے انہیں عفریت کا سراپا دیکھنے کو مل گیا۔

آج بھی وہ سراپا جب ان کی نظروں کے سامنے گھومتا تھا تو ان کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے تھے۔

وہ سوچ کے سمندر میں ڈوبتے چلے جا رہے تھے۔ پھر اچانک ہی وہ چونکے تھے۔ حویلی میں پہنچنے کا وقت ہو رہا تھا۔

چنانچہ وہ خیالات کی دنیا سے نکلتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆.....☆.....☆

حویلی میں آج کافی ہنگامہ پروری کا ماحول دکھائی دے رہا تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا اور نواب انور اپنے بیٹے اور بہو کے ہمراہ حویلی کے باغیچے میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔

لیکن یہ ہنگامہ ان کی طرف سے نہیں بلکہ حویلی کے ملازموں کے درمیان بپا تھا۔

رات کے کھانے پر نواب انور نے کچھ مہمانوں کو مدعو کیا تھا..... چنانچہ یہ لوگ اسی دعوت کی تیاریوں میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔

کئی اقسام کے کھانوں کا اہتمام کرنا تھا..... کیونکہ ایک طویل عرصے کے بعد حویلی میں کوئی تقریب

ہورہی تھی۔ چائے کے دوران سیما نے نواب انور کو مذاق میں چھیڑا۔

''ابو جان..... یہ آج کی دعوت کس خوشی میں ہو رہی ہے؟''

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔

''کافی عرصے سے حویلی کی رونق معدوم ہے..... میں نے سوچا کہ ذرا چہل پہل بھی ہو جائے گی۔''

''ویسے ایک بات ہے۔ نادر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''حویلی اور قصبے کے متعلق جو واقعات سنے گئے ہیں ان کے پس منظر میں حویلی اتنے افراد کے ہونے کے باجود بے رونق اور اجاڑ دکھائی دیتی ہے۔''

''میں بھی اکثر سوچتی ہوں۔'' سیما جھرجھری سی لے کر بولی۔ نہ جانے اس وقت کا کیا منظر ہوگا۔

''صرف زمینی اختراع۔'' نواب انور آہستہ سے بولے۔

''کیا مطلب.....؟'' ان دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

''ہاں.....!'' نواب انور نے سر ہلایا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ ایسا کچھ ہوا ہے۔''

''لیکن..... انکل عالی نے تو.....'' انور نے بولنا چاہا۔

''انسان جب جھوٹ بولتا ہے تو اس کے نہ تو پر لگتے ہیں اور نہ سر پر سینگ اگتے ہیں۔''

''آپ کا مطلب یہ ہے کہ عالی بابا نے داستان گڑھی ہے؟''

''ہاں.....!!''

''لیکن..... اس کی وجہ.....؟''

وجہ بھی معلوم ہو جائے گی۔

''اگر یہ بات مان لی جائے تو اس ضمن میں حویلی کا ہر فرد جھوٹا ثابت ہو جائے گا۔ نادر بولا۔

''مجھے کب انکار ہے۔'' نواب انور بولے۔ ''ہو سکتا ہے کہ ہمیں حویلی سے دور رکھنے کے لئے یہ کہانی بنائی گئی ہو..... یہ بھی ممکن ہے کہ کسی جرم پر پردہ ڈالا گیا ہو.....''

نادر چند لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔

''لیکن آپ کو اس کہانی میں شک کیسے ہوا.....''

''یہ بھی میں جلد ہی بتا دوں گا۔'' نواب انور پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ اصل داستان بھی اس خوفناک کہانی سے کسی صورت کم نہ ہوگی۔''

''آپ ہمیں تو بتائیں کہ کیا معاملہ ہے۔'' سیما نے بے چینی سے پوچھا۔

''بہت جلد! وہ بولے۔ ہاں۔ میں بہت جلد کچھ اہم فیصلے کرنے والا ہوں..... مجھے یقین ہے کہ ان میں سے ایک فیصلہ تو تم لوگوں کو بہت پسند آئے گا۔

نادر اور سیما خاموشی سے ان کی شکل دیکھنے لگے۔ جبکہ نواب انور اب کسی اور طرف متوجہ ہو کر سوچ میں ڈوب چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی سیما جھٹ سے بولی۔

''کیا بات ہو سکتی ہے؟''

''خدا جانے..... ! نادر نے طویل سانس لی۔ میں تو خود حیرت زدہ رہ گیا ہوں.....''

''ابو جان کافی پراسرار لگ رہے ہیں.....'' سیما بولی۔ ''نہ جانے ان کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔ ان کے فیصلے کس نوعیت کے ہوں گے۔''

''ہاں دیکھو۔''

'میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں.....''

''ہاں بولو.....''

''میں نے آپ کو ایک لڑکی کے متعلق بتایا تھا۔''

''کون سی لڑکی.....؟''

''وحیدہ کی بیٹی.....''

''پھر وحیدہ.....'' نادر چونکا۔ ''ارے بابا وہ تو خود ایک جواں سال لڑکی ہے۔ اس کی بیٹی کہاں سے آ گئی۔''

''وہ پھر کوئی اور وحیدہ ہوگی جس سے آپ نے

ملاقات کی ہے۔''

''اچھا چلو..... آگے بولو.....''

''اس کا نام سارہ ہے.....'' سیما نے بتایا۔ ''اور وہ اسی حویلی میں ملازمت کرتی ہے..... میں نے ابو جان کی اسی سے شادی کروانی ہے۔''

''وہ یہاں ملازمت کرتی ہے؟''

''جی ہاں.....''

''لیکن میں نے تو یہاں کبھی کسی عورت کو نہیں دیکھا۔''

''ہو گی کہیں.....'' سیما بولی۔ ''حویلی کوئی چھوٹی موٹی جگہ تو نہیں ہے۔''

''ہاں..... یہ تو ہے.....'' نادر سر ہلا کر بولا۔ ''کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟''

''نہیں.....''

''پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ یہاں موجود ہے؟'' نادر نے پوچھا۔

سیما اس سوال پر بوکھلا سی گئی۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر بولی۔

''مجھے وحیدہ نے بتایا تھا۔''

''کب.....؟''

''اپنے گھر میں.....'' سیما بولی۔ ''جب وہ وہاں آتی تھی۔''

''اچھا.....''

''ہاں..... میرے یہاں آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں اس لڑکی کو دیکھ لوں..... تاکہ بات آگے بڑھے.....''

''یہ بات ہے تو ابھی لو.....'' یہ کہہ کر نادر نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

اس سے پہلے کہ سیما کچھ کہتی۔ فوراً ہی ایک ملازم اندر داخل ہوا یہ نیا چہرہ تھا۔ اس نے ادب سے پوچھا۔

''جی چھوٹے سرکار۔''

''یہاں کسی لڑکی کو ملازمت پر رکھا گیا ہے..... ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں..... اسے بلا کر لے آؤ۔''

''جی حضور..... وہ حیرت سے بولا۔ ''لڑکی.....''

''کیوں..... کیا ہوا.....؟''

''حویلی میں تو کوئی لڑکی ملازمت نہیں کرتی.....'' وہ بولا۔

نادر نے معنی خیز نگاہوں سے سیما کی طرف دیکھا۔ سیما فوراً ہی ملازم سے مخاطب ہوئی۔

''تمہارا نام کیا ہے.....؟''

''جی..... میں فرید ہوں.....''

''کیا تم یہاں نئے ہو.....؟''

''جی میں نہ تو نیا ہوں اور نہ ہی زیادہ پرانا.....'' اس نے لجاجت بھرے انداز میں کہا۔ مجھے یہاں 2 سال ہوئے ہیں۔''

''اوہ.....! پھر بھی تمہارے علم میں نہیں ہے کہ یہاں کوئی لڑکی بھی کام کرتی ہے؟'' سیما نے غور سے اسے دیکھا۔

فرید کی شکل قابل دید ہو گئی نادر بے ساختہ ہنس پڑا اور فرید سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تم جاؤ یہاں سے..... اور ہاں.....! 2 کپ چائے ضرور لے آؤ..... ابھی چائے پی ہے لیکن ایک بار پھر طلب ہو رہی ہے..... جاؤ.....''

''ابھی لایا سرکار.....'' نادر نے سر کو خم کیا اور کمرے سے نکل گیا۔

اب نادر سیما کی طرف مڑا۔

تمہاری وحیدہ ایک نمبر کی جھوٹی اور مکار عورت ہے..... ثابت ہو گیا'' سیما کچھ نہ بولی۔ وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

حویلی آج چودھویں کے چاند کی طرح اپنے آب و تاب پہ تھی..... نواب انور کے کہنے پر کچھ بیرونی لائٹوں کا اضافہ کیا گیا تھا..... یہی وجہ تھی کہ چاروں طرف روشنی کے ہالے بکھرے ہوئے تھے۔

آج خاص طور پر وہ کمرہ کھولا گیا تھا۔ جہاں نواب انور کے دادا اور پر دادا کی کچھ قیمتی نشانیاں رکھی

ہوئی تھیں اور جن کا شمار اب نوادرات میں ہوتا تھا۔

یہ ہال نما کمرہ تھا۔ جس کے کونوں میں شوکیس موجود تھے۔ ان میں وہ قیمتی اشیاء موجود تھیں۔

سامنے دیواروں پر وہ ہتھیار بھی چسپاں دکھائی دیئے کہ جن کو ہرن کے شکار کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

اسی کمرے میں کھانے کا بھی انتظام کیا گیا تھا اور فرشی قالین پر طویل دسترخوان بچھایا گیا تھا۔

جلد ہی مہمانوں کی آمد کا آغاز ہوگیا..... عالی بابا کے علاوہ اس دعوت میں قصبے کے چند معزز افراد بھی شامل تھے۔

نواب انور اور نادر نے مشترکہ طور پر مہمانوں کا استقبال کیا تھا۔

نواب انور نے خاص طور پر عالی بابا سے مصافحہ کیا اور بغل گیر ہوتے ہوئے آہستہ سے بولے۔

اس دن کے رویئے پہ میں معذرت خواہ ہوں۔''

'' کوئی بات نہیں جناب.....! وہ بولے۔

''انسانی ذہن ہے..... کبھی کسی الجھن کے دباؤ میں آ کر ایسا ہو جاتا ہے۔

پھر چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وناب انور نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

''میں آج آپ لوگوں کو اپنے آباؤ اجداد کی چند نادر اور تاریخی چیزوں سے روشناس کروانا چاہتا ہوں..... تاکہ آپ لوگوں کو بھی اندازہ ہو کہ وہ کس قدر بہادر، مضبوط اور شجاع تھے۔''

''جی بالکل.....!'' کئی آوازیں ابھریں۔

پھر ان ہی مہمانوں میں ایک ضعیف سا شخص اٹھا اور لڑکھڑاتی ہوئی سی آواز میں بولا۔

''مجھ سے زیادہ اس حویلی کے مکینوں سے کون واقف ہوگا..... میں عرصہ دراز سے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا آ رہا ہوں.....''

نواب انور نے غور سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ جو بوڑھا اور طویل العمر ہونے کے باوجود بھی اپنی آنکھوں کی بدولت کافی تندرست اور چاک و چوبند دکھائی دے رہا تھا۔

واقعی اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں گویا برقی رو دوڑ رہی تھی۔

''جی ہاں.....!'' نواب انور نے سر ہلایا۔ ''مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ ان لوگوں میں سے ہو، جو اس قصبے میں اپنی عمر کا سارا حصہ گزار چکے ہیں۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ قصبے میں کوئی اور میرا ہم سر ہو.....'' اس بوڑھے کے لہجے میں فخر تھا۔

نواب انور اس کے قریب ہو گئے اور بولے۔

''کیا میں آپ کا اسم گرامی پوچھ سکتا ہوں۔''

''ہاں.....'' بوڑھے نے سر ہلایا۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔ ''نماشا.....!'' نواب انور سن نہیں سکتے تھے فوراً ہی کہنے لگے۔

''آپ نے کیا کہا.....؟''

''میرا نام پاشا ہے..... کمال پاشا.....!

بوڑھے کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر.....!!

یہ کہہ کر نواب انور نے مصافحہ کے لئے کمال پاشا کی طرف ہاتھ بڑھایا..... لیکن عین اسی وقت گھپ اندھیرا چھا گیا شاید لائٹ چلی گئی تھی۔

اندھیرا اتنا شدید تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دی رہا تھا۔ عین اسی وقت نادر نے بلند آواز لگائی۔

''جو جہاں ہے وہیں موجود رہے..... روشنی کا انتظام جلد ہی ہو جائے گا..... پریشان نہ ہوں۔''

اگرچہ یہ جملے حوصلہ افزا تھے..... لیکن عین اسی وقت اس ہال نما کمرے میں گونجنے والی وہ چیخ کافی لرزہ خیز تھی۔

''ہاں.....'' یہ بلند آواز کسی کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔

جیسے اچانک ہی وہ کسی شدید قسم کی تکلیف میں

مبتلا ہو گیا ہو۔

''کیا ہوا..... کون ہے..... کیا ہوا.....؟'' بے ساختہ کئی آوازیں گونج اٹھیں۔

سب ہی پریشان ہو گئے تھے۔ کیونکہ آنکھیں کچھ دیکھنے سے قاصر تھیں۔

اور پھر ہال روشنیوں سے جگمگا اٹھا..... لائٹ آ گئی تھی۔

لیکن پھر جو کچھ وہاں دکھائی دیا۔ اس نے کئی لوگوں کو ہراساں کر دیا۔

کمرے کے فرش پر عالی بابا کا جسم اس طرح بے سدھ پڑا ہوا تھا کہ ان کے سینے پر عین دل کے مقام پر ایک پھل دار لمبا چاقو اترا ہوا تھا..... اور ان کے آس پاس خون تیزی سے پھیل رہا تھا۔

عالی بابا یقیناً مر چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

ہال میں خوف اور دہشت کا بازار گرم ہو گیا..... جن کے دل کمزور تھے۔ وہ ایک جانب ہو کر ہانپتے کانپتے دکھائی دے رہے تھے۔

خود نواب انور اور نادر کا یہ عالم تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں.....

پھر انہیں ہوش آیا تو وہ عالی بابا کی طرف جھپٹے..... لیکن اب وہاں کیا تھا.....

نواب انور نے صاف پہچانا، عالی بابا کے دل میں اترنے والا خنجر ان ہی کے خاندانی ہتھیاروں میں سے تھا، جو ان کے آباؤ اجداد کی نشانی تھی۔

ان کے ہوش و حواس معطل ہونے لگے۔

''یہ..... یہ کیا ہو گیا.....؟ کیسے ہو گیا.....؟ وہ بڑ بڑائے..... خدا جانے.....'' نادر کا لہجہ کھویا کھویا تھا۔ ''یہ..... تو صاف قتل کا کیس ہے..... لیکن انہیں کس نے قتل کیا ہے؟''

یہ سوال کافی اہمیت کا حامل تھا..... اس نے تمام مہمانوں پر نظر دوڑائی۔ لیکن کس کے ماتھے پر لکھا تھا کہ وہ قاتل ہے۔

''میرا خیال ہے کہ ابھی کہیں جانے سے پرہیز کیا جائے۔'' نادر نے بلند صدا لگائی۔ پولیس کو بلایا جائے گا۔ جب تک سب ہی اپنی جگہوں پر موجود رہیں.....

''ہاں..... کوئی بھی باہر نہ نکلے.....'' یہ آواز بوڑھے کمال پاشا کی تھی۔ ''ورنہ وہی قاتل ہو گا۔''

واقعی کچھ لوگ باہر نکلنے کے چکر میں تھے۔ یہ الفاظ سن کر وہ سب اپنی اپنی جگہوں پر جم گئے..... یوں لگ رہا تھا جیسے کسی جادوئی طاقت نے انہیں پتھر کا بنا دیا ہو۔

کمرے میں موت کا سناٹا طاری ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

پولیس آ چکی تھی اور اپنی کارروائی میں مصروف تھی۔

یہ کیس ان کے لئے بھی کافی انوکھا اور حیرت انگیز تھا۔ کیونکہ لائٹ کا جانا اور عین اسی وقت حملہ آور کا پکا وار اقعی عین عجوبہ روزگار تھا۔

آخر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں قاتل نے بالکل جامع نشانہ کیسے لگا لیا..... کیا وہ تاریکی میں بھی دیکھ لینے کی قوت رکھتا تھا یہ ایک چکرا دینے والی سچویشن تھی۔

ملحقہ تھانے کا انچارج کافی تیز و طرار انسان تھا۔ لیکن اس واقعے نے اسے بھی حیرت زدہ کر دیا تھا۔

اتنے لوگوں کو ہال میں روکنا فضول تھا۔ چنانچہ انچارج جس کا نام تنویر تھا اس نے ایک کانسٹیبل کو دروازے پر تعینات کر دیا وہ تمام لوگوں کے نام اور پتے نوٹ کر کے انہیں رخصت کر رہا تھا۔

جلد ہی ہال میں صرف مختصر سے لوگ رہ گئے۔ ان میں خود انچارج کے دو ماتحت، نواب انور، نادر اور بوڑھا پاشا شامل تھے..... باقی لوگ رخصت ہو چکے تھے۔

انچارج تنویر نے اب اس خنجر کا جائزہ لیا اور بولا۔

''یہ آپ کا خاندانی خنجر ہے؟''

وہ نواب انور سے مخاطب تھا۔

''ہاں انسپکٹر.....''

''ہوں.....'' وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر دیوار گیر ہتھیاروں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''لاش سے تو اس جگہ کا درمیانی فاصلہ کافی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہال میں داخل ہوتے ہی قاتل نے اس خنجر کو وہاں سے نکال لیا تھا۔

''ہاں لیکن یہ بھی حیرت ناک بات ہے.....

''نادر بولا۔ ''کیونکہ اتنے لوگوں کی نگاہ سے بچ کر کوئی چیز نکال لینا کافی مشکل کام ہے۔''

''اس سے بھی زیادہ مشکل کام خنجر کا نشانہ ہے.....'' یہ کہہ کر انسپکٹر تنویر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

''لائٹ کس بناء پر گئی تھی۔''

''یہ بھی نہیں معلوم.....''

''ہوں.....'' انسپکٹر تنویر نے سر ہلایا۔ ''یقیناً مین سوئچ آف کیا گیا ہوگا..... تاکہ قاتل کو اندھیرے میں حملہ کرنے کا موقع مل سکے..... اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاتل کا کوئی ساتھی بھی رہا ہوگا۔ جس نے مین سوئچ آف کر کے قاتل کی مدد کی۔ اور خود قاتل کی یہ خوبی تھی کہ اس نے اندھیرے میں وار کیا..... واقعی اس کے نشانے کو داد دینی پڑے گی۔''

''یہ بات تو ہے۔'' نواب انور کے منہ سے نکلا۔

''ویسے اس وقت عالی بابا کے قریب کون تھا.....

؟؟''

کمال پاشا نے فوراً ہی آگے بڑھ کر سینے پہ ہاتھ مارا۔

''میں تھا.....!!''

''اوہ.....'' انسپکٹر تنویر نے اسے غور سے دیکھا۔

پھر وہ طویل سانس لے کر بولا۔

''میں لاش اٹھوا رہا ہوں..... ہوسکتا ہے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے کچھ واضح ہو..... ہمارے پاس ابھی صرف آلہ قتل ہے..... عین ممکن ہے کہ اس پر سے انگلیوں کے نشان مل جائیں۔

☆.....☆.....☆

علاقے میں کھلبلی سی مچ گئی۔ عالی بابا کی پراسرار موت کوئی معمولی واقعہ تو نہیں تھا۔

لوگ بھانت بھانت کی باتیں کر رہے تھے۔

نواب انور اس وقت بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل لگا رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر سوچ کی شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔

اسی وقت دروازے پہ دستک ہوئی تو نواب انور چونکے۔

''کون ہے.....؟''

''آپ کا خادم..... دلاور.....!''

''اوہ..... اندر آجاؤ.....!''

فوراً ہی دلاور نمودار ہوا اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

تم گاؤں سے کب واپس آئے..... نواب انور نے پوچھا۔

''صبح کے اجالے میں سرکار.....!'' وہ بولا۔

''عالی بابا کی روح فرساں خبر لتے ہی میں روانہ ہوگیا تھا..... اوہ..... یہ کیا ہوگیا۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''میں خود پریشان ہوں دلاور.....'' نواب انور کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حویلی میں ہونے والی دعوت میں خون کی آبشار بہہ نکلے گی۔''

''کاش کاش میں بھی اس وقت یہاں ہوتا.....

''دلاور کے لہجے میں حسرت تھی۔

''تم کیا کر لیتے..... جو کچھ ہوا۔ وہ مکمل طور پر اندھیرے میں ہوا۔''

''ہم لوگ قریب ہو کر بھی غافل تھے۔''

دلاور چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ.....''

وہ بولتے بولتے خاموش ہوگیا تھا نواب انور نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو.....؟''

''یہ حویلی میں قید اسی عفریت کا کام ہوسکتا ہے.....!''

''کیا بکواس ہے.....'' نواب انور نے منہ بنایا۔

''اگر یہ کام کسی بلا کا ہے تو اسے کس بات کا ڈر ہوگا کہ وہ اندھیرے کا سہارا لے.....اور پھر وہ کس کو دکھائی دے رہی ہے کہ اسے کوئی خدشہ ہو.....فضول باتیں مت کرو۔''

دلاور کو چپ سی لگ گئی.....اب وہ کیا بولتا.....وہ پتھر کے بت کی طرح کھڑا رہا۔

پھر نواب انور خود ہی بولے تھے۔

''اچھا.....اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اس عفریت والی کہانی پہ یقین نہیں ہے تو پھر تمہارا کیا جواب ہوگا۔؟

''جی.....وہ چونکا'' لیکن آپ کی اس بے یقینی کی کیا وجہ ہوگی۔

''کچھ بھی ہوسکتی ہے.....!''

''سرکار.....اگر واقعی ایسا ہے تو پھر آپ کے شک کو یقین میں بدلنے کے لئے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔''

''کیوں.....؟''

''میرا مطلب ہے کہ تہہ خانہ.....کونسا ہوگا.....!''

''ہاں.....ضرورت کے وقت شاید میں اسے کھلواؤں گا.....''

دلاور خاموش رہا۔البتہ اس کے چہرے کا رنگ اتر گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

نادر بھی کافی الجھا ہوا تھا۔کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر اس حادثے کی کیا وجہ تھی۔

ظاہر ہے کہ وہ بھی اس وقت ہال نما کمرے میں موجود تھا۔

اس حویلی کے ایک تاریخی خنجر کو آلہ کار بنایا گیا تھا.....سوال یہ تھا کہ کیا وہ خنجر اسی وقت قتل کرنے والے نے اٹھایا تھا، یا پھر وہ پہلے سے ہی اس پر ہاتھ صاف کر چکا تھا۔

وہ بہ مشکل 2 منٹ کا عرصہ تھا جس میں قتل کیا گیا تھا.....ہاں اتنے ہی وقت لائٹ غائب ہوگئی تھی۔

اس ضمن میں قاتل کے اندازے اور اس کا نشانہ حد درجہ درست ثابت ہوا تھا.....لیکن بے چارے عالی بابا سے کسی کو کیا دشمنی ہوسکتی تھی.....

نادر ان ہی سوچوں میں گم تھا.....جب کچھ نہ سوجھا تو اس نے تھانے کا رخ کیا.....شاید وہاں سے کوئی کام کی بات معلوم ہوجاتی۔

انسپکٹر تنویر نے کافی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تھا فوراً ہی چائے کا آرڈر دیا گیا۔

اب وہ نادر سے بولا۔

''جی جناب.....!! فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں.....''

''میں اسی سلسلے میں آیا ہوں.....'' نادر بولا۔

''میں نے سوچا کہ شاید آپ کو کچھ معلوم ہوا ہو۔''

''نہیں سر.....ابھی تو ہم بھی اندھیرے میں ہیں.....'' انسپکٹر تنویر کے طویل سانس لی۔اگرچہ قتل بھی گھپ اندھیرے میں ہوا ہے۔لیکن خنجر سے ملنے والے انگلیوں کے پرنٹ موصول ہونے کے بعد شاید کوئی روشنی کی کرن دکھائی دے جائے۔

''اوہ.....!!''

''آج شام میں اس کی رپورٹ مل جائے گی.....اگر خنجر پر سے کوئی نشانات نہ ملے تو ہم پھر مکمل اندھیرے میں ہوں گے۔''

''تو کیا قاتل کا پتا لگانا ممکن نہ ہوگا؟''

''یہ بات نہیں ہے.....'' انسپکٹر تنویر جلدی سے بولا۔''جرم کبھی چھپ نہیں سکتا.....لیکن۔''

''لیکن کیا.....؟'' نادر نے اسے گھورا۔

نادر نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔پھر چند لمحوں بعد وہ بولا۔

''کچھ عرصے قبل حویلی سے جو واقعات جڑے تھے، ان کی روشنی میں تو سب کچھ ممکن ہے.....''

''اچھا.....!!''

''جی ہاں..... یہ محض اتفاق ہے کہ اس دوران آپ لوگوں کی طرح میں بھی قصبے میں موجود نہیں تھا..... لیکن جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے..... وہ ناقابلِ یقین اور حیرت انگیز ہے.....!!''

''مطلب کہ تمہیں اس پر یقین نہیں ہے.....؟'' نادر مسکرایا۔

''واقعی نہ ہوتا.....'' اس نے سر ہلایا۔ ''اگر مجھے یہ سب قصبے کے اس فرد نے نہ بتایا ہوتا کہ جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔''

''کون.....؟''

''میرا ماموں.....'' انسپکٹر تنویر بولا۔ ''میں یہاں اسی کے گھر میں رہتا ہوں..... وہ بھی افواہوں اور اڑتی خبروں پر دھیان نہیں دیتا..... اس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا تھا۔''

''اوہ..... اچھا.....!''

''جی ہاں.....!''

''کیا میں ان سے مل سکتا ہوں.....؟''

''بالکل..... وہ فوراً بولا۔ اس میں کیا مضائقہ.....!''

''ٹھیک ہے..... آپ کی چھٹی کب ہوتی ہے؟''

''اسے چھوڑیں.....'' انسپکٹر تنویر بولا۔ ''میں شام کے وقت فنگر پرنٹ کی رپورٹ کے سلسلے میں ایک بار پھر حویلی میں حاضری دوں گا..... آپ اس وقت میرے ساتھ چل سکتے ہیں.....!''

''یہ اچھا ہے.....!'' نادر نے سر ہلایا۔

پھر چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد نادر اٹھ کھڑا ہوا۔

☆.....☆.....☆

اپنے کمرے میں آنے کے بعد نواب انور کے چہرے کے تاثرات ہی بدل چکے تھے۔

ان کی آنکھوں سے پریشانی، الجھن اور تشویش کے ملے جلے تاثرات جھلکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

بار بار ان کی آنکھوں کے سامنے عالی بابا کا چہرہ گھومنے لگتا تھا، اور اس کے ساتھ ہی سارہ بھی۔

ہاں..... اسی کے ایما پر نواب انور نے دعوت کا اہتمام کیا تھا لیکن جو کچھ ہونا تھا۔ اس کا ایک فیصد بھی وہ نہیں تھا۔ کہ جو اس وقت ہوا تھا..... اف عالی بابا کا لرزہ خیز قتل..... نواب انور کے تو سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔

تو پھر..... کیا جو کچھ ہوا تھا اس میں سارہ کا ہاتھ شامل تھا؟ لیکن یہ کس طرح ممکن تھا۔

سارہ کے بیان کے مطابق اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے جس مقصد کے لئے عالی بابا کو یہاں بلایا گیا تھا اس کے تحت تو عالی بابا کو ہلکا سا جھٹکا لگانا مقصود تھا..... یہ تو ہرگز نہیں تھا کہ وہ بے چارہ اپنی جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالی بابا کو کس نے قتل کیا..... کیا خود سارہ نے کیونکہ اس کی عالی بابا سے پرخاش تھی..... اس کے لہجے سے ہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ عالی بابا اور اس کے گرد و پیش کے لوگ اس کے لئے شدید نفرت انگیز ہیں۔

بہر حال اب سارہ سے ملنا بہت ضروری تھا..... لیکن اب اپنے طور پر اسے کسی ملازم کے ہاتھوں بلوا لینا بھی درست نہ تھا..... حویلی تو کافی بڑی تھی۔ سو اسے یہاں ڈھونڈتے پھرنا بھی مناسب نہ تھا۔

کافی دیر تک اس موضوع پر سوچنے کے بعد نواب انور نے فیصلہ کیا۔ اگر آج رات میں سارہ ان سے نہ ملی، تو وہ دلاور سے ضرور اس کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

ہاں..... یہ ضروری تھا.....

☆.....☆.....☆

ہر کوئی اپنی اپنی سوچوں میں گم تھا اور شام کی چائے ان کے سامنے رکھی ہوئی اب ٹھنڈی ہونے لگی تھی۔

خلاف توقع کافی دنوں کے مسلسل حبس اور شدید

گرمی کے بعد آج موسم آچانک ہی خوش گوار ہو گیا تھا۔ شاید گردونواح میں بارشوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

ہوا کا رخ اسی جانب تھا اور درختوں کے سائیں سائیں کے درمیان سیما کے ماتھے کی بار بار الجھنے والی لٹ بھی کافی قابل دید تھی۔ وہ ہر بار اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے انہیں اوپر کرتی اور ہوا کی شوخ لہر انہیں دوبارہ چہرے پر بکھیر دیتی تھی۔

نادر نے اسی وقت ایک طویل سانس کھینچی جو کہ کافی بلند بانگ تھی۔

عین اسی دم ملازم فرید نمودار ہوا اور بولا۔

''صاحب..... انسپکٹر صاحب حاضر ہوئے ہیں.....!''

نادر نے نواب انور کی طرف دیکھا اور پھر کھنکھارتے ہوئے بولا۔

''انہیں ادھر ہی لے آؤ۔''

''کیا میں اندر چلی جاؤں.....؟'' سیما نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

نادر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سیما خاموشی سے وہاں سے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہی انسپکٹر تنویر آتا دکھائی دیا..... وہ فرید کے ہمراہ تھا..... نادر نے فرید کو آواز دی۔

یہ چائے لے جاؤ اور دوسری لے آؤ..... کچھ ناشتہ وغیرہ بھی لے آنا۔

''ارے کیوں تکلف کرتے ہیں.....'' انسپکٹر نے لجاجت سے بولا۔

ہم نے بھی ابھی چائے نہیں پی.....'' نادر نے جواب دیا۔

انسپکٹر تنویر کے ہاتھ میں ایک فائل موجود تھی..... جسے وہ بار بار اپنے ہاتھوں پر تھپتھپا رہا تھا۔''

''کیا ہوا انسپکٹر..... کچھ سراغ ملا.....؟'' نواب انور نے پوچھا۔

''جی ہاں..... ایک اہم بات سامنے آ گئی ہے.....''

''اچھا..... وہ کیا.....؟''

''خنجر سے انگلیوں کے نشانات مل گئے ہیں.....'' انسپکٹر تنویر کا لہجہ ڈرامائی تھا۔''اور مجھے امید ہے کہ اس کی بدولت جلد ہی قاتل کا سراغ مل جائے گا۔''

☆.....☆.....☆

تھوڑی دیر کی خاموشی رہی پھر نادر نے پوچھا۔

''کیا یہ نشانات قاتل کی انگلیوں کے ہوں گے.....؟ مطلب یہ ہے کہ اس خنجر کو تو نہ جانے کتنے ہاتھوں نے چھوا ہوگا.....!''

''میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ گیا ہوں.....'' انسپکٹر تنویر نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔''اور اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں تازہ انگلیوں کے نشانات سے غرض تھی..... جو کہ ہاتھ کی گرفت کی بدولت کافی واضح دکھائی دیئے ہیں..... کیونکہ موقعہ واردات پر اس نے کافی طاقت کا زور بھی صرف کیا ہوگا۔''

''یہ بات تو ہے.....!!'' نواب انور نے سر ہلایا۔

اسی وقت فرید چائے لے کر آ گیا..... اس نے سب کو چائے پیش کی اور بسکٹوں کے ساتھ سینڈوچ کی پلیٹیں میز پر سجا کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

انسپکٹر تنویر نے فوراً ہی سینڈوچ پر ہاتھ صاف کیا تھا..... نواب انور پھر بولے۔

''اب کیا کرنا ہے.....؟''

''میرے پاس ان تمام لوگوں کی لسٹ موجود ہے جو آپ کی حویلی کے اس کمرہ واردات میں اس وقت موجود تھے.....!''

''اچھا.....!!''

''جی ہاں..... اب وہ نشانات میچ کئے جائیں گے.....!''

''کیا میں اس پروگرام کا حصہ بن سکتا ہوں؟'' نادر نے کچھ سوچ کر کہا۔

''میں سمجھا نہیں.....!!''

''ان تمام لوگوں کو حویلی میں ہی بلایا جائے.....

!!'' نادر نے مشورہ دیا۔ اس طرح یہ کام بھی آسان ہو جائے گا۔

یہ کہہ کر وہ نواب انور کی طرف مڑا۔

''کیا خیال ہے ابو جان؟''

''ہاں..... بالکل.....!!'' وہ فوراً بولے۔''اس میں میرا اعتراض کیوں ہوگا بھلا۔''

''یہ تو اچھی بھات ہے.....'' انسپکٹر تنویر خوش ہو کر بولا۔''آپ لوگ قانون کے کام میں آسانی کریں گے۔''

''بس تو پھر یہ بات ڈن ہوگئی۔ نادر گرم جوشی سے بولا۔

کل ان سب لوگوں کو یہاں بلوایا جائے گا اور ان ہی میں سے قاتل کو گرفتار کیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے جناب.....'' انسپکٹر تنویر سر ہلا کر بولا۔''میں کل صبح حاضر ہو جاؤں گا۔''

''ہاں..... یہ مناسب ہے.....'' نواب انور بولے۔''آپ یہ لسٹ میرے حوالے کر دینا۔ میں سب کو بلوالوں گا۔''

☆.....☆.....☆

نواب انور۔ز آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا، راہداری خالی پڑی تھی۔

رات کے اس پہر یوں بھی سب لوگ نیند میں محو ہوتے ہیں..... اور ابھی تازہ تازہ معاملہ عالی بابا کا بھی تھا۔ جس کی وجہ سے دبے دبے سے خوف و ہراس نے ہر ایک کو اپنی جگہ دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ حویلی کئی اطراف سے اندھیرے اور سناٹے کی زد میں تھی۔

نواب انور نے کمرے سے باہر قدم رکھ دیا..... اتنے سناٹے میں بھی وہ کافی احتیاط سے کام لے رہے تھے۔

وہ سارہ کی تلاش میں نکلے تھے۔ اور ان کا رخ باغیچے کی طرف تھا۔ سارہ اپنے مخصوص وقت میں اس باغیچے میں ان سے کئی بار ملاقات کر چکی تھی۔ عالی بابا کے متعلق اس نے جو مشورہ انہیں دیا تھا..... اس کی تفصیل بھی سارہ نے انہیں باغیچے میں بیٹھ کر ہی بتائی تھی.....

نواب انور نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر وہ اب یہاں بھی نہ ملی تو اس کے بارے میں وہ دلاور سے معلوم کریں گے۔ ہاں اب یہی کرنا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ باغیچے میں داخل ہو چکے تھے..... چاروں طرف خوابناک موسم اٹکھیلیاں کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا..... ہوا کی تازگی اور ٹھنڈک ماحول کے سات ساتھ خود نواب انور کو سانسیں معطر کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

چاند کی دودھیا روشنی چاروں طرف پھیل کر گویا آسمان سے اترنے والی پریوں کا انتظار کر رہی تھی۔

نواب انور کے دل میں خود ہی ارمان جاگنے لگے۔ انہوں نے بے چینی سے چاروں طرف دیکھا۔ اور پھر مایوسی ان کے رگ و پے میں سرائیت کرنے لگی۔

سارہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اوہ اس کا مطلب یہ تھا کہ حویلی میں ہونے والے حادثے میں کہیں نہ کہیں ضرور اسی کا ہاتھ تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ مایوس ہو کر مڑے ہی تھے کہ ایک آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

''نواب صاحب.....!!''

☆.....☆.....☆

نہ جانے کیوں ان دونوں کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔

نادر نے ایک طویل انگڑائی لی اور بولا۔

''یار..... کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ عالی بابا کو نہ جانے کس نے قتل کیا ہے۔''

''جی ہاں..... وہ بے چارے کتنے اچھے تھے.....!!'' سیمانے سرد آہ بھری۔

پھر وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھی اور اس کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی۔

نادر بیڈ پر نیم دراز تھا۔ اس نے کہا۔

''واقعی..... وہ ایک نفیس انسان تھے..... ان کی

موت نے کئی لوگوں کو افسردہ کر دیا ہے۔''

عین اسی وقت سارہ کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ نادر فوراً ہی بولا۔

''کیا ہوا.....؟''

ساتھ ہی وہ بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اب وہ سیما کے قریب آچکا تھا اس نے دیکھا سیما کے چہرے پر قدرے حیرت کے آثار تھے۔

''بولو..... کیا ہوا.....؟''

''پہلے تو میں ڈر گئی تھی۔ سیما پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ لیکن پھر بعد میں غور کیا تو مجھے معلوم ہو گیا۔''

''ارے تو بتاؤ نا..... کیا معلوم ہوا.....؟''

''میں نے کسی کو باغیچے میں جاتے ہوئے دیکھا تو میں ڈر سی گئی۔ پھر غور کیا تو پتا چلا کہ وہ ابو جان تھے۔''

''ابو جان.....'' نادر نے حیرت سے دہرایا۔

''رات کے اس پہر وہ وہاں کیا کر رہے ہیں.....؟''

''پتا نہیں.....'' سیما بڑبڑائی۔ ''وہ بھی عالی بابا کی اچانک موت سے پریشان ہوں گے..... اور.....''

''اور کیا.....؟''

''اور تنہائی بھی بڑی ظالم ہوتی ہے.....'' سیما آہستہ سے بولی۔

نادر نے اسے گھور کر دیکھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا.....؟''

''غلط نہ سمجھیں.....'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہر انسان اپنے دل کی باتیں کسی سے کہہ کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے اگر امی جان زندہ ہوتیں تو کیا آج ابو جان رات کے اس پہر اس طرح بھٹکتے پھرتے.....؟''

''ہاں..... یہ تو ہے.....!!'' نادر نے سر ہلایا۔ ''لیکن جولڑکی تم نے ان کے لئے پسند کی ہے اس کا تو.....''

''ارے.....!!'' دفعتاً سیما کی ہلکی سی چیخ نے اس کی بات کاٹ دی۔

نادر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا.....؟''

''وہ..... وہ.....!'' سیما ہکلا کر رہ گئی۔

نادر اس کی طرف جھپٹا۔

''بتاؤ..... کیا ہوا.....؟''

''میں نے کسی اور کو بھی..... باغیچے میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔'' سیما بولی۔

''اس وقت اور کون ہو سکتا ہے۔'' نادر بڑبڑایا۔

پھر وہ چونک کر بولا۔

''تمہاری نظروں نے دھوکا تو نہیں کھایا.....؟''

''کیا بات کر رہے ہیں.....'' سیما بولی۔ ''میں نے صاف طور پر کسی اور کو بھی جاتے دیکھا ہے۔''

''اچھا..... میں دیکھتا ہوں.....!!''

''آپ اکیلے مت جائیں.....'' سیما بھی لپکی۔ ''میں بھی چل رہی ہوں.....!!''

''تم اتنی ڈرپوک ہو..... ادھر ہی رکو۔''

''آپ ساتھ ہیں تو ڈر کیسا.....'' سیما بولی۔ ''میں بھی چلوں گی۔''

☆.....☆.....☆

یہ کافی بھاری بھرکم اور غیر مانوس آواز تھی۔ وہ فوراً ہی پلٹے اور حیرت زدہ رہ گئے۔

ان کے سامنے سارہ کھڑی ہوئی کافی شوخ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

''یہ..... یہ تمہاری آواز تھی؟'' ان کے منہ سے نکلا۔

''جی نواب صاحب.....!'' وہ اصل آواز میں بولی۔ ''میں اس کام میں کافی ماہر ہوں۔ اکثر لوگوں کے لہجے کی نقل بھی اتار لیتی ہوں.....''

''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔''

''ارے..... آپ تو ابھی سے ڈر گئے.....!!''

وہ عجیب سے انداز میں ہنس کر بولی۔

''ابھی تو میں نے صرف آواز ہی بدلی ہے۔''

''تو اور کیا کیا بدل سکتی ہو؟''

یہ سن کر سارہ زور سے ہنسی اور بولی۔

''مجھے غصہ آتا ہے تو میں یکسر بدل کر رہ جاتی ہوں.....''

''اوہ.....کیا گالیاں دیتی ہوں.....''

''اس سے بھی کچھ زیادہ.....'' وہ بولی۔''یوں سمجھ لیں کہ میں غصے میں پاگل ہو جاتی ہوں.....''

''یہ تو کافی فکر انگیز بات ہے.....'' وہ سر ہلا کر بولے۔''اس کا مطلب یہ ہوا کہ شادی کے بعد.....میں ایسا کوئی کام نہ کروں مجھ پر تم کو غصہ آئے۔''

''نہیں.....وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔آپ تو میرے سرتاج ہوگے.....مجھے آپ پر کیوں غصہ آئے گا۔''

''اچھا.....چلو.....اب ایک بات بتاؤ.....''

''جی.....!!''

''عالی بابا کا قتل ہو گیا ہے.....''

''میں جانتی ہوں.....'' وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔''خس کم جہاں پاک.....لیکن مجھے حیرت ہے.....''

''کس بات پر؟''

''اسے کس نے قتل کیا.....'' وہ بولی۔''میں تو اسے جیل کی ہوا کھلانا چاہتی تھی.....''

''میں نے آپ سے یہی کہا تھا نا کہ آپ کسی بہانے سے اسے اپنے گھر میں بلا لیں.....میں موقع دیکھ کر حویلی کی کوئی قیمتی چیز اس کی جیب میں ڈال دیتی اور پھر چپکے سے آپ کو بتا دیتی وہ چیز اس کی جیب سے نکلتی اور آپ رنگے ہاتھوں اس کو پولیس کے حوالے کر دیتے۔''

''ہوں.....لیکن یہ کام بھی تو آسان نہ تھا۔'' وہ بولے۔''تم کس طرح کر لیتیں۔''

''یہ میرا کام ہوتا.....'' وہ لاپروائی سے بولی۔

''میں بہت سے کاموں کی ماہر ہوں.....خیر اب تو وہ دنیا سے ہی چلا گیا.....اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے قتل میں تمہارا ہاتھ شامل نہیں۔''

''میں بھلا اسے کیوں ماروں گی.....؟'' وہ بولی۔''اگر مجھے یہ کام کرنا ہوتا تو میں اب تک کیوں انتظار کرتی.....اس کے غلط کرتوتوں کی سزا اسے موقع پر ہی مل جاتی۔''

''ہوں.....!'' وہ کسی سوچ میں ڈوب گئے۔

اچانک ہی سارہ نے بے چین ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔

''کیا ہوا.....؟'' نواب صاحب چونک کر بولے۔

''کوئی آ رہا ہے.....؟''

''کیا مطلب.....؟''

''ہاں.....میں محسوس کر رہی ہوں کہ کوئی باغیچے کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔اور وہ ایک سے زائد انسان بھی ہو سکتے ہیں.....''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا.....؟''

وہ مسکرا کر بولی۔

''میرے کان بہت تیز ہیں.....کافی دور کی آوازوں کو بھی فوراً ہی محسوس کر لیتے ہیں.....اب میں جا رہی ہوں.....''

''کب ملو گی.....؟''

''میں یہاں آتی رہوں گی.....!!'' اس نے پلٹے بغیر جواب دیا۔''یوں بھی مجھے آپ کے ذریعے معلوم ہو گا کہ بوڑھے عالی کو کس نے قتل کیا تھا۔''

''کیا تم اسی وقت آیا کرو گی؟''

''ہاں.....یہ بہترین وقت ہوتا ہے.....'' وہ بولی۔''مجھے بھی فرصت ہوتی ہے اور آپ کو بھی.....''

یہ کہہ کر وہ دوبارہ درختوں کی اوٹ میں جا کر غائب ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ دونوں دبے پاؤں باہر نکل آئے تھے سیما نے مضبوطی سے نادر کا ہاتھ تھاما ہوا تھا اور وہ تقریباً اس سے لپٹنے کے انداز میں چپک کر آگے بڑھ رہی تھی۔

''دیکھا.....تم ڈر رہی ہو نا؟'' نادر ہنس کر بولا۔

''نن.....نہیں.....تو.....!'' وہ ہکلا گئی۔

''میں اکیلی وہاں کیا کروں گی.....'' وہ بولی.....

''وہاں تو اور بھی ڈر لگے گا.....''

''ہاں.....یہ بات بھی ہے.....!!''

''جلد ہی وہ حویلی کے کھلے حصے میں آ گئے۔ تیز ہواؤں کے جھونکے ان کے جسموں سے ٹکرا رہے تھے۔''

ایسے میں نادر نے اس کے پہلو میں زور سے چٹکی بھری۔

''یہ کیا کر رہے ہیں؟'' وہ تڑپ کر بولی۔

''تمہارا ڈر ختم کر رہا ہوں.....!!''

''اس طرح.....؟''

''ہاں..... جب تمہیں تکلیف ہو گی۔ تو تمہارا ذہن اس طرف مائل ہو جائے گا۔''

''تو پھر ایسا کریں کہ جوتا اتاریں اور شروع ہو جائیں.....اس سے ڈر واقعی ختم ہونے کا امکان ہے۔''

نادر پھر ہنسا اور بولا۔

''یہ تو ظلم ہو گا..... میری بیوی تو اتنی نازک اندام ہے۔''

''وہ.....آپ یہ بھی جانتے ہیں.....!''

''شش.....'' دفعتاً نادر نے اشارہ کیا۔

ساتھ ہی وہ سیما کو گھسیٹ کر ایک گھنے پیڑ کی آڑ میں دبک گیا.....بس ایک ہیولہ سا تھا۔ جو باغیچے سے بر آمد ہو کر اندھیرے کا حصہ بن گیا تھا۔ اب اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کس طرف گیا ہو گا۔

''یہی تھا نادر.....! سیما کانپ سی گئی۔'' وہ یہی ہیولہ تھا۔'' اف خدا.....نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گئی تھی۔''

''ہوں.....'' نادر آہستہ سے بولا۔'' مجھے بھی سمجھ نہیں آیا کہ وہ کون تھا.....خیر..... آؤ..... ابو جان کو دیکھتے ہیں.....!!''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ نواب انور دکھائی دیئے ان دونوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رک گئے۔

''تم.....یہاں.....؟''

''جی ہاں.....'' نادر بولا۔'' سیما نے آپ کو اس طرف آتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہم نے سوچا کہ ذرا ہم بھی چہل قدمی کر لیں.....!!''

''آئندہ ایسی غلطی مت کرنا۔'' نواب انور کا لہجہ خشک تھا۔'' حالات کچھ بہتر نہیں ہیں..... خاص طور پر رات کے وقت دروازے اور کھڑکیاں بند رکھو۔''

''ادھر آنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔'' نادر نے کہا۔

''وہ کیا.....؟''

''ہم نے آپ کے تعاقب میں کسی کو آتے ہوئے دیکھا تھا.....''

''تعاقب میں؟''

''جی ہاں.....!!''

نواب انور ہنس پڑے اور بولے۔

''ضرور تم دونوں کا وہم ہے..... ارے بھئی یہاں کوئی نہیں ہے۔''

''لیکن وہم تو صرف ایک کو ہو سکتا ہے.....''

''ضروری نہیں ہے۔'' نواب انور ضد بھرے انداز میں بولے۔'' حویلی کچھ ایسے ہی حالات کا شکار ہے کہ بعض اوقات توہمین کی پراگندگی آنکھوں کے سامنے آ کر کوئی خاکہ بن جاتی ہے.....اب تم لوگ جاؤ اور میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سکون سے سو رہو.....جاؤ.....''

نادر اور سیما ایک دوسرے کی شکل ہی دیکھتے رہ گئے۔ نواب انور کا یہ رویہ بالکل نیا تھا۔ آج سے قبل انہوں نے کبھی اس طرح ان لوگوں کو مخاطب نہیں کیا تھا۔

نادر نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔

''چلو سیما.....اب رات کے وقت کمرے سے نکلنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے چاہے کچھ بھی ہو.....!!''

یہ کہہ کر اس نے سیما کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن صبح ناشتے کی میز پر کافی خاموشی تھی.....خاص طور پر نادر کا منہ پھولا ہوا تھا۔

نواب انور بار بار اسی کی طرف دیکھ رہے تھے..... سیما بھی سر جھکائے ہوئے ناشتے میں مصروف تھی۔

دفعتاً نواب انور بولے۔

''میں اپنے رات کے رویے پر نادم ہوں۔ میں نے کچھ اچھا نہیں کیا۔''

''ارے نہیں ابو جان.....!'' سیما جلدی سے بولی۔''ایسی کوئی بات نہیں ہے..... آپ بھی تو حالات کی بناء پر پریشان ہیں..... ایسے میں ہوجاتا ہے۔''

''ہاں..... بس مجھے بعد میں افسوس ہوا تھا.....!''

نادر اب بھی خاموش تھا۔ پھر نواب انور اس کی طرف گھومے۔

''نادر.....!''

''جی ابو جان.....''

''کیا تم اب بھی خفا ہو.....؟''

''جی نہیں.....''

''بیٹا ذرا عالی بابا کے قاتل کو گرفتار ہو جانے دو..... اس کے بعد ایک پروگرام طے کریں گے۔''

''جی..... کیسا پروگرام.....؟''

''یہاں سے کچھ فاصلے پر ہانسی جھیل ہے۔ وہاں پر مچھلی کے شکار کا پروگرام بنائیں گے..... میں نے تو سوچا تھا کہ حویلی میں ذرا رونق میلہ ہو جائے۔ لیکن عالی بابا کی موت نے حویلی کو مزید اداس اور سنسان کر دیا۔''

''ٹھیک ہے ابو جان.....'' نادر نے سر ہلایا۔'' میں نے بھی ہانسی جھیل کے بارے میں کافی سنا تھا۔ کافی اچھا رہے گا۔''

''ٹھیک ہے.....'' نواب انور نے سر ہلایا۔

اسی وقت دلاور نے آ کر کہا۔

''انسپکٹر صاحب آئے ہیں.....

''انہیں مہمان خانے میں بٹھاؤ اور ان کی تواضع کرو۔'' نادر نے کہا۔''ہم آ رہے ہیں۔''

☆.....☆.....☆

انسپکٹر تنویر کے ساتھ فنگر پرنٹ کے 2 ماہر بھی موجود تھے۔ جنہیں شہر سے بلوایا گیا تھا۔

ہال نما کمرے میں تفتیش کا پروگرام رکھنے کی تجویز طے پائی تھی اور پھر حویلی کے ملازموں کے ذریعے ان لوگوں کو بلوایا گیا..... جو کہ اس وقت موقعہ واردات پر موجود تھے۔

ایک گھنٹے کے اندر ہی اندر سب لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں صرف بوڑھا کمال پاشا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ شاید ابھی پہنچا نہیں تھا۔

نواب انور اور نادر بھی وہاں موجود تھے۔ سب سے پہلے نادر نے خود کو پیش کر دیا۔

''آپ لوگ پہلے میری جانچ پڑتال کریں۔ ممکن ہے کہ اتنے لوگوں میں سے کسی کو یہ سب ناگوار محسوس ہو رہا ہو۔ لیکن قانون کی مدد کرنا ہر ایک کی ذمہ داری ہے.....!''

انسپکٹر تنویر کے ساتھ آنے والوں نے ستائشی انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر جانچ کا عمل شروع ہو گیا۔

ایک گھنٹے کے اندر سب ہی اس عمل سے گزر چکے تھے۔ اور اب نتیجے کا انتظار تھا۔

دونوں ماہرین انسپکٹر تنویر کو ایک طرف لے جا کر دھیمے انداز میں کچھ دیر تک بات چیت کرتے رہے۔

پھر انسپکٹر تنویر نے نواب انور کی طرف دیکھا اور ایک طویل سانس لے کر بولا۔

''یہاں پر موجود کسی بھی شخص کی انگلیوں کے نشانات قاتل کو ثابت نہیں کر رہے.....''

''کیا مطلب.....؟'' کئی لوگوں کے منہ سے نکلا۔

''ہاں.....!!'' انسپکٹر تنویر نے سر ہلایا۔''خنجر پر ان میں سے کسی کا بھی ہاتھ نہیں لگا۔''

''تو پھر.....؟'' نواب انور کے منہ سے نکلا۔

''اب ایک ہی شخص رہ گیا ہے جو یہاں موجود نہیں ہے.....!'' انسپکٹر تنویر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''تمہارا مطلب بوڑھا کمال پاشا.....!''

''جی ہاں.....!'' اس نے سر ہلایا۔ ''ظاہر ہے کہ اب وہی صاحب رہ گئے ہیں.....!''

''حیرت ہے.....کمال ہے.....!!'' نواب انور بڑبڑائے۔

ہال میں اب چہ مگوئیاں شروع ہوگئی تھیں..... یوں جیسے اچانک ہی کسی میٹھے پکوان پر مکھیوں نے حملہ کر دیا ہو اور اب ان کی بھنبھناہٹ کا راج ہو۔

چنانچہ انسپکٹر تنویر نے بلند آواز میں کہا۔

''آپ لوگ جا سکتے ہیں.....!! اب یہاں کسی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ آپ کی آمد کا شکریہ۔''

تھوڑی دیر کمرہ خالی ہو گیا تھا..... اب وہاں صرف ماہرین انسپکٹر تنویر نواب انور اور نادر موجود تھے۔

اب انسپکٹر تنویر نے نواب انور کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب آخری فرد کو بھی بلا لیا جائے۔''

''ہاں.....میں کسی کو بھیجتا ہوں.....!'' نواب انور نے تھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

پھر ایک ملازم کو کمال پاشا کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ اب صرف انتظار باقی تھا۔ چنانچہ چائے منگوائی گئی۔

اس دوران انسپکٹر تنویر نے کہا۔

وہ بوڑھا شخص تو اس وقت میری آنکھوں کے سامنے موجود رہا تھا.....اور میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں رعشہ طاری تھا.....تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ عمر کے اس حصے میں اس نے یہ ہولناک قدم اٹھایا ہوگا۔

یہ سوال واقعی غور طلب تھا۔ نواب انور سر ہلا کر بولے۔

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب اس کے علاوہ کون رہ گیا.....؟''

''کوئی بھی نہیں.....!!'' نادر نے سنجیدگی سے لقمہ دیا۔

''تو پھر.....''

''جی ہاں۔ یہ بات ہے۔'' انسپکٹر تنویر نے سر ہلایا۔ ''خیر اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے.....''

چائے کا دور چلا ہی تھا کہ ملازم نے اطلاع دی۔

''وہ یہاں آنے سے معذور ہیں.....''

''مگر کیوں.....؟'' انسپکٹر تنویر نے اسے گھورا۔

''وہ سخت بیمار ہیں.....جواب ملا۔

''اوہ.....!'' انسپکٹر تنویر کا لہجہ معنی خیز تھا۔

پھر اس نے نواب انور کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس کے گھر میں تمہیں خود جانا پڑے گا..... یہ کسی قسم کی بہانے بازی بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے اب لگ رہا ہے کہ وہی قاتل ہے.....''

☆.....☆.....☆

انسپکٹر تنویر کے یہ الفاظ کافی سنسنی خیز تھے۔ ہر کوئی اب اسی بارے میں سوچنے پر مجبور تھا کہ بوڑھے کمال پاشا نے اتنی سفاکی اور مہارت سے کس بناء پر عالی بابا کو قتل کیا تھا۔

کیا کوئی ذاتی دشمنی تھی.....؟ یا پھر.....اس کے پس پردہ کوئی ایسا راز تھا کہ جس سے پردہ اٹھنا باقی تھا۔

ایک بار پھر چھوٹا سا گروپ اکٹھا ہوا۔ اور ان کا رخ کمال پاشا کے گھر کی طرف ہو گیا۔

دروازے پر دیئے جانے والی دستک کے جواب میں ایک ادھیڑ عمل کی عورت نے دروازہ کھولا تھا۔

ایک پولیس والے سمیت اتنے لوگوں کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سی گئی تھی۔

وہ سوالیہ الجھن آمیز نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر انسپکٹر تنویر آگے بڑھا۔

''یہ گھر کمال پاشا کا ہے.....؟''

''جی ہاں.....''

''ہمیں ان سے فوری طور پر ملنا ہے۔'' اس نے بارعب لہجے میں کہا۔ ''ضروری کام ہے۔''

''اوہ.....لیکن وہ تو سخت بیمار ہیں.....!''

''اچھا.....تو پھر ہم ہی ان تک پہنچ جاتے ہیں۔''

''وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''کیا ہم اندر آ سکتے ہیں.....؟''

جواباً عورت نے ایک طرف پلٹ کر خاموشی سے انہیں راستہ دیا اندر داخل ہوتے وقت انسپکٹر تنویر نے عورت سے پوچھا۔

''آپ ان کی بیگم ہیں.....؟''

''جی ہاں.....میرا نام کرن ہے.....''

''ہوں.....کیا بچے ہیں آپ کے؟''

''نہیں.....!'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''اوہ.....! اس کے منہ سے نکلا۔ شادی کو کتنا عرصہ گزرا ہے؟''

''صرف چار سال.....!''

انسپکٹر تنویر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''لیکن آپ دونوں کی عمریں تو.....''

''ہاں.....!'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں.....دراصل ہم دونوں ہی اپنے جیون ساتھیوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں اور اب زندگی کا بقیہ حصہ صرف ساتھ نبھانے کے لئے ایک دوسرے سے جڑے ہیں۔''

''اوہ.....اچھا.....!''

''آپ لوگ ان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟'' کرن نامی عورت نے سوال کیا تھا۔

''ابھی بتا دیتا ہوں..... وہ ہیں کہاں.....؟''

''سامنے والے کمرے میں.....'' کرن نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

کمال پاشا واقعی کافی بیماری کی حالت میں دکھائی دے دیا۔ وہ جاگ رہا تھا اور اس کی آنکھیں چھت کو گھو رہی تھیں۔

نواب انور نے نوٹ کیا کہ اس دن کمال پاشا کی آنکھوں میں جو توانائی کی چمک نظر آ رہی تھی۔ اب دور دور تک اس چمک کا نام ونشان تک نہ تھا.....ہاں.....یہ تو وہ آنکھیں تھیں.....جن میں عمر کے ڈھلنے کا دکھ..... کچلے ہوئے اعصاب اور دل کی ٹوٹ جانے والی امیدوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

ان لوگوں کو دیکھ کر کمال پاشا نے اٹھنے کی کوشش کی تو نواب انور فوراً بولے۔

''لیٹے رہیں.....''

کمال پاشا نے دیوار سے ٹیک لگا لی اور کمزوری آواز میں بولا۔

''آپ لوگ کیوں آئے ہیں؟ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟''

''ہمیں تمہارے ہاتھوں کا عکس چاہئے۔''

''ہاتھوں کا عکس.....؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''وہ کس لئے.....؟''

دونوں ماہرین نے آگے بڑھ کر اپنا کام شروع کر دیا۔ بوڑھا کمال پاشا کافی حیرت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

''حویلی میں عالی بابا کا قتل ہو گیا ہے۔'' انسپکٹر تنویر نے اسے غور سے دیکھا۔ یہ اس دن کی بات ہے ..... جب آپ بھی اس دعوت میں شریک تھے.....کیا بھول گئے.....؟''

''دعوت.....کیسی دعوت.....؟'' بوڑھے کمال پاشا کی حیرت اور بڑھتی جا رہی تھی۔

''لو بھئی.....!!'' انسپکٹر تنویر گھوما۔ ''انہیں تو دعوت بھی یاد نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہی نہیں تو پھر یاد کیسے رکھوں گا.....!''

''کیا تم اس دعوت میں شریک نہیں تھے؟'' انسپکٹر تنویر کا لہجہ تیز تھا۔

''میں تو مہینہ بھر سے بستر پر ہوں جناب.....!'' وہ بولا۔

''میں نے تو اتنے دنوں سے گلی کی صورت بھی نہیں دیکھی اور آپ دعوت کی باتیں کر رہے ہیں۔''

انسپکٹر تنویر غصے کے عالم میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عین اسی وقت فنگر پرنٹ کے ماہر نے اطلاع دی۔

''خنجر پر اسی ہاتھ کا نشان موجود ہے.....! یہی ہے وہ شخص جس نے قتل کیا ہے.....!''

(جاری ہے)

قلعے کا بھوت

مریم فاطمہ۔کراچی

لڑکی نے جھٹ چھری اٹھائی اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی، چھری کا رخ نوجوان کی طرف تھا کہ نوجوان نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا، جسے دیکھ کر لڑکی کے چھکے چھوٹ گئے کہ پھر.....

ایک بھوت کی کارستانی.....رات کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ باہر نکلتا اور لوگوں کو دبوچ لیتا

آلیور اور مائیکل بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ ان کے سامنے انسپکٹر کیون بیٹھا تھا۔

''آلیوراور سناؤ گھر میں سب خیریت ہے ناں۔''

کیون۔''ہاں سب ٹھیک ہے۔لیکن میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں آلیور۔''

''ہاں بتاؤ۔''آلیور بولا۔

کیون۔''یہاں سے دور دراز علاقے میں ایک قلعہ ہے کئی سو سال پرانا۔اس کے مالک اسے کرائے پر دیتے ہیں۔یعنی ایک طرح سے وہ ہوٹل کا کام دیتا ہے۔اس میں کئی کمرے ہیں۔وہاں ڈائننگ ہال بھی ہے سب کھانا کھاتے ہیں۔ایک لائبریری بھی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قلعے میں آسیب ہے۔اس سلسلے میں تمہاری مدد چاہیے۔''

آلیور۔''اگر آسیب ہے تو کسی پادری کے پاس

جاؤ میرے پاس کیوں آئے ہو۔"

کیون۔" تم شاید سمجھے نہیں وہاں ایک لڑکی کا قتل ہوا تھا۔ اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی تھی۔ تیسری منزل سے۔ تفتیش سے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی زور زبردستی نہیں کی گئی۔ اس نے خود سے چھلانگ لگائی تھی۔"

آلیور۔" تو پھر یہ قتل تو نہ ہوا یہ تو خودکشی ہوئی۔"

کیون۔" نہیں اس لڑکی کے ماں باپ کا کہنا ہے کہ قلعے کے بھوتوں کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے۔ سب انہیں پاگل سمجھ رہے ہیں۔ پولیس بھی ان کی بات پر یقین نہیں کر رہی۔ انہوں نے مجھ سے مدد مانگی ہے۔ اور میں تمہارے پاس چلا آیا۔ وہ لڑکی شادی شدہ تھی وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں تھی۔ اپنی عمر سے کم لڑکیوں والی حرکتیں تھیں اس کی۔ اس کے ماں باپ بہت امیر ہیں اور انہوں نے اپنی ساری جائیداد اپنی بیٹی کے نام کر رکھی تھی۔ اور ہاں ایک بات اور اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔ اس لڑکی نے یہ وصیت بنائی تھی کہ اگر اسے کچھ ہو جاتا ہے تو اس کی ساری جائیداد اس کی بیٹی کو ملے گی اور اگر اسے بھی کچھ ہو گیا تو اس کا شوہر اس ساری جائیداد کا مالک ہوگا۔"

آلیور۔" لیکن جب لوگ جانتے ہیں کہ وہ قلعہ آسیبی ہے تو وہاں جاتے کیوں ہیں۔"

کیون۔" کیونکہ یہ لوگوں کے لئے تفریح کی جگہ بن گئی ہے لوگ یہاں مزا اڑانے آتے ہیں۔"

مائیکل۔" کیا پاگل پن ہے۔ ویسے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس لڑکی کی موت کا ذمے دار اس کا شوہر ہو۔ اس نے اپنی بیوی کا قتل کیا ہو۔ تاکہ جائیداد مل سکے۔ ویسے بھی کوئی ایسی لڑکی سے کوئی کیوں شادی کرے گا جو نارمل نہ ہو۔ اور اب شاید اس کا ارادہ اپنی بیٹی کو مارنے کا ہو۔ ویسے وہ آج کل رہ کہاں رہے ہیں۔"

کیون۔" اسی قلعے میں۔ لیکن بہت جلد وہ یہ قلعہ چھوڑ کر جانے والے ہیں۔"

آلیور۔" ہاں ظاہر ہے وہ ایسی جگہ کیوں رکیں گے جہاں ان کے کسی اپنے کا خون ہوا ہو۔ تو پھر ٹھیک ہے کیون ہم اپنی تفتیش شروع کر دیتے ہیں۔"

مائیکل۔" اور اس کے لئے ہمیں ضرور اس قلعے میں ٹھہرنا ہوگا۔"

آلیور۔" ہاں بالکل، کیون ایک بات تو بتاؤ ان کی بیٹی تو نارمل ہے نا۔ میرا مطلب کہیں اس نے اپنی ماں کی جائیداد حاصل کرنے کے لئے یہ سب نہ کیا ہو۔"

کیون۔" نہیں آلیور۔ ایک تو بچی ویسے ہی بہت چھوٹی ہے۔ صرف سات سال کی اور دوسرے وہ بالکل نارمل ہے۔ ویسے بھی بچی کو ماں کی جدائی کا بہت صدمہ ہے۔"

آلیور۔" ٹھیک ہے کیون پھر میں اور مائیکل وہاں ایک کمرہ کرائے پر لے لیتے ہیں۔ اور وہاں رہ کر معلومات اکٹھی کرتے ہیں۔"

کیون۔" ٹھیک ہے۔"

آلیور اور مائیکل نے فوراً قلعے میں پہنچنے کی تیاری شروع کر دی۔ سردیاں تھیں انہوں نے چند جوڑے گرم کپڑوں کے رکھے۔ اور پھر کیون نے انہیں قلعے تک چھوڑ دیا اور خود واپس چلا گیا۔

ان دونوں نے سب سے پہلے اپنے لیے ایک کمرہ بک کرایا اور پھر وہاں کے مالک سے ملے اور اسے بتایا کہ ہم یہاں اس لڑکی کے قتل کے کیس کی تفتیش کر نے آئے ہیں۔ قلعے کے مالک کا نام اسٹیفن تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ ساٹھ سال ہوگی۔ وہ کمر جھکا کے چلتا تھا۔ لیکن شکل سے بہت ہوشیار لگتا تھا۔ آلیور نے کہا۔" براہ مہربانی دو کپ کافی ہمارے کمرے میں بھجوا دیجئے۔"

اسٹیفن نے بھنویں اچکائیں پھر عیاری سے ہنستے ہوئے بولا۔

" یہاں کھانا پینا کمرے میں نہیں ملتا۔ سب ڈائننگ ہال میں جمع ہو کر کھاتے ہیں۔ شام کی چائے دوپہر کا کھانا ناشتہ رات کا کھانا ان سب کا وقت مقرر ہے۔ اگر زیادہ ہی بھوک لگی ہے تو باہر سے کھالو۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

آلیور۔ ''ٹھیک ہے کوئی بات نہیں ہم شام کو چائے پی لیں گے۔''

مائیکل۔ ''دوپہر کا کھانا کب لگے گا۔ مجھے بھوک لگی ہے۔''

اسٹیفن۔ ''معاف کردو۔ دیر ہوگئی۔ تم لوگ ڈھائی بجے پہنچے ہو کھانا دو بجے ہی لگ گیا تھا۔''

مائیکل۔ آ اچھا چلیں کوئی بات نہیں۔''

آلیور اور مائیکل اپنے کمرے کی چابی لے کر اپنے کمرے میں آئے اور دروازہ لاک کردیا۔

مائیکل۔ ''حد ہوتی ہے یہ ہوٹل ہے یا جیل۔ چائے شام کو ملے گی کھانا پہلے ہی لگ چکا۔ ہم کیا قیدی ہیں۔''

آلیور ہنسنے لگا۔

مائیکل۔ ''ہنسو مت یار میں سنجیدہ ہوں۔''

آلیور۔ ''خیر چھوڑو یہ سب باتیں۔ ہم یہاں اس کیس کو حل کرنے آئے ہیں۔ چلو پہلے تو چل کر اسٹیفن سے ہی کچھ بات چیت کرلی جائے۔'' وہ دونوں اس کے پاس پہنچے وہ اپنے سامنے ایک بڑی سی کتاب رکھے بیٹھا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر چونکا۔

اسٹیفن۔ ''اب تمہیں کیا چاہیے۔ کہا تو ہے کھانا ابھی نہیں مل سکتا باہر سے کھالو۔''

مائیکل۔ ''ہم کھانے کا نہیں کہہ رہے۔ دراصل ہم یہ پوچھنے آئے ہیں کہ کیا جب اس لڑکی کی موت ہوئی تو اس وقت جتنے لوگ یہاں موجود تھے وہ اب بھی یہاں ہیں۔ یا کچھ لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔''

اسٹیفن۔ ''نہیں یہاں سے کوئی بھی نہیں گیا۔ سب یہیں پر رہیں۔ بس اس لڑکی کا شوہر اس قلعے سے بازار گیا تھا کسی کام سے۔''

آلیور۔ ''آپ نے یہاں کبھی کسی بھوت کو دیکھا ہے؟''

اسٹیفن۔ ''بہت بار دیکھا ہے۔ کبھی کوئی لڑکی ہوتی ہے کبھی کوئی لڑکا ہوتا ہے۔ اس نے پرانے زمانے کے کپڑے پہنے ہوتے ہیں۔''

آلیور۔ ''اچھا سمجھ گیا۔ کیا ہم اس سے مل سکتے ہیں جو یہاں پہ کھانا بناتا ہے۔''

اسٹیفن۔ ''ہاں ابھی ملواتا ہوں۔ ریٹا نام ہے اس کا۔ ریٹا یہاں پہ کھانا بناتی ہے۔''

اس نے گھنٹی بجا کر اسے بلایا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت اپنا بھاری بھرکم سراپا لے کر وہاں آئی۔

ریٹا۔ ''اب کیا مصیبت ہے میں رات سے پہلے کسی کے لئے کھانا نہیں بناؤں گی۔''

جغرافیہ

ایک آدمی اپنے دوست کو بتا رہا تھا کہ اس نے دنیا کا ہر شہر دیکھا ہے ہر ملک گھوما ہے دنیا کے ہر حصے میں قیام کیا ہے۔''

ایک آدمی پاس ہی کھڑا یہ سن رہا تھا اس نے کہا۔ ''پھر تو آپ جغرافیہ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔''

پہلے نے جواب دیا۔

''ہاں، ہاں، میں وہاں پورا ایک ہفتہ رہا تھا۔''

صفائی

باپ: ''ہر شخص صفائی کو پسند کرتا ہے۔''

بیٹا: لیکن امی کو صفائی ہرگز پسند نہیں۔''

باپ: ''وہ کیوں؟''

بیٹا: ''آج میں نے الماری میں رکھا حلوہ صاف کی تو امی نے پٹائی کردی۔''

(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈو الہ یار)

اسٹیفن۔ ''اوہو! بے فکر رہو تم سے کھانا بنانے کا کوئی نہیں کہہ رہا ہے۔ یہ لوگ سراغ رسانی کرتے پھر رہے ہیں۔ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

ریٹا۔ ''کیوں! میں نے کیا کر دیا۔ وہ پاگل عورت خود کھڑکی سے کودی تھی۔''

آلیور۔ ''نہیں میرا مطلب ہے کیا آپ اس کے بارے میں کچھ جانتی ہیں۔''

ریٹا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی بے وقوف آدمی میرا کام یہاں پر صرف کھانا بنانا ہے۔''

وہ یہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ آلیور اور مائیکل ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ اسٹیفن دانت نکال کر ہنسنے لگا۔''

اسٹیفن۔ دیکھ لیا اس کے مزاج اب بولو کس سے تفتیش کرنی ہے۔ بلاتا ہوں ابھی۔''

آلیور۔ ''نہیں شکریہ کوئی بات نہیں میں کھانے کے ٹائم پہ سب سے مل لوں گا۔ اور ہاں کھانا کس وقت لگے گا۔''

اسٹیفن۔ ''رات نو بجے۔ اور شام کی چائے چھ بجے۔''

مائیکل۔ ''شکریہ۔''

وہ دونوں واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔

مائیکل۔ ''مجھے نہیں پتا تم اس جگہ کو جیل خانہ کہو گے یا پاگل خانہ تم نے انداز دیکھا ریٹا کے بات کرنے کا۔ وہ ہمیں یونہی گرا پڑا سمجھتی ہے۔''

آلیور۔ ''ہاں تم صحیح کہہ رہے ہو۔ بہر حال یہ لوگ چاہے کچھ بھی کر لیں۔ اصلی قتل کا پتہ ہم لگا کر ہی رہیں گے۔''

جب شام کی چائے کا وقت ہوا تو آلیور اور مائیکل ڈائننگ ہال میں پہنچے۔ وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے شاید اس لیے کہ وہاں موجود ہر کوئی چائے نہیں پیتا ہوگا۔ وہاں ایک بوڑھا آدمی تھا اس کا نام بین تھا۔ ایک شادی شدہ جوڑا تھا۔ عورت کا نام کیلی تھا اور اس کے شوہر کا نام مارٹن تھا۔

آلیور نے اپنا اور مائیکل کا تعارف کرایا۔

مارٹن۔ ''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔''

آلیور۔ ''ہمیں بھی۔ ایک بات تو بتایئے کہ آپ اس رات کیا کر رہے تھے جب یہ حادثہ پیش آیا۔''

مارٹن۔ ''جناب سردیوں کی راتیں ہیں۔ میں اور میری بیوی جلدی سونے کے لئے لیٹ گئے تھے ہمیں اس واقعے کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں چل سکا۔''

کیلی۔ ''ہمیں تو سوتے سے جگایا گیا تھا کہ یہ حادثہ پیش آ گیا ہے۔''

آلیور۔ ''تو آپ لوگ یہ قلعہ چھوڑ کر بھاگے کیوں نہیں۔''

کیلی۔ ''دیکھیں اس میں ڈرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ لڑکی تو پاگل تھی۔''

آلیور۔ ''اور مسٹر بین آپ کے خیالات ہیں۔''

بین نے مریل سی آواز میں کھانستے ہوئے کہا۔ ''میرے اس بارے میں کوئی خیالات نہیں ہیں۔ میں بھی اس وقت سو رہا تھا۔''

کچھ دیر یونہی سوال جواب کرنے کے بعد آلیور اور مائیکل واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔

آلیور۔ ''کمال ہے یہاں تو ہر کوئی یہ کہہ کر کہ وہ تو پاگل تھی اپنی جان چھڑا رہا ہے۔''

مائیکل۔ ''ہاں بالکل ہم سے بات کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہے۔''

آلیور۔ ''چلو چل کر اس لڑکی کے شوہر اور اس کی بیٹی سے مل لیتے ہیں۔ امید ہے وہ تو ہم سے بات کر لیں گے۔''

آلیور اور مائیکل ان کے کمرے میں آئے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ ایک جوان لڑکے نے کھولا۔ وہ یقیناً اس کا شوہر تھا۔ ان دونوں نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ آدمی انہیں لے کر اندر آ گیا۔ اس کا نام چارلس تھا۔

چارلس۔ ''بیٹھیے تشریف رکھیے۔''

مائیکل۔ ''بہت بہت شکریہ۔''

آلیور۔ ''سب سے پہلے تو مجھے آپ کی بیوی کی موت کا بہت افسوس ہے۔ لیکن کیا کریں یہ دنیا ظالموں سے بھری پڑی ہے۔ آپ بتائیں گے کہ اس رات آپ قلعے سے باہر کیوں گئے تھے۔ اور آپ کی بیٹی کیا کر رہی تھی۔''

چارلس۔ ''میں ضروری کام سے بازار گیا تھا۔ کھانے کے لئے کچھ خریدنا تھا۔ یہاں پر کھانا صرف ٹائم پر ہی ملتا ہے۔ اور جہاں تک میری بیٹی کا سوال ہے۔ وہ ڈائنگ ہال میں کھیل رہی تھی۔''

آلیور۔ ''ہمیں پتا چلا ہے کہ آپ کی بیوی نارمل نہیں تھیں۔ پھر آپ نے ان سے شادی کیوں کی۔''

چارلس۔ ''وہ تقریباً نارمل ہی تھی بس کبھی کبھار بچوں کی طرح ضد کرنے لگ جاتی تھی۔ اور شادی میں نے اس سے اس لیے کی تھی کہ میں اسے پسند کرتا تھا۔''

آلیور اور مائیکل نے دیکھا کہ اس کی بیٹی وہیں پاس میں چپ چاپ بیٹھی تھی لیکن انہوں نے بچی سے کوئی سوال نہیں کیا۔''

آلیور ٹھیک ہے مسٹر چارلس بہت بہت شکریہ اب ہم چلتے ہیں رات کو ڈنر کے وقت ملاقات ہوگی۔''

پھر جب نو بجے آلیور اور مائیکل ڈائننگ ہال میں پہنچے۔ وہاں سب جمع ہو چکے تھے۔ ریٹا نے کھانا لا کر لگانا شروع کر دیا۔ آلیور نے دیکھا کہ وہاں مارٹن ہے، کیلی ہے، بین ہے چارلس اور اس کی بیٹی ہے اور اس کے علاوہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہیں۔ سب کا دھیان کھانے پر تھا کہ تب ہی آلیور نے اس لڑکے سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام اینڈریو ہے۔ آلیور نے بتایا کہ وہ یہاں کس سلسلے میں آیا ہے تو اینڈریو نے کہا کہ وہ بھی ایک پولیس والا ہے۔ آلیور اس سے مختلف سوالات کرنے لگا۔ پھر اس نے اس لڑکی کو مخاطب کیا۔

''آپ کا نام جان سکتا ہوں؟'' وہ لڑکی اکڑ کر بولی۔

''میرا نام ٹریسی ہے۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے سوالوں کے جواب دوں گی۔ میرے پاس فالتو کا وقت نہیں ہے۔ ویسے بھی پولیس ہم سے بہت کچھ پوچھ چکی ہے تم انہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے۔''

اینڈریو۔ ''ہم سب نے ان کے سوالوں کے جواب دیے ہیں تمہیں بھی دینے چاہئیے۔''

ٹریسی۔ ''تم ہوتے کون ہو مجھ سے اس طرح بات کرنے والے۔ بے وقوف۔''

اینڈریو۔ ''زبان کو لگام دو۔''

ٹریسی نے جھٹ میز سے چھری اٹھائی اور اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی چھری کا رخ اینڈریو کی طرف تھا۔ اینڈریو نے ابھی اتنی ہی پھرتی سے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے پستول نکال کر اس پہ تان لی۔ فضا میں سناٹا چھا گیا تھا۔ سب دم سادھے انہیں دیکھ رہے تھے ریٹا کی ساری تیز طراری نکل چکی تھی۔

اینڈریو۔ ''چھری نیچے رکھو۔''

ٹریسی نے چھری میز پہ پھینکی اور تیز تیز قدم اٹھاتی جانے لگی۔

''کہاں جا رہی ہو۔'' اینڈریو نے پوچھا۔

ٹریسی۔ ''بھاڑ میں چلنا ہے؟''

اینڈریو۔ ''نہیں شکریہ وہ جگہ تمہارے لیے ہے تم ہی جاؤ۔''

اس نے پستول واپس اپنی جیب میں رکھا اور کرسی پہ بیٹھ گیا۔ کافی بدمزگی ہو چکی تھی سب نے بے دلی سے کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اپنے کمرے میں آ کر آلیور نے مائیکل سے کہا کہ کچھ تو گڑبڑ ہے ٹریسی نے ہم سے بات کیوں نہیں کی۔ کہ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ آلیور نے دروازہ کھولا سامنے چارلس کھڑا تھا۔

چارلس۔ ''کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔''

آلیور۔ ''جی، جی بالکل آیئے۔''

وہ انہیں لے کر اندر آ گیا۔

چارلس۔ ''مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے یہ بات میں نے پولیس کو بھی نہیں بتائی۔ میں اور ٹریسی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن پھر مجھے آہستہ، آہستہ معلوم ہوا

کہ ٹریسی صحیح عادتوں کی لڑکی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اور بہت جلد ہی شادی کر لی۔ اس کے بعد سے وہ میرے خلاف ہوگئی ہے۔ اس نے مجھے دھمکی بھی دی تھی کہ وہ میرے پورے گھر کو برباد کر دے گی۔ آج اس کا اس طرح آپ سے بات نہ کرنا یہ سب باتیں بہت عجیب ہیں۔''

آلیور۔ ''کیا آپ جانتے ہیں کہ اس حادثے کے بعد سب سے پہلے اس کمرے میں کون گیا تھا۔''

چارلس۔ ''میری بیٹی۔''

آلیور۔ ''کیا اس نے کسی کو وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھا۔''

چارلس۔ ''نہیں ..... لیکن اس نے دیکھا کہ ایک پرانے طرز کا لباس پہنے ایک لڑکی وہاں سے گزر رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ یہاں کا مالک اسٹیفن بتاتا ہے کہ پرانے بھوت یہاں پر آتے ہیں۔''

آلیور۔ ''مسٹر چارلس مجھے لگتا ہے کہ میں یہ گتھی سلجھا چکا ہوں۔ آپ اپنے کمرے میں چل کر آرام کیجیے۔''

اس کے جانے کے بعد آلیور مائیکل کو لے کر اسٹیفن کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ آپ برائے مہربانی تمام گاہکوں سے ان کے دھلنے والے کپڑے مانگ لیجیے۔''

اسٹیفن۔ ''دماغ صحیح ہے تمہارا یہاں کسی کے کپڑے نہیں دھلتے اپنے کپڑے خود دھولو۔''

آلیور۔ ''آپ شاید میری بات سمجھے نہیں۔''

پھر آلیور نے انہیں سارا ماجرا سنایا تھوڑی ہی دیر میں سب کے کپڑے آ گئے۔ ان میں سے ایک جوڑا پرانی طرز کا ٹریسی کے پاس سے نکلا آلیور نے وہ سوٹ چارلس کی بیٹی کو دکھایا۔ وہ فوراً پہچان گئی کہ یہ وہی سوٹ ہے۔

آلیور نے فوراً اینڈریو کو بھی بلا لیا۔ اور پھر چارلس اور اینڈریو کو ساری بات بتائی کہ دراصل ہوا یہ ہوگا کہ چارلس کی بیوی پہلے ہی تھوڑی نارمل نہیں تھی ٹریسی نے اسے بھوت بن کر ڈرایا اور وہ بے چاری اس سے ڈر کر نیچے کود گئی۔ اور یہی ٹریسی چاہتی بھی تھی۔ اسے چارلس کی پورے گھر سے دشمنی ہے۔

اینڈریو۔ ''چلو چل کر اسے پکڑ لیں۔''

وہ ٹریسی کے کمرے تک آئے۔ اینڈریو نے دھڑ سے دروازہ کھولا وہ سامنے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

ٹریسی۔ ''کیا بدتمیزی ہے پوچھے بغیر کیوں گھسے چلے آ رہے ہو۔''

اینڈریو۔ ''تم بھی تو ہر کام پوچھے بغیر کرتی ہو۔''

ٹریسی ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی۔

چارلس۔ ''بدذات عورت کیوں کیا تو نے ایسا۔ ایک بے قصور عورت کو جان سے مار دیا۔''

چارلس کی بیٹی کو بھی اس بارے میں پتا چل چکا تھا وہ دوڑتی ہوئی آئی اور شیرنی کی طرح ٹریسی کو مارنے لگی۔

ٹریسی نے اسے بستر پر دھکا دیا۔

ٹریسی۔ ہٹ پرے پاگل کہیں کی۔ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے پھر وہ اس کے منہ پہ تکیہ رکھ کے اس کا دم گھونٹنے لگی۔ اینڈریو نے بنا دیر لگائے اپنا پستول نکالا اور ٹریسی پر فائر کر دیا۔ گولی اس کے سر میں لگی۔ وہ فوراً ہی مر گئی۔ گولی کی آواز سن کر سب لوگ وہیں چلے آئے۔

اسٹیفن۔ ''میں پوچھتا ہوں کیا ہو رہا ہے یہ سب میرے قلعے میں؟''

انہوں نے اسے ساری بات سمجھائی۔

اسٹیفن۔ ''میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے قلعے کا نام بہت بدنام ہو رہا ہے وہ بھی صرف تم لوگوں کی وجہ سے۔ ابھی اسی وقت میرا قلعہ خالی کر دو۔''

اینڈریو۔ ''آپ کا قلعہ تو ویسے ہی بدنام ہے۔ اور ہاں ذرا سنبھل کے بات کیجیے میں ایک پولیس والا ہوں۔''

آلیور اور مائیکل پولیس کے آنے تک وہیں رکے رہے پھر اپنے گھر واپس آ گئے۔

بھوت بنگلہ

عنیزہ فضل داد- کراچی

اچانک کمرے میں موجود پردوں کے پیچھے ایک سرسراہٹ محسوس ہوئی اور اس کے پیچھے کھڑی کسی دوشیزہ کی پرچھائیں نے گھر والوں کی جان نکال دی کہ پھر اچانک.....

خوف کے سمندر میں غوطہ زن ایک نادیدہ وجود کا شاخسانہ..... جو کہ بہت..... دلیر تھا

یار کتنی ڈرپوک ہو تم..... تم سے تو یہ ایک بال تک نہیں لائی جاتی حد ہوتی ہے بھئی کیا بنے گا تمہارا.....

صبا پچھلے آدھے گھنٹے سے مجھے لگاتار صلاوتیں سنائے چلی جارہی تھی ایسا بنتا بھی تھا کیونکہ اس نے وہ کام کر دکھایا تھا جو میں تو کبھی نہیں کر سکتی تھی وہاں موجود بھوتوں کے اس محل سے بال لانا کسی معرکے سے کم تھوڑی تھا اور یہ معرکہ صبا نے سر کر دکھایا۔

یار تمہیں پتہ تو ہے یہ گھر..... گھر نہیں بلکہ ایک بھوت بنگلہ ہے تم کیسے یہ سب کر سکتی ہو کیا تمہیں ذرا برابر بھی ڈر نہیں لگتا اور تم جانتی ہو نا اگر آنٹی کو یہ سب پتہ چل گیا تو تمہارا کیا ہوگا۔

ارے یار کچھ نہیں ہوتا!

پتہ نہیں میں نے بھی کیسی پھٹو (ڈرپوک) انسان کے ساتھ دوستی کر لی ہے۔ اب تو تمہارا یہ ڈر نکال

کر ہی رہوں گی میں، میری بات سنو تم آج رات مجھ سے یہیں ملو گی سمجھی۔

کک..... کک..... کیا مطلب؟

بھئی میرے خیال سے میں نے فارسی تو بولی نہیں جو تمہیں سمجھ نہ آسکے۔

نہیں کبھی نہیں، میں یہاں نہیں آؤں گی اور وہ بھی اندھیری رات کے اس پہر نہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا..... مجھے لگتا ہے اندر جا کر بال لانے سے تمہارا دماغی توازن بگڑ چکا ہے اس لیے اب ہمیں گھر واپس چلنا چاہیے۔

ہاں ٹھیک ہے تمہاری مرضی اب دیکھ لو میں رات میں تمہارا یہیں انتظار کروں گی اور سوچ لو اگر میں اکیلی یہاں کھڑی رہی اور مجھے کچھ ہوگیا تو اس کی ذمہ دار صرف اور صرف تم ہوگی اب فیصلہ تمہارا ہے!

نہیں میں نہیں آؤں گی بس میں نے کہہ دیا اب چلو یہاں سے!

صبا کی آنکھوں سے نا جانے کیوں مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب وحشت سی تھی لیکن میں اسے دیکھے بنا اپنی بات مکمل کر کے آگے چلنے لگی لیکن دل بار بار ہولے چلا جا رہا تھا کے اگر سچ میں صبا نے اپنی ضد نہ چھوڑی تو خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا بیٹھے۔

پورا دن صرف اسی خوف میں کنٹار ہا کہ نا جانے اگلے پہر کیا ہونے والا ہے اور بلآخر شام ڈھلتے ہی صبا کی کال نے میری رگ و جان میں ایک سرد لہر دوڑا دی اور نا چاہتے ہوئے بھی مجھے اس کا فون اٹھانا پڑا۔

صبا تم آ رہی ہو ناں؟

ن..... نن..... نہیں۔

سنو میں نے تم سے انکار سننے کے لیے کال نہیں کی بلکہ یہ بتانے کے لیے فون کیا ہی کہ میں گھر سے نکل رہی ہوں باقی تم جو چاہو کرو۔

میری کسی بھی بات کو خاطر میں لائے بنا وہ دوسری جانب سے فون کاٹ چکی تھی۔

کیا مجھے جانا چاہیے؟

نہیں نہیں بالکل بھی نہیں میں وہاں کیسے جا سکتی ہوں؟

لیکن وہاں میری دوست میرے سبب کسی مشکل میں نہ پھنس جائے؟

لیکن میں نے تو اسے روکنے کی بھرپور کوشش کی اب اس نے اگر میری بات نہیں سنی تو اس میں میرا کیا قصور۔

لیکن وہ میری دوست ہے مجھے اسے یوں اکیلے نہیں چھوڑنا چاہیے ہاں مجھے جانا چاہیے۔

کافی دیر خود سے ہم کلام ہونے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچی کہ میرا وہاں جانا ہی بہتر ہے۔

ماں میں جا رہی ہوں؟

کیا کہاں جا رہی ہو بیٹا؟

ماں وہ میں صبا کی طرف جا رہی ہوں بس تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گی۔

لیکن اتنی رات گئے کیا ضرورت ہے جانے کی باہر بہت ٹھنڈ پڑ رہی ہے بیٹا آپ کو جو بھی کام ہو آپ صبح اس سے بات کر لینا ابھی آپ اندر جاؤ؟

ماں پلیز مجھے اپنے صبح کے اسائنمنٹ کے بارے میں اس سے بات کرنی ہے اب وہ صبح تو نہیں ہو سکتی ناں پلیز.....

اچھا اچھا جاؤ لیکن جلد واپس آنا ہے سمجھی ناں۔

جی ماں سمجھ گئی بس یوں گئی اور یوں آئی۔

ڈر کے مارے میرا آدھا خون رستے میں ہی خشک ہو چکا تھا اور یہ رستے کے درمیان پڑتا قبرستان میری باقی کی جان نکالنے کے لیے کافی تھا کہ اچانک قبرستان میں موجود کسی کی ہلکی ہلکی آہٹ نے میرے قدم برف کی مانند جما دیئے۔

آیۃ الکرسی ہاں جلدی پڑھو اور آگے بڑھو لیکن آیۃ الکرسی مجھے یاد کیوں نہیں آ رہی یا خدا میری مدد فرما میرے قدم بھی آگے اٹھ نہیں پا رہے یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

آل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو

آل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو

آہستہ آہستہ وہ آہٹ مزید بڑھتی ہی چلی جا رہی

تھی اور کوئی بڑی تیزی سے میری جانب بڑھے چلا آرہا تھا کہ آچانک آیۃ الکرسی کا ورد میری زبان پر جاری ہوگیا اور اس کے پڑھتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلی کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ قدم کہاں پڑ رہے ہیں نا جانے کتنی ہی قبروں کو ٹھوکر مارتے میں بھاگی چلی جارہی تھی کہ اچانک قبرستان کے اختتام پر مجھے وہ گھر دکھائی دیا۔

وہی خوفناک گھر کے جو نا جانے کب سے بند پڑا تھا لیکن اس کے دروازے پر نہ تو کوئی تالہ موجود تھا اور نہ ہی کوئی چوکیدار کسی کی ہمت نہیں ہو پاتی تھی کے وہ اس خالی کھلے مکان میں قدم بھی رکھ سکے میں خود نا جانے کیسے وہاں تک پہنچ آئی مجھے خود کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

صبا.....صبا.....صبا

کہاں ہو تم؟

دیکھو میں آگئی ہوں پلیز مجھے جواب دو صبا.....

صبا.....پلیز یار مجھے تنگ مت کرو پلیز.....پلیز۔

اوہ ہاں میں اسے کال کرتی ہوں۔

لیکن میرا فون ارے ابھی جیب میں ہی تو رکھا تھا میرا فون۔

میرا فون کہاں چلا گیا.....نہیں اوہ خدایا میرا فون اب میں کیا کروں۔

میرا فون شاید قبرستان میں ہی کہیں گر چکا تھا اور اب صبا کی تلاش میں اندر جانے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ باقی نہ رہا لیکن اس کھنڈر کی مانند گھر میں جانے کی ہمت مجھ میں نا تھی لیکن اپنی جان سے پیاری دوست کا خیال دل میں آتے ہی بلآخر قدم بڑھایا اس کھنڈر کا دروازہ میرے چھونے سے ہی کھل چکا تھا اور اندر جاتے ہی ہر طرف لٹکتے جالے ادھر سے ادھر اڑتے چمگادڑ اور ان کی آوازیں اس ماحول کو مزید خوفناک بنائے چلی جارہی تھی کہ اچانک مجھے پھر وہی دھیمی دھیمی سی آہٹ محسوس ہونے لگی اور اس بار وہ آہٹ کچھ زیادہ تیزی سے میری جانب بڑھتی محسوس ہوئی چلی جارہی تھی لیکن میں نے جیسے ہی اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا لیکن اسی وقت مجھے اپنے بہت قریب سے

انمول باتیں

جو زبان خدا کے ذکر سے عاری ہو اس کا گنگ ہو جانا بہتر ہے۔(حضرت جنید بغدادیؒ)

کم عمر والے کے گناہ اپنے سے کم جان کر اس کی عزت کرے۔(حضرت امام جعفر صادقؒ)

لوگ یتیم اسے کہتے ہیں جس کا باپ نہ ہو۔مگر میں یتیم اسے کہتا ہوں جو جاہل ہو۔

(حضرت علیؓ)

دنیا ایک بازار ہے جو عنقریب بند ہو جائے گا۔(حضرت غوث اعظمؒ)

تم جو بات دشمن سے پوشیدہ رکھتے ہو۔دوست سے بھی پنہاں رکھو۔ممکن ہے وہ کسی روز تمہارا دشمن ہو جائے۔(حکیم لقمان)

علم ایک دریا ہے۔جس میں جتنا صرف کرو گے گھٹے گا نہیں۔(سلمان فارسیؓ)

جو اللہ تعالیٰ کے کاموں میں لگ جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے کاموں میں لگ جاتا ہے۔(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

(شہریار خان-کراچی)

قول

سچا دوست وہ ہے جو آپ کی تمام تر خامیوں کے باوجود آپ سے محبت کرتا ہے۔جہاں آپ میں ہزاروں خامیاں ہیں وہاں ایک آدھ خوبی تو ہوگی بس دوستی میں ایک آدھ خوبی آپ کی تمام خامیوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔

(شمس الحق شمسی-کراچی)

سڑک کنارے لگے ہوئے نلکے سے غلام مصطفیٰ نے تازہ وضو کیا۔ اور وہیں اپنی چادر بچھا کر نماز عشاء ادا کی۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ مطمئن رہتا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔

راستے میں کسی بھی قسم کی سرائے یا مسافر خانہ نہ ہونے کی وجہ سے اس نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور موسم کی خرابی کی وجہ سے شارٹ کٹ بھی جنگل سے گزرنے والے راستے کا انتخاب کیا۔ سامان کا بیگ کندھے پر لٹکائے غلام مصطفیٰ جنگل والے راستے کی طرف گامزن ہو چکا تھا۔

بادلوں کی چمک کی وجہ سے ماحول بہت پراسرار ہو رہا تھا۔ ہوا کی اٹکھیلیاں اور پتوں کی کھڑ کھڑاہٹ نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ جنگل میں مختلف جانوروں کی آوازوں نے ماحول کو ڈراؤنا بنا دیا تھا۔

شارٹ کٹ راستہ ویسے تو سات میل کا تھا جس سے چار میل جنگل سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس جنگل میں لوگوں کی آمد و رفت دن کو بھی بہت تھوڑی ہوتی تھی، لوگوں کی زبانوں پر اس جنگل کے بارے میں بہت سے قصے بھی مشہور تھے۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ جنگل کا راستہ کچا تھا اور بارش کی وجہ سے اب پھسلن ہو رہی تھی۔ غلام مصطفیٰ نے بمشکل ایک میل کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک اس کو "مدد..... مدد..... مدد" کی آوازیں سنائی دیں۔

قرآن پاک کی تلاوت کی وجہ سے پہلے پہل تو غلام مصطفیٰ نے خاص توجہ نہیں دی لیکن جب آواز میں تیزی آئی اور ایک جھونپڑی نظر آنے لگی جو راستے سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ گاؤں کے اکثر لوگ بچوں اور نوجوانوں کو سمجھاتے تھے کہ جنگل میں رات کا اکیلا سفر نہ کریں اور کوئی جتنا بھی بلائے اس پر توجہ نہ دیں کیونکہ اس جنگل میں جنات کا بسیرا ہے۔

غلام مصطفیٰ نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جب بھی کسی نے مشکل میں پکارا تو اللہ تعالیٰ کی عطا سے اس کی ضرور مدد کروں گا۔ وہ آواز کی سمت مڑا اور کہا۔

"کون ہے جو مصیبت میں مبتلا ہے۔"

اچانک ایک جوان عورت نظر آئی جو گیلی زمین پر بیٹھی تھی۔ اور زاروقطار رو رہی تھی۔ غلام مصطفیٰ نے اس کے پاؤں دیکھے تو وہ بالکل ٹھیک اور سیدھے تھے اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت بچہ جو سات آٹھ سال کا ہوگا بیٹھا تھا۔ عورت نے جب یہ دیکھا کہ کوئی اس کی فریاد پر اس تاریک اور خوفناک رات میں بھی مدد کے لئے آن کھڑا ہے تو اس نے سر اوپر اٹھایا اور بولی۔

"بیٹا تو کون ہے اور اس بارش والی رات میں سنسان اور وحشت ناک راستوں پر سفر کر رہا ہے۔"

غلام مصطفیٰ نے نہایت مؤدبانہ انداز میں جواب دیا کہ وہ ایک فوجی ہے۔ پاک آرمی میں ملازمت کرتا ہے۔ نندی پور گاؤں کا باسی ہے چھٹی لے کر گاؤں کی طرف روانہ ہوا ہے۔ عورت نے غلام مصطفیٰ سے پوچھا کہ کیا وہ حافظ قرآن ہے کہ لگاتار قرآن پاک کی تلاوت کرتا آ رہا ہے۔

غلام مصطفیٰ کو تعجب ہوا کہ اس عورت کو کیا خبر کہ میں کتنی دیر سے قرآن پاک کی تلاوت کرتا آ رہا ہوں۔ خیر اس نے عورت سے مسئلہ پوچھا۔ تو عورت نے بتایا کہ میرا گھر قریب ہے۔ میرا یہ بیٹا بہت نالائق ہے۔ نماز اور ذکر الٰہی سے پیچھے ہٹتا ہے۔ میں تمہارے جیسے نیک دل انسان کی تلاش میں ہوں تاکہ ہمارا یہ مسئلہ حل ہو سکے۔

غلام مصطفیٰ نے عورت کو حوصلہ دیا اور اس کے پیچھے پیچھے اس کی جھونپڑی میں پہنچ گیا۔ وہاں دو مرد اور ایک لڑکا سو رہا تھا۔ عورت کے ساتھ جو لڑکا تھا وہ چپ تھا۔ عورت نے غلام مصطفیٰ سے کہا کہ بیٹھ جاؤ۔"

غلام مصطفیٰ بیٹھا تو عورت نے کہا کہ۔ "میرا نام سیماب ہے میرے شوہر کا نام زریاب اور بیٹوں کا نام شمع گل اور گلزار ہیں میرے والد کا نام شاہان ہے۔ ہم برسوں سے اس گھر میں رہ رہے ہیں۔ نماز روزہ کرنا اور بھٹکے مسافروں کو راستہ دکھانا ہمارا مشن ہے۔ ہمیں نماز کا طریقہ اور قرآن پاک کی مختلف سورتوں کا امتزاج تم سکھا دو اور میرے اس بیٹے کو نصیحت کر کے درست ڈگر پر چلا دو تو ہم تمہارے احسان مند رہیں گے۔"

غلام مصطفیٰ نے کھڑکی کی طرف نظر ڈالی تو ایک ز کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔ عورت نے دونوں مردوں او

لڑکے کو جگا دیا۔ غلام مصطفیٰ نے تمام افراد کو وضو کا انداز اور تر کیب سکھائی اور دو نفل شکرانے کے ادا کرنے کو کہا۔ اب غلام مصطفیٰ نے ان کو پوری نماز اپنے دلنشین انداز میں یاد کرائی۔ قرآن پاک کی مختلف سورتوں کا امتزاج بتایا اور چھوٹے لڑکے سے مخاطب ہوا کہ تمہارا کیا نام ہے؟ لڑکے نے اپنا نام گلزار بتایا۔ غلام مصطفیٰ نے استفسار کیا کہ دین کی طرف کیوں راغب نہیں ہوتے۔

اس نے کہا کہ ”مجھے گھومنے پھرنے کا شوق ہے۔ عبادت سے جان چھڑا جاتا ہوں۔“

غلام مصطفیٰ نے گلزار کو سمجھایا تو وہ اپنے کیئے پر نادم ہوا اور آئندہ اپنی ماں کو نہ ستانے کا وعدہ کیا۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ سیماب اب مسکرا رہی تھی۔ اس نے غلام مصطفیٰ کو چائے، مٹھائی اور نمک پارے پیش کیئے جو طوفانی رات میں کافی خستہ اور اچھے لگ رہے تھے۔

غلام مصطفیٰ نے ان تمام افراد سے باری باری سبق سنا اور مطمئن ہو کر اجازت چاہی۔ گھر کے مردوں اور دونوں لڑکوں نے منت کی کہ ”آپ ہمارے گھر رات ٹھہر جائیں اور صبح ہم آپ کو چھوڑ آئیں گے۔“

لیکن غلام مصطفیٰ نے کہا کہ۔ ”میں گھر بتا چکا ہوں کہ آ رہا ہوں۔ وہ پریشان ہو رہے ہوں گے۔ میں کافی لیٹ ہو چکا ہوں۔ بارش جاری تھی دونوں مرد اور دونوں لڑکے غلام مصطفیٰ کو چھوڑنے پر بضد تھے۔ غلام مصطفیٰ نے ان کو اجازت دے دی۔ سیماب کے والد شاہان نے کہا کہ جنگل سے نکلنے کا ایک خفیہ راستہ ہے۔ تم اگر آنکھیں بند کر کے ہمارے ساتھ چلو تو ہم جلد ہی طوفانی رات کے اس سفر میں جنگل سے نکل جائیں گے۔“

غلام مصطفیٰ آنکھیں بند کر کے ان کے ساتھ چلنے لگا۔ شاہ گل اور گلزار نے غلام مصطفیٰ کے ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ چند منٹ بعد غلام مصطفیٰ کو آنکھیں کھولنے کا کہا گیا۔

جنگل سے کافی دور اور گاؤں سے بہت نزدیک آ چکے تھے۔ دونوں مرد اور دونوں لڑکے غلام مصطفیٰ کو اس کے گھر کے سامنے چھوڑ کر جانے لگے تو غلام مصطفیٰ نے دیکھا کہ ان چاروں کے کپڑے خشک تھے۔ جو بہت عجیب بات تھی۔ شاہان نے غلام مصطفیٰ کو ایک خط اور ایک انگوٹھی دی کہ بیٹا یہ ہماری طرف سے تحفہ ہے۔ اور ہمارے جانے کے بعد دن کی روشنی میں یہ خط پڑھنا اور کسی سے بھی ہماری جھونپڑی، خفیہ راستے اور اس ملاقات کا ذکر نہ کرنا۔“

غلام مصطفیٰ نے احتیاط سے وہ خط اور انگوٹھی سنبھال لی۔ اور گھر آ کر سو گیا۔ صبح فریش ہو کر اس نے خط پڑھنا شروع کیا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خط جلی حروف میں تحریر کیا گیا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ

ہم جنات کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں سینکڑوں سالوں سے اس جنگل میں آباد ہیں بار بار انسانوں کے آگے منتیں کرنے کے باوجود کسی نے بھی ہماری دادرسی نہیں کی۔ صرف تم نے حوصلہ دکھایا اور ہمیں وضو، نماز، تلاوت کے انداز درست اسلوب سے سکھائے۔ ہم تمہارے مشکور ہیں، انگوٹھی کو جب بھی تلاوت کلام پاک کے بعد رگڑو گے تو ہم حاضر ہو جائیں گے۔ ہمیں اسلامی مسائل بتاتے رہنا۔

جنات نے غلام مصطفیٰ کے احسان کا بدلہ اس طرح سے اتارا کہ اس کو آتے جاتے مختصر راستے سے لے جاتے اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی چلاتے۔ غلام مصطفیٰ بہت مطمئن تھا۔ اگر وہ اس رات نیکی کا جذبہ نہ رکھتا تو شاید اتنی آسانی سے گھر نہ پہنچ پاتا۔ شاید بھٹک جاتا۔

نیک دل جنات کے احسان کی وجہ سے وہ اس طوفانی رات میں جلدی اور آسانی سے گھر پہنچ گیا تھا۔

غلام مصطفیٰ ریٹائرڈ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ”جنات بھی انہی لوگوں کی مدد کرتے ہیں جو قرآن پاک سے محبت رکھتے ہیں اور جنات کو دینی مسائل کا ادراک ہوتا ہے۔

گاؤں نندی پور کے لوگوں نے کبھی بھی غلام مصطفیٰ کے دوست جنات کو نہیں دیکھا لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے غلام مصطفیٰ کو گاؤں کی مسجد کا امام بنا دیا۔ اور اس کی خدمت بھی کرنے لگے۔ اندھیری اور وطوفانی رات میں جنات کا نیکی کا جذبہ اور اس کو گھر چھوڑنے کا احسان غلام مصطفیٰ کے لئے بہت اچھی یاد ہے۔

ٹائم پاس

عثمان غنی خان-پشاور

لڑکی نے سب سے پہلے ٹائم پاس کے لئے کام شروع کردیا تھا، اس کے درست اندازے نہیں تھے مگر پھر بھی وہ لوگوں کے دلوں میں بس گئی تھی کہ ایک روز اچانک ایسا ہوا کہ.....

نئی نسل کی چاہت.....کے عین مطابق دل کو خوش کرتی.....خوبصورت.....کہانی

وہ لڑکا بے چینی سے ٹیرس پر کھڑا بہت پراسرار سا نظر آرہا تھا۔اس کے دماغ میں بہت کچھ چل رہا تھا۔وہ جیسے بالکل مایوس لگ رہا تھا۔شام ہورہی تھی،آسمان پر ستارے چمکنا شروع ہوچکے تھے۔وہ جیسے روہانسے انداز میں کالے آسمان کو گھورتا رہا۔

''جس طرح ،آج مجھے اپنا آپ خالی لگ رہا ہے۔۔۔!!بالکل،ویسے جیسا میرا وجود کہیں فنا ہوگیا ہے۔۔۔!! پتہ نہیں،آج مجھے گلٹ سا فیل ہورہا ہے؟ جیسے میری وجہ سے بہت کچھ برا ہوگیا ہے؟ ہاں۔۔۔!! شاید یہ کالا آسمان مجھے بتارہا ہے۔برائیاں اس اندھیرے کی طرح ہوتی ہیں۔جو انسان کو اندر سے بالکل کالا کردیتی ہیں۔جیسے آسمان تو نیلا ہوتا ہے۔مگر اندھیرا بہت تیزی سے اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے اور یہ چمکتے ستارے،اس اچھائی کی طرح روشن ہوتے ہیں،جو برائی اسے کبھی ہضم کرنہیں پاتی ہے۔دور سے بھی روشن،اور ٹمٹماتے ہیں۔پوری شان سے چمکتے ہیں۔''اس لڑکے نے دل ہی دل میں کہا۔اب وہ سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

''اوہ،میں نے دوبارہ اس کو فون تک نہیں کیا۔مجھے اس سے اس لڑکے کے بارے میں پوچھنا چاہیے؟ کیا وہ بچ گیا ہے؟''اس لڑکے نے اپنا موبائ نکالا،اور لڑکی کا نمبر ڈائل کردیا۔کچھ دیر تک رنگ ج رہی۔مگر دوسری طرف سے کسی نے نہیں اٹھائی۔

''ہیلو ۔۔۔!!یقیناً،آپ خیریت ہونگی۔۔۔!! آپ مجھے اس کے بارے میں بتائیں؟ وہ ٹھیک ہے؟''اس لڑکے نے میسج لکھ کر لڑکی کے نمبر سینڈ کردیا۔وہ اب انتظار کررہا تھا۔کئی لمحے گزر گئے۔ چلتے چلتے تھک گیا۔اچانک اس کے موبائیل کی بجنے لگی۔اس نے موبائیل آن کرکے دیکھا۔ ایک تصویر اسے بھیجی گئی تھی۔وہ اسی لڑکے کی تھی، کے لیے وہ پریشان تھا،اس کی تصویر کفن میں لپٹی ہ تھی۔اس کا چہرہ اس میں صاف نظر آرہا تھا۔وہ لڑکا تصویر کو دیکھ کر بری طرح سے اپنی جگہ پر بیٹھتا گیا۔اس کی آنکھوں میں موٹے،موٹے آنسو تھے بری طرح سے بلک رہا تھا۔مگر بے آواز،اس کا دل کہہ رہا تھا۔

''آج،میں نے ایک اور خون کردیا۔۔۔! اس نے کہا۔اور موبائیل بند کرکے جیب میں رکھ لیا۔ بہت زیادہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

امرینہ نے صبح کا ٹائم پیس بند کردیا۔اور اسے دور پھینک دیا۔دو تین لمحوں تک وہ چنگھاڑتا رہا۔پھر بند ہوگیا۔صبح کی اذان بلند ہوئی۔امرینہ نے بری طرح سے چادر میں خود کو ڈھانپ لیا۔اب اذان بند ہوچکی تھی،مگر دور سے ابھی بھی اللہ اکبر کی صدا آرہی تھی۔

"اوہ۔۔۔!!کس بدبخت نے میرے سرہانے یہ ٹائم پیس رکھ دیا تھا۔۔۔!!بدبختوں کو صاف صاف پتہ ہے۔۔۔!!ایک بار میری آنکھ کھل جائے۔۔۔!! پھر بمشکل ہی مجھے نیند آتی ہے۔۔۔!!اللہ غارت کرے۔۔۔!!اس کو،جس منحوس نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔۔۔!!"امرینہ نے بستر کے اندر منہ اچھا خاصا بگاڑ لیا۔اب وہ موبائیل نکال کر وائی فائی کے سگنلز چیک کررہی تھی۔پھر اس نے ایک ٹھنڈی سی سانس لی۔

"شکر ہے۔۔۔!!رات بھر یہ وائی فائی کا بٹن کوئی بند نہیں کرتا ہے۔۔۔!!میں ابھی کسی کی فرینڈ ریکویسٹ ایکسیپٹ کرتی ہوں اور اسی سے چیٹ کرتی ہوں۔۔۔!!دیکھتی ہوں۔کس کس نے فرینڈ ریکویسٹ بھیجی ہے؟"اس نے اپنے موبائیل کو چیک کرنا شروع کردیا۔کوئی بھی ریکویسٹ نہیں آئی تھی۔اس کے منہ کا زاویہ اور بھی بگڑ گیا۔اس کی آئی،ڈی لڑکے کے نام پر بنی تھی۔

"کسی ہنڈسم،ڈیشنگ،چارمنگ،اسمارٹ،ہاٹ،وغیرہ وغیرہ کو فرینڈ ریکویسٹ بھیج دیتی ہوں۔۔۔!!اب بندہ خود سے بھی یہ کام کرسکتا ہے۔۔۔!!"اب وہ دھڑ ادھڑ،دوسرے لڑکوں کی آئی ڈیز دیکھ رہی تھی۔کوئی بھی اس کو پسند ہی نہیں آرہا تھا۔

"سارے نکمے سے لگ رہے ہیں۔۔۔!!ٹین ایجر کے لڑکے کچھ زیادہ ہی شو آف کررہے ہیں۔۔۔!!"وہ غصے سے بڑبڑانے لگی۔

"کسی کی شکل مینڈک جیسی ہے۔۔۔!!کسی کی ہاتھی سے ملتی ہے۔۔۔!!کسی کی صورت بندر سے ملتی جلتی ہے۔۔۔!!اور یہ والا تو بالکل گیدڑ لگتا ہے،اور یہ والا تو جیسے بلی کو کسی نے کپڑے پہنا دئے ہوں۔۔۔!!"

"ہاہاہا۔۔۔!!وری فنی۔۔۔!!ارے یہ والا تو بالکل اُلو لگتا ہے اور نام رکھا ہے۔۔۔!!ماما کا لاڈلا۔۔۔!!اور یہ والا تو کدو لگتا ہے۔۔۔!!وہ بھی سڑھا ہوا۔۔۔!!اور یہ والا تو آلو،وہ بھی چھیلا ہوا۔۔۔!!"اس نے کلین شیولڑکے کو سوائپ کرکے دوسری آئی ڈی،آنکھوں کے سامنے کردی۔امرینہ نے مزید ناک چڑھائی۔

"اور یہ والا تو بالکل توری کی طرح لمبا سا ہے۔۔۔!!جیسے بھنڈی کو سبز چوغا پہنا ڈالا ہو۔۔۔!!اور یہ کوئی ویمپائر کی اولاد لگتا ہے۔۔۔!! "اس لڑکے کے آگے دو دانت بڑے باریک تھے۔جو باہر نکل کر نمائش کررہے تھے۔

"اف۔۔۔!!کس قدر منحوس صورتیں ہیں۔۔۔!!لگتا ہے۔۔۔!!آج سارا دن برا گزرنے والا ہے۔۔۔!!ایسے فرینڈز سے تو اللہ بچا کر رکھے۔۔۔!!بھلے انسان دو تین خوبصورت دشمن پال لے۔۔۔!!مگر ان ندیدوں کو دوست نہ رکھیں۔۔۔!!"

اس نے وہ سارے آئی ڈیز ہٹا کر نئے چیک کرنے شروع کردئے۔اب کوئی تھری پیس میں ملبوس تھا۔جو پودوں سے لپٹ رہا تھا۔کسی نے مائیکل جیکسن کی اولاد بننے کی ناکام کوشش کی تھی۔اور کوئی بالکل سلمان خان بننے کی کوشش میں پوز بنا کر دے چکا تھا۔یہ آخر والا تو شارٹ لیس تھا۔اب جو نیکسٹ آگیا تھا۔وہ تو شارٹ میں ملبوس سمندر کنارے بھاگ رہا تھا۔

"اف اللہ۔۔۔!!یہ کیا ہے؟ان لوگوں کو تو تصویر بنانے تک کی تمیز نہیں ہے۔۔۔!!باڈی ایسے دکھا رہا ہے۔۔۔!!جیسے سلمان خان کی ناجائز اولاد ہے۔۔۔!!اور یہ والا تو ٹام کروز بننے کے چکر میں سارا عریاں ہوچکا ہے۔۔۔!!"امرینہ نے سب کو بری نظروں سے گھورا۔اس نے جلدی جلدی وہ سب سوائپ کرکے مزید آئی ڈیز دیکھنی شروع کردی۔

"باپ رے۔۔۔!!یہ والا تو بالکل کسی چڑیا گھر

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

سے بھاگا ہوا لگتا ہے۔۔۔!! چڑی مار کہیں کا۔۔۔!! بندوق ایسا ہاتھ میں پکڑ رکھا ہے۔۔۔!! جیسے انڈیا کے بارڈر پر جنگ کرنے کے لیے کھڑا ہو۔۔۔!! اف یہ کیا منحوس ایپ ہے۔۔۔!! اس میں ایک بھی پیارا لڑکا نہیں ہے۔۔۔!! سارے للو یہاں آگے ہیرو بن بیٹھے ہیں۔۔۔!! اس سے اچھا ہے۔۔۔! بندہ کچھ دیر ٹک ٹاک سے دل بہلا لے۔۔۔!! ہائے ٹک ٹاک زندہ باد۔۔۔!!'' امرینہ نے موبائیل بند کردیا۔

''بس۔۔۔!! اس ایک موبائیل کا سہارا ہے۔۔۔!! سارا دن اسی سے ٹائم پاس ہوجاتا ہے۔۔۔!! اس میں بھی کچھ مزے دار نہیں ہے۔۔۔!! ساری دنیا پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتی ہے؟ تصویر نکالتی ہے اور جھٹ سے ایپ پر دے دیتی ہے۔۔۔!!'' اس نے بے دلی سے پھر موبائیل اٹھایا۔ اور اسی ایپ کو کھول کر گم ہوگئی۔ اس کے سامنے ایک دلہا دلہن کی تصویر آگئی۔ دونوں کی نئی شادی ہوئی تھی۔

''حور کے پہلو میں لنگور۔۔۔!!'' جلدی سے وہ تصویر اس نے ہٹادیں۔ اب وہ دوسری آئی ڈیز سوائپ کررہی تھی۔

''ویسے میری عمر بھی بوائے فرینڈ کی ہو ہی گئی ہے۔۔۔!! کم از کم اس سال مجھے بوائے فرینڈ تو ملنا ہی چاہیے۔۔۔!! مگر میرا بوائے فرینڈ سب سے خاص ہونا چاہیے۔۔۔!! جو میرے نخروں کے ساتھ ساتھ میرے خرچے بھی اٹھا سکے۔۔۔!! اس ایپ میں تو سارے جنگلی ہیں۔۔۔!! کسی دوسرے ایپ میں سرچ کرتی ہوں۔۔۔!! شاید کوئی مل ہی جائے۔۔۔!! جو مجھ سے زیادہ حسین اگر نہ بھی ہو، تو برابری کا تو ہو۔۔۔!! اور جیب کا بھاری بھی ہو۔۔۔!! اس نئی حکومت نے کتنی مہنگائی کردی ہے۔۔۔!! اُف اللہ۔۔۔!! کیا یہ حکومت پانچ سالوں میں جیبوں سے خلاص کردے گی۔۔۔!! خیر جیسی عوام ویسے حکمران۔۔۔!!'' اب وہ موبائیل میں دوسرا ایپ ڈاؤن لوڈ کرکے اوپن کررہی تھی۔ ان ہی حرکتوں میں کب صبح کا سورج طلوع ہوا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ اس کے یہ دو گھنٹے بڑے مزے سے ٹائم پاس کرتے ہوئے گزر گئے تھے۔ مگر اسے کوئی بھی پسند ہی نہیں آسکا۔ وہ موبائیل پرے رکھ کر آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔

☆.....☆.....☆

اچانک اس کے کمرے کا دروازہ چرچرایا آنے والی دادی تھیں۔ جو لاٹھی کے سہارے اب اس کے بستر تک آرہی تھی۔ اچانک دادی ٹھٹک کر رک گئیں۔ ان کی نظر ٹائم پیس پر پڑی۔ جو اپنے بے قدری پر جیسے دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔

''امرینہ۔۔۔!! کم بخت۔۔۔!! پھر سے صبح نہیں اٹھی۔۔۔!! ٹائم پیس کو لات مار کر توڑ ڈالا۔۔۔!! ایسی لاتیں تو گدھے بھی نہیں مارتے ہیں۔۔۔!! میں نے صبح کی نماز کے لیے لگایا تھا۔۔۔!! تم اٹھو گی تو نماز پڑھ لوگی۔۔۔!! مگر تم انسان کی بچی ہو ہی نہیں۔۔۔!! گدھی ہو۔۔۔!! لاتیں مارنے والی عادت گئی نہیں ہے۔۔۔!! بدبخت، اب اٹھ بھی جاؤ۔۔۔!! کالج نہیں جانا ہے۔۔۔!! تیری عمر کی لڑکیاں بڑے بڑے کارنامے کررہی ہیں۔۔۔!! ایک تو سوتی ہے۔۔۔!! اور دن رات اس موئے کم بخت موبائیل میں گھسی رہتی ہے۔۔۔!! تیرے باپ سے لاکھ مرتبہ کہا ہے۔۔۔!! لڑکی سے یہ موبائیل کم بخت لے لے۔۔۔!! کون سا یار اس میں گھسا رکھا ہے۔۔۔!! جس کو چوبیس گھنٹے اس میں تلاش کرتی رہتی ہے۔۔۔!!'' امرینہ نے پہلے ذرا سی آنکھ کھولی، پھر وہ چادر ہٹا کر بالکل سیدھی بیٹھ گئی۔ پھر جمائی لینے کی ناکام کوشش کی۔ دادی جب ایک بار شروع ہوجاتیں۔ پھر کسی نیوز اینکر کی طرح بڑ بڑاتی رہتیں۔ اس نے دادی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑی ناگواری تھی۔ منہ بُرے زاویے میں ٹیڑھا سا ہوگیا تھا۔ پھر گردن ٹیڑھی کرکے دادی کو ناگوار نگاہوں سے دیکھا۔

''ارے دادی ڈارلنگ۔۔۔!! آپ۔۔۔!! دادی گڈ مارننگ۔۔۔!! ہیلو۔۔۔!! دادی آپ کو

دے کر اسے کچن میں جانے دیا۔ وہ پلر کے پاس جا کر چھپ گئی۔ دادی کا دھیان اس طرف نہیں تھا۔

''میاؤں۔۔۔!! میاؤں۔۔۔!! میاؤں۔۔۔!!'' مانو کی آواز نکال کر دادی کے دماغ میں خلل ڈالا۔ دادی نے ادھر اُدھر دیکھا۔ مگر کچھ نہیں تھا۔ جیسے ہی دادی کی نگاہیں دوبارہ نیچے ہوئیں۔

''میاؤں۔۔۔!!'' بلی کی طرح نحیف سی آواز اس نے نکالی۔

''ارے کم بخت مانو کی آواز آرہی ہے۔۔۔!! مگر نظر نہیں آرہی ہے۔۔۔!! کہاں ہے؟'' دادی نے ادھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ مگر مانو نظر میں نہ آئی۔

''ارے کہیں مانو بد بخت۔۔۔!! کچن میں تو نہیں گھس گئی۔۔۔!! سارا دودھ جھوٹا کر دے گی۔۔۔!! یہ کچن کا دروازہ صبح صبح کس منحوس نے کھلا چھوڑ دیا۔۔۔!! ارے امرینہ تیرا بیڑہ غرق ہو جائے۔۔۔!! تیرے اوپر ٹھنڈر گر جائے۔۔۔!!'' دادی اُٹھیں اور لاٹھی سنبھالی اور کچن کی طرف چلیں۔ امرینہ جلدی سے پلر سے نکل کر مین گیٹ کی طرف چلی گئی۔ دادی نے بلی کو کچن میں دیکھا۔ تو مضبوط لاٹھی سے اسے پورے شدت سے مارا۔ بلی ایسے باہر بھاگی جیسے کوئی موت کا فرشتہ دیکھ لیا ہو۔ وہ میاؤں تک نہ کر سکی۔

☆.....☆.....☆

''ہائے۔۔۔!! شکر ہے۔۔۔!! بچت ہوگئی۔۔۔!! منحوس ماری راستہ روک کے بیٹھی تھی۔۔۔!! وہ بھی کسی ناگن کی طرح۔۔۔!! اب ہماری دادی کو باقی جسم کی طرح، زبان سے بھی کمزور ہونا چاہیے۔۔۔!! اب تو لاٹھی کے سہارے آگئی ہیں، مگر زبان کی مزید مرچی بن گئی ہیں۔۔۔!! ہر وقت مرچی کی سطح پر بیٹھی رہتی ہیں۔۔۔!!'' امرینہ نے شکر ادا کیا۔ اور باہر ہی وین کا انتظار کرنے لگی۔ صبح صبح سڑک پر ایک لڑکا بائیک پر ون ویلنگ پر گھما کر گزرا۔ امرینہ نے اسے دیکھا۔

''چھچھورا۔۔۔!!'' امرینہ نے منہ بگاڑا۔ وہ لڑکا کچھ دیر کے بعد دوبارہ ون ویلنگ کر کے اس کے سامنے سے گزر گیا۔

''جاہل۔۔۔!!'' امرینہ نے آنکھیں ٹیڑھی کر لیں۔ اب وہ پھر سے اس کے پاس سے گزرا۔

''سرکس کا بندر۔۔۔!! گدھا کہیں کا۔۔۔!! نوٹنکی سالا۔۔۔!! نیولہ، سنپولیا۔۔۔!!'' امرینہ نے ناک ٹیڑھی کی۔ اب وہ پھر آرہا تھا۔

''لو بھیا۔۔۔!! وین والا مردود کہاں مر گیا؟ اب اس سرکس کے بندر کا تماشا دیکھنا پڑے گا۔۔۔!! ایسا لگ رہا ہے۔۔۔!! جیسے بندر کو کسی نے بائیک پر بیٹھا دیا ہو۔۔۔!! ایسے دانت دکھا رہا ہے، جیسے صبح صبح کلوز اپ سے برش کر لیا ہو۔'' امرینہ نے اسے دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ اور جوش میں آگیا۔

''لڑکی لائن دے رہی ہے۔۔۔!!'' اور تیزی سے آنے لگا۔ اب تو وہ وقفے وقفے سے اسے بھی دیکھنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے میں شغل میلا لگانے لگیں۔

''لو بھیا!! اچھا ٹائم پاس ہے۔۔۔!! اب میں اس کی آنکھوں میں دیکھوں گی۔۔۔!! یہ میری آنکھوں میں دیکھے گا۔۔۔!! اور اس مردود کا دھیان بٹ جائے گا۔۔۔!! اللہ کرے۔۔۔!! گر جائے۔۔۔!! ایسا دیکھ رہا ہے۔۔۔!! جیسے بڑا بھائی ہو۔۔۔!! بس کچا چبا جائے گا۔۔۔!!'' وہ امرینہ کو دیکھ رہا تھا۔ اور امرینہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ آگے دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ اور اسی لمحے بائیک کا توازن بگڑا، اور وہ کھمبے سے ٹکرا گئی۔ وہ منہ کے بل گرا۔ بائیک اس کے اوپر گر گئی۔

''اوئے، لمبے کی کھمبے سے ٹکر ہوگئی، ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔!!'' امرینہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''اب آگیا مزہ۔۔۔!! اللہ کرے۔۔۔!! مر جائے۔۔۔!! یا پھر دونوں ٹانگیں ٹوٹ جائیں۔۔۔!! کم بخت پھر ایسا شو آف تو نہ کر سکے گا۔۔۔!!'' وہ لڑکا اس کی طرف مدد کے لیے دیکھ رہا تھا۔ اس کے کولہوں پر گہری چوٹیں آئی تھیں۔ وہ دانت نکال کر بری طرح سے ہنس رہی تھی۔ اچانک اس کے پاس وین آکر رک

گئی۔اس نے اس لڑکے کو آخری بار منہ سے زبان نکال کر اوہ ہو کیا۔اور وین میں چڑھ کر بیٹھ گئی۔

''کمینی کہیں کی۔۔۔!! بھاؤ تو ایسے دے رہی تھی۔۔۔!! جیسے مجھ سے پٹ گئی ہو۔۔۔!! ایسے مقناطیسی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔جیسے مجھ سے متاثر ہوگئی ہو؟'' وہ کراہ کر گالی نکالنے لگا۔وین اب جا رہی تھی۔وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

''یار۔۔۔!! تو میرا ہاتھ دیکھ۔۔۔!! میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟'' ملیحہ نے امرینہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''یار۔۔۔!! دکھا۔۔۔!! پہلے تو تو میری بات کو ذرا سا بھی سیریس نہیں لیتی تھی۔۔۔!! یہ بدلاؤ کیسے آ گیا۔۔۔!!'' امرینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔اور غور سے دیکھنے لگی۔وین کے ڈرائیور کے کان ان ہی لڑکیوں پر کھڑے ہو گئے تھے۔

''امرینہ۔۔۔!! تو نے دعا کا ہاتھ دیکھ کر جو کچھ کہا تھا۔۔۔!! وہی ہوا۔۔۔!! سو فیصد وہی ہوا۔۔۔!!'' پیچھے بیٹھی لڑکی سیٹ سے سر نکال کر بولی۔یہ میرب تھی۔

''دعا کی منگنی ٹوٹ گئی۔۔۔!!'' امرینہ اپنی سیٹ سے جیسے اچھل پڑی۔اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں۔۔۔!! بالکل ٹوٹ گئی۔۔۔!! ہمیں تو خود کل پتہ چلا۔۔۔!! بے چاری دعا۔۔۔!! بہت رو رہی تھی۔۔۔!! خود کو کوس بھی رہی تھی۔۔۔!! اپنے منگیتر کو بہت لمبی لمبی بددعائیں دے رہی تھی۔۔۔!!'' ملیحہ نے افسوس کیا۔

''ویسے۔۔۔!! دعا کو میں نے منع بھی کیا تھا۔۔۔!! اس کا ہاتھ یہی بتا رہا تھا۔۔۔!! یہ منگنی جلد ٹوٹنے والی ہے۔۔۔!! ویسے کیا وجہ تھی؟'' امرینہ نے سب کو دیکھا۔

''یار۔۔۔!! تو تو چھا گئی۔۔۔!! کل تیری غیر موجودگی میں ہم نے پورے کالج کو بتا دیا ہے۔۔۔!! کالج کی آدھی لڑکیاں تجھ سے ہاتھ دکھلانا چاہتی ہیں۔۔۔!!'' ملیحہ پیار سے بولی۔امرینہ کی آنکھیں باہر آئیں۔

''کیا کہہ رہی۔۔۔!! ملیحہ تمہیں پتہ بھی ہے۔۔۔!! میں یہ علم کبھی کبھار ہی استعمال کرتی ہوں۔۔۔!! ہاتھ کی لکیریں بہت مشکل سے سمجھ میں آتی ہیں۔۔۔!! میں کسی کا ہاتھ اب فری میں دیکھنے والی نہیں ہوں۔۔۔!! وہ تم لوگوں کا دوستی کی خاطر دیکھ لیتی تھی۔۔۔!! اور تم سب یقین ہی نہیں کرتی تھی؟'' امرینہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔آنیہ اسے گھور کر دیکھنے لگی۔

''تمہارا مطلب کیا ہے؟'' آنیہ نے پوچھا۔جو کچھ سوچ رہی تھی۔

''اب میں اپنی فیس لوں گی۔۔۔!! بھائی۔۔۔!! مستقبل ایک بے حد خطرناک چیز ہے۔۔۔!! اس کے تانکا جھانکی پر تم لوگ مجھے پیسے دو گے۔۔۔!! میری فیس ہے۔۔۔!! میں محلے کی لڑکیوں کا ہاتھ بھی دیکھتی ہوں۔۔۔!! وہ مجھے فیس دیتی ہیں۔۔۔!!'' امرینہ نے چالاکی سے کہا۔

''لو جی۔۔۔!! گل ای مکھ گئی۔۔۔!! یہ کنجوس لڑکیاں تمہیں پیسے دیں گی؟ یہ تو خود دوسروں کی جیبوں پر نظریں گاڑ کے بیٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔۔۔!! ہوائے فرینڈز بے چاروں کو ٹائم پاس اور ان کے پیسوں کو اوور ٹائمنگ سمجھ کر اپنا خرچا پانی برابر کرتی ہیں۔۔۔!!'' سویرا نے منہ بنا کر کہا۔

''ہاں تمہاری طرح۔۔۔!! جو نہیں دے گی۔۔۔!! وہ مستقبل سے خبردار کیسے ہو سکے گی۔۔۔!! اور جو نہیں ہو سکے گی۔۔۔!! وہ اپنا فیوچر کیسے سیف کر سکے گی؟ اس لیے تم سب کو اپنی جیبیں ہلکی کرنی پڑے گی۔۔۔!!'' اسی طرح امرینہ نے بھی اس کو سرد مہری کے لہجے میں جواب دیا۔

''اس سے تو اچھا ہے۔۔۔!! بندہ بے خبر ہی اچھا ہے۔۔۔!! ویسے بھی بھیانک مستقبل کی پیش گوئیاں کرنے سے انسان ایسا ہی سکھ سے رہے۔۔۔!!''

نادیہ نے اپنی رائے ضروری سمجھی۔

''اچھا۔۔۔!! میرا ہاتھ تو دیکھ لو۔۔۔!! میں پیسے دے رہی ہوں۔۔۔!! ان کنجوسوں کو چھوڑو، اگر تمہاری پیشن گوئی سچی ثابت ہوگئی، تو سمجھو تم چھا جاؤ گی۔ پھر یہی لڑکیاں تمہیں پیسے دیں گی۔'' آنیہ نے دوبارہ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''پہلے مجھے پیسے چاہیے۔۔۔!! وہ بھی پورے پانچ سو۔۔۔!! ایک روپیہ بھی کم نہیں لوں گی۔۔۔!! اور نہ ہی زیادہ۔۔۔!! بھائی 'فیس' فیس ہوتی ہے۔۔۔!! اس میں کچھ رعایت نہیں کرسکتی۔۔۔!!'' امرینہ کی بات پر آنیہ نے ہاتھ ایسے پیچھے کرلیا۔ جیسے وہ بجلی کی طرح کرنٹ مار دے گی۔

''ویسے۔۔۔!! اگر پچاس سو روپے پر بات بن سکتی ہے۔۔۔!! تو ٹھیک ہے۔۔۔!! میرے پاس پانچ سو نہیں ہیں۔۔۔!! ابھی تو اتنی بڑی پامسٹ نہیں بن سکی ہے کہ ڈائریکٹ پانچ سو پر چلی جائے۔۔۔!!'' آنیہ نے سب کو دیکھا۔ امرینہ نے نفی میں گردن ہلائی۔

''پلیز۔۔۔!! امرینہ۔۔۔!! مان جاؤ نا۔۔۔!! بے چاری۔۔۔!! ان چیزوں پر بلیو بھی نہیں کرتی ہے۔۔۔!! اور پہلی مرتبہ تو آنیہ سیریس ہوئی ہے۔۔۔!! ورنہ ہمیشہ تیرا مذاق اڑاتی تھی۔۔۔!!'' سویرا نے امرینہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ امرینہ جو گہری سوچ میں گم تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اوکے سو روپے دے دو۔۔۔!! دوستی کا لحاظ کررہی ہوں۔۔۔!!'' آنیہ نے جھٹ سے سو روپے اس کی طرف بڑھائے۔ اور پوری قوت سے امرینہ نے جھپٹ لیے۔ اب وہ اس کا ہاتھ دیکھ رہی تھی۔

''آنیہ۔۔۔!! ابھی تمہارے ہاتھ کی لکیریں الجھی ہوئی ہیں۔۔۔!! ویسے تم کسی سے پیار تو نہیں کرتی ہو؟'' امرینہ نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہ دھواں دھواں سا ہوگیا۔ ساری لڑکیاں غور سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

''نن نہیں۔۔۔!! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔!!'' آنیہ نے گھبرا کر کہا۔

''ا وہو۔۔۔!! گھبرا کیوں رہی ہو۔۔۔!! ریڈی ہوجاؤ۔۔۔!! تمہاری زندگی میں کوئی بہت جلد دستک دینے والا ہے۔۔۔!! اس کے نام کا پہلا حرف A یا S میں سے ہوسکتا ہے۔۔۔!! وہ تمہیں بہت خوشیاں دینے والا ہے۔۔۔!! ویسے یہ پیش گوئیاں تو ہزار روپے کی تھیں۔۔۔!! مگر خیر جانے دو۔۔۔!! کیونکہ سب اچھا دکھ رہا ہے۔۔۔!!'' امرینہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''واؤ۔۔۔!!'' سب لڑکیاں کورس کی صورت میں بولیں۔

''اور کوئی خطرے کی بات؟'' آنیہ نے پوچھا۔ وہ ابھی بھی گھبرائی ہوئی تھی۔

''نہیں فی الحال تو نظر نہیں آرہی ہے۔۔۔!! ویسے۔۔۔!! لگتا ہے۔۔۔!! اس لڑکے کا تعلق کسی اچھے خاندان سے لگ رہا ہے۔۔۔!! بار بار تمہارے پیار کی لکیریں تمہاری قسمت کی لکیروں سے میل کھا رہی ہیں۔۔۔!! دونوں کی لکیریں ہر موڑ پر مل رہی ہیں۔۔۔!!'' امرینہ کی بات سن کر وین میں لڑکیوں کے قہقہے گونج گئے۔ اب امرینہ اور بھی کچھ باتیں بتا رہی تھی۔ وین کچھ دیر بعد جھٹکے سے رک گئی۔ سب لڑکیاں اتر کر کالج جانے لگیں اور آنیہ کا چہرہ تو مانو گلابی ہوگیا تھا۔ جو بھی تھا۔ اس کی قسمت میں بقول امرینہ کے کچھ برا نہیں ہونے والا تھا۔ تو وہ کیونکر پریشان ہوسکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

فری کلاس میں امرینہ بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی، اس نے اس دن دعا کا ہاتھ دیکھ کر پیش گوئی کی تھی۔ تب سب نے اس کا کتنا مذاق اڑایا تھا۔ اور پھر جو کچھ اس نے کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ آج یہ لڑکیاں اس سے ہاتھ دیکھنے کی باتیں کررہی تھیں۔ مگر وہ فری میں کسی کو زہر تک نہیں دینا چاہتی تھی۔

''دعا سے کہا بھی تھا۔۔۔!! یہ منگنی مت کرو۔۔۔!! ٹوٹ جائے گی۔۔۔!! مگر اس پر تو شادی کا جنون طاری تھا۔۔۔!! اچھا ہوا۔۔۔!! سبق مل گیا۔۔۔!! اب دوسروں کی بات بھی مانا کرے گی۔۔۔!!'' ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اچانک نبیلہ اس کے پاس چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں دو پلیٹ چپس کی تھیں۔ ایک وہ اس کے لیے لائی تھی۔

''امرینہ۔۔۔!! میں تمہارے لیے چپس لائی ہوں۔۔۔!!'' وہ اس کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔

''ہاں۔۔۔!! شکریہ۔۔۔!! ویسے تم اتنی سخی کب سے ہوگئی ہو۔۔۔!! سدا کی کنجوس مکھی چوس ہو۔۔۔!! کہیں کوئی کام تو نہیں پڑ گیا۔۔۔!! جو بیس روپے کے چپس پر ٹرخا رہی ہو؟'' امرینہ نے چپس لے کر کھانے شروع کردیے۔ نبیلہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ بھرم نام کا یہ لڑکی کسی کا نہیں رکھتی تھی۔

''ہاں۔۔۔!! وہ میں نے سنا ہے۔۔۔!! تم بہت اچھی پامسٹ ہو۔۔۔!! ہاتھ دیکھ کر مستقبل کی پیش گوئیاں کرتی ہو۔۔۔!!'' نبیلہ نے اپنے آنے کا مقصد بھی بیان کردیا۔

''وہ تو میں ہوں۔۔۔!! مگر تم نے شاید آدھی بات سنی ہے۔۔۔!! میں اس سب کی فیس بھی لیتی ہوں۔۔۔!! میری فیس پانچ سو روپے ہے۔۔۔!!'' نبیلہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔

''پا۔۔۔!! پانچ سو۔۔۔!! لا، میری چپس کی پلیٹ۔۔۔!! واپس کر۔۔۔!! میں نے کوئی ہاتھ واتھ نہیں دکھلانا۔۔۔!!'' وہ آدھا کھا چکی تھی۔ پھر بھی پلیٹ نبیلہ نے لے لی۔

''لے۔۔۔!! اپنی پلیٹ۔۔۔!! تیری طرح بھوکی نہیں ہوں۔۔۔!! چلی آئی ہے۔۔۔!! بیس روپے میں ہاتھ دکھلانے والی۔۔۔!! ہونہہ۔۔۔!! ویسے بنا ہاتھ دیکھے میں تجھے ایک پیش گوئی تو بتا ہی سکتی ہوں۔۔۔!!'' نبیلہ اس سے پلیٹ لے چکی تھی۔ نبیلہ جو جانے والی تھی، رک گئی۔

''کیا؟'' نبیلہ نے ٹیڑھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''ادھر۔۔۔!! آ۔۔۔!! تیرا ہاتھ تو ایک نظر دیکھ لوں۔۔۔!! ایک پیش گوئی تو میں کردوں گی۔''

نبیلہ اس کے قریب آگئی، اس نے چپس کی پلیٹ لے لی اور ایک نظر اس کا ہاتھ دیکھ کر منہ چڑایا۔ اب وہ چپس اٹھا کر کھا رہی تھی۔

''کیا دیکھ لیا؟ کیا گھبرانے والی بات تو نہیں ہے۔۔۔!!'' نبیلہ فکر سے پوچھنے لگی۔

''بہن۔۔۔!! اچھی خبر نہیں ہے۔۔۔!! تیرے گھر کے اوپر کالے سائے منڈلانے لگے ہیں۔۔۔!!'' ناک چڑھا کر اس نے احسان جتانے والے انداز میں کہا۔ ایک ساتھ کئی چپس اٹھا کر وہ منہ میں ڈال چکی تھی۔

''مطلب کیا ہے؟'' نبیلہ پریشان ہوگئی۔

''تمہیں کوئی بہت بڑا غم ملنے والا ہے۔۔۔!!'' جیسے ہی چپس کی پلیٹ وہ صاف کر گئی۔ اس نے کہا۔ نبیلہ اٹھ گئی۔ اور جانے لگی۔ وہ پریشانی میں پلیٹ بھی وہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اور وہ پلیٹ بھی اٹھا کر اپنے پاس گود میں رکھ لی۔ اب وہ مزے سے چپس کھانے لگی تھی۔

''دفع مردود کہیں کی۔۔۔!! بڑی آئی ہے۔۔۔!! بیس روپے میں ہاتھ کھلانے والی۔۔۔!! ایسی منحوس خبر دی ہے۔۔۔!! جو کبھی بھی پوری نہیں ہوسکتی ہے۔۔۔!!'' اب وہ ہنس رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

گھر میں امرینہ سخت بور ہو رہی تھی، اوپر سے دوپہر بھی ڈھلنے لگی تھی۔ سب لوگ سو چکے تھے۔ اگرچہ موسم گرمی کا نہ تھا۔ مگر اس کے گھر والوں کو عادت تھی کہ دوپہر کو سوجاتے تھے۔ اور پھر رات دیر تک جاگتے رہتے تھے۔ اسے دوپہر کو نیند نہیں آتی تھی۔ وہ کچھ دیر تک ٹی وی دیکھتی رہی۔ مگر بور ہوگئی۔ وہی گھسے پٹے ساس بہو کے ڈرامے دیکھ کر وہ تنگ آچکی تھی۔ اوپر سے بیرو کبھی

ساس کی طرف کبھی بیوی کی سائیڈ پر ہوجاتا تھا اور دونوں کی سیاست میں بری طرح سے مسلا جاتا تھا۔

''ہائے ربا۔۔۔!!اس وقت تو سامنے گھر والا پتنگ اڑاتا ہے۔۔۔!!جا کے اس کا تماشا کیوں نہ کروں۔۔۔!!تھوڑا سا آنکھ مٹکا بھی ہوجائے گا۔۔۔!! وہ بھی نظر بچا کے۔۔۔!!''اس نے چٹکی بجائی،اور ہوا کی طرح لہراتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف جانے لگی۔جیسے ہی وہ چھت پر پہنچی۔سامنے گھر کے چھت پر اس کا ہم عمر لڑکا پتنگ اڑا رہا تھا۔وہ اسے دیکھتی رہی۔پھر اس نے پتنگ کو دیکھا۔وہ کافی اوپر تھی۔ وہ واپس نیچے بھاگ کر گئی۔اور نائر کا پتنگ اور چرخی اٹھا کر اوپر آئی۔نائر کے شوق بھی نرالے تھے۔اس نے اپنی لپ اسٹک سے پتنگ پر اپنا آدھا موبائیل نمبر لکھا۔اس نے پتنگ اڑانی شروع کردی۔اب اس کی پتنگ رفتہ رفتہ برابر والے گھر تک چلی گئی۔اور پھر اس نے ڈھیل دے کر پتنگ اس کے کھوٹے پر گرادی۔اس کی نگاہوں کا رخ اب اسی پر جم کر رہ گیا تھا۔

وہ لڑکا حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔لڑکی کو دیکھ کر وہ اچھل گیا۔اس نے پتنگ کو ہوا میں معلق کردیا۔اور اس کی طرف اشارہ کرکے ہاتھ ہلایا۔امرینہ نے ہاتھ سے اوکے کا نشان بنایا۔پھر اس نے امرینہ کا پتنگ اٹھایا۔امرینہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اس کا موبائیل نمبر مانگا۔وہ نیچے بھاگ کر گیا،اب اس کے ہاتھ میں پین تھا،اس نے اپنا نمبر لکھ دیا۔امرینہ نے ڈور کھینچی۔ اب وہ پتنگ اڑا رہی تھی۔اور لڑکا اپنی پتنگ کا ڈور تھام چکا تھا۔کچھ دیر تک دونوں میں اشارے بازی چلتی رہی۔پھر امرینہ نے اپنی پتنگ کھینچ کر اتارلی اور جلدی سے اس لڑکے کا نمبر دیکھا۔وہ نمبر حاصل کرچکی تھی۔

''اُف۔۔۔!! اس بدبخت کا نیٹ ورک بھی دوسرا ہے۔۔۔!!اب تو بس صرف مس کال پر گزارا کرنا پڑے گا۔۔۔!!یہ ہی مجھے کال کرے گا۔۔۔!!'' پھر بھی اس نے نمبر نوٹ کرلیا اور پتنگ پھاڑ کر نیچے چلی گئی۔وہ سیڑھیوں میں تیزی سے جا رہی تھی۔جیسے ناچ رہی تھی۔اچانک وہ رک گئی۔

''اس کم بخت نے اپنا نام تک نہیں لکھا۔۔۔!! کیا نام ہوگا؟ میں،بھی پتنگ باز سجنا کے نام سے اس کا نام سیو کرلوں گی۔۔۔!!اب دوپہری کا وقت اسی کے ساتھ اچھا ٹائم پاس ہوگا۔۔۔!!''وہ گول گول گھومی۔پھر کمرے میں آگئی۔اور موبائیل نگاہوں کے سامنے کردیا۔اس نے موبائیل نگاہوں کے سامنے کیا۔اور اس کا نمبر ایپ پر دے کر سرچ کیا۔اس کی آئی ڈی اب نگاہوں کے سامنے آگئی۔اس کا نام اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

''رُخام۔۔۔!!اب یہ میرا ہے۔۔۔!!صرف میرا۔۔۔!!!اگر میرے علاوہ،اس کی کوئی دوسری گرل فرینڈ ہوئی،تو میں اس لڑکی کا حشر نشر کردوں گی۔۔۔!!!اس کو کچھ نہیں کہوں گی،بس صرف اپنے لیے ایک دوسرا پیارا سا بوائے فرینڈ ڈھونڈ لوں گی۔۔۔!!''وہ ہنس رہی تھی۔اس نے اس کی آئی ڈی پر ہائے کا میسج بھیج دیا۔اس نے سب سے پہلے اپنا نام ملک شرجیل سے چینج کرکے پریٹی ڈولی کرلیا۔اس کے ساتھ جتنی لڑکیاں ایڈ تھیں،وہ،جوان کو ٹائم پاس کے نام پر بے وقوف بنا کر رہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

رُخام بھی اسے جواب دے چکا تھا۔دونوں میں آدھی رات تک چیٹ ہوتی رہی تھی۔آج وہ دادی کے عتاب سے بچنا چاہ رہی تھی۔تبھی سوئی آنکھوں سے جاگ کر نماز پڑھ لی تھی۔وہ بھی بیٹھ کر۔دادی کب اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ اس نے جیسے ہی سلام پھیرا۔دادی کو اپنے پیچھے کھڑا دیکھ کر اس کی سانس ہی اٹک گئی۔

''کم بخت۔۔۔!! یہ نماز دوبارہ پڑھ۔۔۔!!آخری رکعت تو نے بیٹھ کر پڑھی ہے۔۔۔!!''دادی سانپ کی مانند پھنکاریں تو وہ اچھل کر جائے نماز سے کھڑی ہوگئی۔

''دادی۔۔۔!!پڑھ لی۔۔۔!!!اب کیا دوبارہ

پڑھوں؟ میری ٹانگوں میں درد ہو رہا تھا۔۔۔!!'' دادی اس کی بات سن کر رک گئیں۔

''بیٹا ۔۔۔!! یہ نماز تم میرے ڈر سے نہ پڑھو۔۔۔!! میں خفا ہوں گی۔۔۔!! تو تم اللہ کے ڈر سے پڑھو۔۔۔!! ایسے پڑھو کہ اللہ خفا نہ ہو۔۔۔!! سارا دن اوپر نیچے، ناچتی پھرتی ہو، تب تو تمہیں کوئی درد نہیں ہوتا ہے۔'' پہلی بار دادی نے اسے پیار سے سمجھایا تھا۔

وہ بھی سوچ میں پڑ گئی، واقعی ایسا ہی تھا۔ نماز اس نے دادی کے ڈر سے پڑھی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اور دوبارہ نماز پڑھی۔ جب اس نے سلام پھیرا تو دادی کی نصیحت جو کچھ دیر کے لیے اس کے دل پر اثر انداز ہوئی تھی۔ وہ بھی دادی کے ساتھ ہی کمرے سے باہر جاتے ہی نکل گئی تھی۔

اس نے موبائیل اٹھایا تو اپنی آئی ڈی چیک کی۔ وہاں رُخام نے اسے بے شمار اپنی خوبصورت تصویریں بھیجی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک اس کی تصویریں دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔ پھر اس نے موبائیل سائیلنٹ کر کے بیگ میں ڈال دیا اور باہر ناشتہ کرنے آ گئی۔ کچھ دیر میں ناشتہ کر چکی تھی۔ اب وہ کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ وہ باہر سڑک پر آ گئی۔ اس کے ناخن اچھے خاصے بڑے تھے۔ جس پر ہلکے رنگ والی نیل پالش چڑھا رکھی تھی۔

وین والا آج شاید پھر سے کچھ دیر کر رہا تھا۔ وہ گھر کے باہر لوگوں کو دیکھنے لگی۔ اچانک رُخام سامنے والے گھر سے جاگنگ ٹریک سوٹ میں باہر نکلا۔ اس نے کانوں میں ایم پی تھری لگایا تھا۔ وہ اسی کی طرف آ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ وہ ایک دوسرے کو ہنس کر دیکھنے لگے۔ اسی لمحے وہ بائیک والا زن سے ان کے سامنے سے ون ویلنگ کرتے ہوئے گزرا، رُخام نے اس کی طرف فلائنگ کس اچھالا۔ اس نے کیچ والے انداز میں ایک ہاتھ سے پکڑ کر دل سے لگایا۔ جیسے محفوظ کر رہی ہو۔ اب وہ رُخام کو آنکھ مار رہی تھی۔ جیسے ہی رُخام مخالف سڑک پر آیا۔

اچانک اس کے قریب وین آ کر رک گئی۔ وہ ہنستے ہوئے وین میں چڑھ کر چلی گئی۔ رُخام اپنی جگہ پر ساکت کھڑا رہ گیا۔ اب وہ ہنس رہا تھا۔ اسی لمحے مخالف سمت سے وہی لڑکا ون ویلنگ کرتے ہوئے تیز رفتاری سے گزر گیا۔

''یار۔۔۔!! کیا لڑکی ہے؟ ٹائم تو یوں چٹکی میں پاس ہو جاتا ہے۔۔۔!! ٹائم پاس کے لیے بہت اچھی چیز مل گئی ہے۔۔۔!! ویسے بھی میری ایک بھی گرل فرینڈ نہیں ہے۔۔۔!!'' وہ مڑا، اور سڑک پر وین کے پیچھے دوڑنے لگا۔

امرینہ نے وین کے بیک مرر سے دیکھا۔ وہ کچھ دیر تک اس کے وین کے پیچھے جاگنگ کے انداز میں دوڑتا رہا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ وین میں لڑکیاں اس کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرنے لگی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''یہ سحرش ہے۔۔۔!! اس کو ہاتھ دیکھانا ہے۔۔۔!!'' فزکس کی کلاس میں ایک دوسری کلاس کی لڑکی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی دوست مہر نے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ انداز میں بتایا۔

''مہر۔۔۔!! تم نے اسے میرے فیس کے بارے میں بتایا تو ہے۔۔۔!!'' امرینہ نے اس کی پسلی میں چٹکی کھائی۔ وہ بالکل سیدھی ہو گئی۔ مگر میم ناہید کے سامنے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میم ناہید بورڈ پر کچھ لکھ رہی تھیں۔

''امرینہ۔۔۔!! بے غیرت۔۔۔!! ہاں بتایا ہے۔۔۔!! پورے پانچ سو دینے کو تیار ہے۔۔۔!! جس میں تو مجھے آدھے دے گی؟'' آہستہ آواز میں مہر نے کہا تو امرینہ نے غصے سے مہر کو دیکھا۔

''اچھا۔۔۔!! اس کو فری کلاس میں لے آؤ۔۔۔!! ابھی اسے بھگا دو۔۔۔!! ورنہ میم ناہید سے خوب بے عزتی ہونے والی ہے۔۔۔!!'' اچانک میم ناہید نے سب کو مڑ کر دیکھا۔ وہ وائیٹ بورڈ پر کوئی

فارمولا سولو کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ اچھی خاصی باوقار عورت تھیں۔

''یہ کون بے شرم بات کر رہی ہے۔'' نیم ناہید نے سب کو دیکھا۔ سب لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

''یہ کیا ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہی ہو؟ نو ٹا کنگ نو واکنگ، ان مائی کلاس۔۔۔!! ورنہ وہ بے شرم سیدھی کلاس سے باہر نکل جائے۔۔۔!! اگر مجھے پتہ چلا تو میں خود اسے کھڑا کر کے باہر بھیجوا دوں گی۔۔۔!!'' میم ناہید نے اپنی بمبار آواز میں کہا تو سب لڑکیاں خاموش ہوگئیں۔ سحرش کو ناہید نے اشارے سے جانے کو کہا تو وہ آرام سے اٹھی۔ اور باہر چلی گئی۔ میم ناہید سمجھی، باتیں کرنے والی باہر چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

فری کلاس میں وہ ڈیسک کے اوپر چڑھی، میز کو ڈھول سمجھ کر بجا رہی تھی۔ باقی لڑکیاں اس کو ہمہ تن گوش ہو کر دیکھ رہی تھیں۔

''پتنگ باز بجناوے۔ تیرے ناز بجنا وے۔ میرے نال تو پیچا لڑالے۔ اکھیوں اکھیوں کا ساز بجناوے۔

بڑا دغا باز دغا باز بجناوے۔۔۔'' وہ اب گانا بھی گانے لگی۔ ساری لڑکیاں اس کے اردگرد تالیاں پیٹنے لگیں۔ وہ اور زور سے ڈائس بجانے لگی۔ اچانک وہ رک گئی۔ اس نے رقیہ کو دیکھا۔

''یار رقیہ۔۔۔!! پلیز ذرا دو تین ٹھمکے تو مار نا۔۔۔!!'' رقیہ نے سب کو دیکھا۔ پھر شرما کر کہا۔

''مجھے ناچنا نہیں آتا ہے۔۔۔!! میں میراثن تھوڑی ہوں۔۔۔!!'' اس نے چہرہ بالی کی طرح ہلایا۔

''ارے۔۔۔!! میں کوئی گانا گانے سے میراثن بن جاؤں گی؟ بس ناچنے میں کیا ہے۔۔۔!! یہ پیر ادھر کو ہلایا۔۔۔!! دوسرا اُدھر کو۔۔۔!! تھوڑا سا تشریف کا ٹوکرا مٹکایا۔۔۔!! ہاتھوں سے گھوم کر یوں یوں کیا۔۔۔!! بس ہوگیا ناچ گانا۔۔۔!!'' اس میں میراثی پن کہاں سے آگیا؟'' اس نے باقاعدہ انداز میں رقیہ کا استاد بن کر دکھایا۔

''یہ شرمیلی برتن۔۔۔!! کہاں ناچنے والی ہے۔۔۔!! میں ناچتی ہوں۔۔۔!!'' انعم نے میدان میں اتر کر کہا۔ اس نے دوپٹہ کندھے سے گزار کر سائیڈ سے باندھ لیا۔ اور مدھو بالا بن کر خوب رقص کرنا شروع کر دیا۔ اب وہ وہی گانا پھر سے سنا رہی تھی۔ باقی تالیاں بجا رہی تھیں۔ مگر انعم کا بے ہنگم ڈانس دیکھ کر لڑکیاں زیادہ تر ہنس رہی تھیں۔

''اب مہر کی باری ہے۔۔۔!!'' امرینہ نے جلدی سے کہا۔

''نہیں، میں تو اپنے بھائی کی شادی میں نہیں ناچی ہوں؟ ہمارے گھر میں اس چیز پر سخت پابندی ہے۔'' مہر نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپانا چاہا۔

''اوئے مکر نہ کر، میں تجھے خوب جانتی ہوں۔ شاباش میں گانا گاتی ہوں۔ بس تھوڑا سا ناچ لینا ہے۔۔۔!!'' امیرنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جیسے میدان میں چھوڑ دیا۔

''نہیں، مجھے کہاں ناچنا آتا ہے؟ مجھے شرم آتی ہے۔'' مہر نے نا، نا میں گردن ہلائی۔

''ارے، ورنہ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔۔۔!!'' امرینہ نے غصے سے اس پر آنکھیں نکالیں۔ مہر سب کو دیکھتی رہی۔ پھر جیسے میدان میں تیار ہو کر کھڑی ہوگئی۔

''ذرا ڈھولکی بجاؤ گوریوں۔ میرے سنگ، سنگ گاؤ گوریوں، یہ گھڑی ہے ملن کی، اس بجن سے بجن کی۔۔۔'' امرینہ نے گانا شروع کر دیا، اور مہر نے وہ ٹھمکے مارے کہ سب لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھتی رہ گئیں۔

☆.....☆.....☆

بریک میں وہ گراؤنڈ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جب سحرش اس کے پاس آگئی۔ اس نے سحرش کو دیکھا۔ وہ قبول صورت تھی۔ مگر قد میں بہت لمبی تھی۔ مگر وہ اپنا

خیال بالکل بھی نہیں رکھتی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا چہرہ سانولہ سا پڑ گیا تھا۔

''ہاں۔۔۔!! تم وہی ہو نا۔۔۔!! جو فزکس کی کلاس میں ہاتھ دکھانے آئی تھی۔۔۔!!'' اس نے بینچ پر سحرش کو جگہ دی۔ سحرش اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ویسے۔۔۔!! تم فری کلاس میں کیوں نہیں آئی؟ میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔۔۔!!'' امرینہ نے بیٹھا بن کر کہا۔ حالانکہ وہ فری کلاس میں اسے بھول چکی تھی۔ اس نے کچھ نہ کہا۔

''لاؤ آگے کرو ہاتھ۔۔۔!! میں دیکھ لوں۔۔۔!! تمہاری ہاتھ کی لکیریں کیا کہتی ہیں؟'' اس کے چہرے پر نگاہیں ٹکا کر امرینہ نے کہا۔

''نہیں۔۔۔!! وہ میرے پیسے کسی نے چرا لیے ہیں۔۔۔!! میں کل لا کر تمہیں دے دوں گی۔۔۔!! اس لیے میں شرم کے مارے نہیں آسکی۔۔۔!!'' سحرش نے مسکین سی شکل بنائی۔ امرینہ نے کوفت سے اسے دیکھا۔

''اچھا تم نے میری دوست مہر کو پیسے نہیں مجھے دینے ہیں۔۔۔!! کیونکہ وہ اس میں سے آدھی رقم پر نظریں گاڑ کر بیٹھی ہے۔۔۔!! ویسے میں تو آپ کا ہاتھ دیکھ تو لیتی ہوں مگر میرے علم کی کمائی کا آدھا حصہ میں کسی اور کو دے دیتی ہوں۔۔۔!! تم سمجھ سکتی ہو۔۔۔!! بنا پیسے لیے، میرا علم اسے پیسے نہ دینے کی صورت میں کمزور پڑ جاتا ہے۔۔۔!!'' امرینہ نے لبوں پر مسکان بکھیری۔ سحرش سر ہلانے لگی۔

''اچھا۔۔۔!! تم کیوں اتنی پریشان ہو؟'' امرینہ نے اس کی روکھی صورت سے کچھ اندازہ لگایا۔

''میں کسی کو پسند کرتی ہوں۔۔۔!! مگر وہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں کرتا ہے۔۔۔!! کیا میری ہاتھوں کی لکیروں میں میری پسند ہو سکتی ہے؟'' وہ پریشان سی لڑکی دل کی بات لبوں سے نکالنے لگی۔

''ہاں۔۔۔!! جب اس طرح اُجاڑ صورت میں پھرو گی۔۔۔!! تو وہ خاک تمہیں پسند کرے گا۔۔۔!!'' امرینہ نے سوچا۔ مگر اسے کچھ نہ کہا۔

''اچھا۔۔۔!! مگر تم ہاتھ کیوں دکھانا چاہتی ہو؟'' امرینہ نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

''دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔!! میری لکیریں محبت کے معاملے میں کہاں تک جاتی ہیں؟'' سحرش نے اسے دیکھا۔ وہ عجیب سی لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

''او کے۔۔۔!! لاؤ ہاتھ دکھاؤ۔۔۔!! میں ایک منٹ میں دیکھ کر بتاتی ہوں۔'' امرینہ نے ہاتھ پکڑ کر اسے دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ اس کے ہاتھوں کی لکیروں کو بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں جیسے اس کی نظریں گڑی جا رہی تھیں۔ اب وہ اس کی نظروں میں دیکھ رہی تھی۔

''سحرش۔۔۔!! تمہارے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔۔۔!! محبت کے معاملے میں تمہاری لکیریں بہت کمزور ہیں۔۔۔!! وہ تمہیں کبھی نہیں مل سکتا ہے۔۔۔!! ہر لکیر کے آگے ایک دوسری لکیر بند باندھ کر کھڑی ہے۔۔۔!! البتہ تمہاری شادی کسی اچھی جگہ ہوگی۔۔۔!! وہ تم سے بہت محبت کرے گا۔۔۔!! تمہاری شادی کی لکیریں اچھی ہے۔۔۔!! مگر شرط ہے۔۔۔!! اس کے لیے تمہیں اپنے وجود پر کچھ محنت کرنی پڑے گی۔۔۔!! اپنا ذہن کچھ بدلنا ہوگا۔۔۔!! اپنی چاہت کو بھلانا ہوگا۔۔۔!!'' اس نے سحرش کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''امرینہ۔۔۔!! کیا یہ سب سچ ہے؟ میری شادی کس سے ہوگی؟ اپنوں میں یا پھر غیروں میں ہوگی؟ میں تمہاری باتوں پر دھیان دینے کی بھرپور کوشش کروں گی۔۔۔!!'' سحرش نے اسے دیکھا۔ وہ اداس سی لگ رہی تھی۔

''دیکھو۔۔۔!! ایک پامسٹ اتنی صفائی سے کچھ نہیں بتاتا ہے۔۔۔!! جتنا میں نے تمہیں بتایا ہے۔۔۔!! تمہاری شادی اپنوں میں ہوگی۔۔۔!! اور بہت جلد ہونے والی ہے۔۔۔!! منگنی کی لکیریں تو

میں دیکھ رہی ہوں۔۔۔!! مگر تمہیں بھی اپنے آپ کو تبدیل کرنا ہوگا۔۔۔!! ورنہ، اگر یہ رشتہ نہ ہوسکا، تو ساری زندگی کوئی دوسرا رشتہ نہیں آئے گا۔۔۔!!'' گہرے سنجیدہ لہجے میں وہ کہہ رہی تھی۔

''اچھا۔۔۔!! میں کل تمہیں فیس کے پیسے دے دوں گی۔۔۔!!'' سحرش نے کہا۔ امرینہ نے سر ہلایا۔ اور مخالف سمت میں دیکھنے لگی۔ سحرش کہیں کھو سی گئی تھی۔ مگر پھر کچھ دن تک تو سحرش جیسے آئی ہی نہیں۔ امرینہ بھی اپنے پیسے جیسے بھول گئی۔ اسے ان پیسوں کی امید بھی اب نہیں رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

جیسے ہی دوپہر ہوئی، سارے گھر والے قیلولہ فرمانے لگے۔ امرینہ نظر بچا کر چھت پر چلی آئی۔ وہاں پہلے سے رُخام اپنے چھت پر موجود تھا۔ اس کے پاس اپنا موبائیل تھا۔ اس نے رُخام کے نمبر پر کال ملائی۔ وہ اس نے فوراً اٹھائی۔

''ہیلو۔۔۔!! جان۔۔۔!!'' رُخام کے لہجے میں بے چینی تھی۔

''ہائے۔۔۔!! کیا دیکھ رہے ہو؟'' امرینہ نے اسے کہا۔

''بس تمہیں دیکھ رہا ہوں۔۔۔!!'' رُخام نے اسے دیکھنا شروع کر دیا۔

''وہ تو نظر آ ہی رہا ہے۔۔۔!! ویسے کچھ کرنا چاہیے۔۔۔!! تمہارے ذہن میں اس وقت کیا چل رہا ہے؟'' امرینہ نے جوش سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''گیم۔۔۔!! میرے ذہن میں کھیل کی باتیں چل رہی ہیں۔۔۔!! کیا تمہیں کھیل پسند ہوتے ہیں۔۔۔!!'' رُخام کی بات سن کر امرینہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔

''نہیں۔۔۔!! ہاں کبھی کبھار لوڈو کھیل لیتی ہوں۔۔۔!! یا کیرم بورڈ بھی چل جاتا ہے۔۔۔!! ہاں۔۔۔!! pop or sos بھی فرینڈز کے ساتھ کھیل لیتی ہوں۔۔۔!!'' امرینہ نے سوچتے ہوئے بتایا۔

''یہ کونسے بچکانہ گیمز ہے۔۔۔!! جس میں دماغ لڑانا پڑتا ہے۔۔۔!!'' رُخام کی بات اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

''ہے۔۔۔!! میں سمجھی نہیں۔۔۔!! تم کونسے گیم کھیلنا پسند کرتے ہو؟'' امرینہ نے الجھ کر پوچھا۔

''کیا تم نے Touch the body and the soul گیم کا نام سنا ہے۔۔۔!! یا پھر Truth Or Dare'' رُخام کی بات سن کر وہ عجیب سے انداز میں سر کھجانے لگی۔

''نہیں۔۔۔!! یہ کون سے گیم ہیں؟ میں نے کبھی اس کے نام تک نہیں سنے ہیں۔۔۔!!'' امرینہ نے الجھن سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''تم مل سکتی ہو؟ یہ گیم بند کمرے میں کھیلنا پڑتا ہے۔۔۔!! جس میں صرف دو لوگ ہوتے ہیں۔۔۔!! اس میں کچھ رولز ہوتے ہیں۔۔۔!! جو دو لوگوں کو فالو کرنے پڑتے ہیں۔۔۔!!'' رُخام نے اسے جو کچھ بتایا۔ وہ حیران ہوگئی۔

''ہاں۔۔۔!! چلو۔۔۔!! پارک میں ملتے ہیں۔۔۔!! میں برقع پہن کر نکلوں گی۔۔۔!! وہاں جا کے برقع اتار دوں گی۔۔۔!! واپسی چادر میں کراؤں گی۔۔۔!!'' امرینہ نے سوچتے ہوئے بتایا۔ اب دونوں بات کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

گلی میں وہ برقع میں پھر رہی تھی۔ اچانک اس کے قریب موٹر سائیکل رکنے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ رُخام کھڑا تھا۔ وہ جلدی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ جیسے ہی وہ بیٹھی۔ بائیک جیسے ہوا کے دوش پر اڑنے لگی۔

''واؤ۔۔۔!!'' امرینہ نے چیخ ماری۔ اور رُخام کو بھینچ لیا۔ تو رُخام نے بائیک کی اسپیڈ مزید بڑھا دی۔ جیسے ہی وہ دونوں صاف روڈ پر پہنچے۔

''میں ون ویلنگ کرنا چاہتا ہوں۔۔۔!! تم

ڈروگی تو نہیں۔۔۔!! مجھے مضبوطی سے تھام لو۔۔۔!!'' رُخام نے چیخ کر کہا۔

''نہیں۔۔۔!! بالکل بھی نہیں۔۔۔!! میں ڈرنے والی چیز نہیں ہوں۔۔۔!! ڈرانے والی چیز ہوں۔۔۔!!'' امرینہ نے دونوں ہاتھ اس کے پیٹھ سے گھما ڈالے۔ رُخام نے فُل ایکسیلیٹر گھما کر ایک دم سے چھوڑ دیا۔ بائیک ایک پہیہ پر ہوگئی۔ اب وہ دونوں ایک پہیے پر جا رہے تھے۔ رُخام بہت زیادہ ایکسائیڈ تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

''واؤ۔۔۔!! تم ڈرنہیں رہی۔۔۔!! ٹکر کی ہو۔۔۔!! مجھے ٹکر کے لوگ کم ہی ملے ہیں۔۔۔!!'' رُخام نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں۔۔۔!!! ایسے ویسے کو تو میں منہ تک نہیں لگاتی۔۔۔!! جو ڈرپوک، بدھوں لڑکے ہوتے ہیں۔۔۔!! وہ میرے ٹائپ کے نہیں ہوتے ہیں۔۔۔!!'' اس نے ایک دم غرور سے کہا۔ بائیک اسی لمحے میں ہلکی سی لڑکھڑا ئی۔ مگر رُخام نے جلدی سے اسے ٹو ویل پر کر دیا۔ دونوں اب آرام سے جانے لگے۔

''رُخام بہت مزہ آیا۔۔۔!! ونس آگین۔۔۔!! ویسے اس سے پہلے کہیں سرکس میں بائیک گھماتے رہے ہو۔۔۔!!'' اس نے رُخام کے کندھے پر سر رکھا۔ اور اس کے کان میں کہا۔ ابھی بھی وہ دونوں 80 کی اسپیڈ میں جا رہے تھے۔ رُخام ہنس پڑا۔ اس نے پھر سے بائیک ون ویل پر کر دی۔ وہاں قریب ہی ایک دوسرے کار کے اندر لڑکوں نے ان کی ویڈیو بنانی شروع کر دی۔ مگر امرینہ کو کچھ فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ وہ برقع میں تھی۔ اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ وہ آرام سے رُخام کو پکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

دونوں پارک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ امرینہ برقع اتار چکی تھی۔ اب وہ ایسے ہی دوپٹہ کندھے میں ڈال کر رُخام کو دیکھ رہی تھی۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ یہ بہت گیم اچھا ہے۔۔۔!! مگر بہت خطرناک بھی ہے۔۔۔!! ہم کیمرہ لگا کر کھیلیں گے۔۔۔!! یہ منطق مجھے سمجھ نہیں آتی۔۔۔!! ہم دونوں کیا کریں گے؟ کیا تم میری ویڈیو بنا کر اسے پبلک میں آؤٹ کرنا چاہتے ہو؟ اس لیے مجھے ان سب پر مجبور کر رہے ہو؟'' امرینہ رخام کی بات سن کر کچھ پریشان ہوگئی۔

''دیکھو۔۔۔!! سمپل گیم ہے۔۔۔!! دو لوگ ہی کھیل سکتے ہیں۔۔۔!! ہر پلیئر ایک باری کر سکتا ہے۔۔۔!! جب دوسرا پلیئر کھیلے گا۔۔۔!! تب پہلے

جوتا

ایک صاحب کا جوتا بری طرح کاٹ رہا تھا اور وہ سڑک پر لنگڑا کر چل رہا تھا ان کی پریشانی دیکھ کر ایک راہگیر نے پوچھا۔

''آپ کو یہ جوتا کہاں سے ملا ہے؟''

انہوں نے جل کر جواب دیا۔

''ایک درخت سے توڑا ہے۔''

راہگیر نے برجستہ کہا۔

''آپ کو اس کے پک جانے کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔''

مہمان

مہمان: ''جب میں کھانے کی میز پر بیٹھتا ہوں تو تمہاری بلی میرا منہ تکنے لگتی ہے۔''

میزبان: ''بے چاری اپنا پیالہ پہچانتی ہے۔''

(عادل یاسین-شاہ پور چاکر)

پلیئر کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوگی۔۔۔!! وہ صرف محسوس کرسکے گا۔۔۔!! دیکھ نہیں سکے گا۔۔۔!! پہلا پلیئر اس کے جسم کو اپنے جسم کے کسی بھی حصے سے ٹچ کرے گا۔۔۔!! پہلا والا آنکھیں کھول کر بتائے گا۔۔۔!! اس نے اپنے اس جگہ کو میرے جسم سے ٹچ کیا تھا۔۔۔!! اس کے سامنے کیمرہ ہوگا۔۔۔!! جس میں وہ سب کچھ ریکارڈ ہورہا ہوگا۔۔۔!! تاکہ کچھ چیٹنگ نہ ہو۔۔۔!!'' رُخام نے اپنی کولڈ رنگ اٹھا کر پینی شروع کردی۔

''بس۔۔۔!! اتنی سی بات ہے۔۔۔!! اور دوسرا پلیئر اگر سہی (guees) کریں۔۔۔!! تب دوسرے پلیئر کو کیا ملے گا۔۔۔!! جیت۔۔۔!! یا کچھ اور؟'' امرینہ نے اسے دیکھا۔ وہ اپنا جوس کا گلاس خالی کر چکی تھی۔ اب ایسے ہی اس کے اسٹرا سے کھیل رہی تھی۔

''ویری گڈ کوچن۔۔۔!! ہاں اگر دوسرا سہی گیس (guees) کرتا ہے۔۔۔!! تب وہ اس سے اپنی کوئی بھی بات منوا سکتا ہے۔۔۔!! مگر وہ بھی صرف پندرہ سیکنڈ یا تیس سیکنڈ کے لیے۔۔۔!! یا اپنی مرضی سے وہ ٹائم بڑھا بھی سکتا ہے۔۔۔!! ہاف منٹ بھی کرسکتا ہے۔۔۔!! یا پھر ایک منٹ بھی۔۔۔!!'' رُخام نے اسے معنی خیزی سے دیکھا۔

''ہوں۔۔۔!! مگر اس میں بھی کچھ تو رولز ہوگا۔۔۔!! مسئلہ۔۔۔!! جیسے وہ اسے کمرے سے باہر نکال سکتا ہے۔۔۔!!'' امرینہ نے ابھی تک سمجھ نہیں پایا تھا۔

''نہیں۔۔۔!! پہلا پلیئر دوسرے کو کمرے سے باہر نہیں نکال سکتا ہے۔۔۔!! اسی کمرے میں وہ اس سے کام کروا سکتا ہے۔۔۔!!'' رُخام کے خاموش ہوتے ہی وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

''ویسے۔۔۔!! گیم انٹرسٹنگ ہے۔۔۔!! مگر واہیات بھی ہے۔۔۔!! اوپر سے خالی کمرہ۔۔۔!! کہاں ملے گا۔۔۔!! جہاں ہم کیمرہ یا موبائیل سیٹ کرکے کھیل سکیں۔۔۔!! میرے خیال میں اس گیم کو رہنے دینا چاہیے۔۔۔!! ہمیں کوئی آسان گیم کھیلنا چاہیے۔۔۔!! جیسے sos or pop یا پھر لڈو، یا پھر سانپ سیڑھی، شطرنج کی بساط بھی بچھائی جاسکتی ہے؟'' امرینہ نے اسے دیکھا۔ اس کا منہ پھلا ہوا تھا۔ جیسے اس کو گیم میں کچھ مزہ نہ آیا ہو۔

''میرے پاس کمرہ بھی ہے۔۔۔!! اور وہ بالکل خالی بھی ہے۔۔۔!! سنڈے کو میرے سارے گھر والے شادی پر جا رہے ہیں۔۔۔!! اگر ریڈی ہو۔۔۔!! تو ہم یہ گیم کھیل سکتے ہیں۔۔۔!!'' رُخام نے چٹکی بجاتے ہی حل پیش کیا۔ امرینہ سوچنے لگی۔ اب وہ دونوں گیم کے متعلق بات کررہے تھے۔

☆.....☆.....☆

نبیلہ تین دن سے کالج نہیں آرہی تھی۔ چوتھے دن وہ جیسے ہی آئی۔ بہت اداس سی تھی۔ جب فری کلاس میں تبسم نے اس کو دیکھا، تو اسے اچنبھا سا ہوا۔

''کیوں کیا ہوا ہے؟'' بینا بھی متوجہ ہوکر اس کے پاس چلی آئی۔

''یار۔۔۔!! چند دن پہلے امرینہ نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا۔۔۔!! مجھے کوئی بہت بڑا دکھ ملنے والا ہے۔۔۔!! سب اس کے آس پاس آکر بیٹھ گئیں۔

''کیوں کیا ہوا ہے؟'' مہر اب کہاں چپ رہ سکتی تھی۔

''مہر۔۔۔!! اس امرینہ نے بالکل ٹھیک پیش گوئی کی تھی۔۔۔!! میری دادی کا انتقال کا ہوگیا ہے۔۔۔!! اس نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا۔۔۔!! مجھے بہت جلد کوئی بہت بڑا دکھ ملنے والا ہے۔۔۔!! ہائے میری دادی۔۔۔!! ایسے ہی اچھی بھلی تھیں۔۔۔!! اور ہمیں یوں چھوڑ کر چلی گئیں۔۔۔!! ہمارے پورے خاندان میں آج تک کسی کو یقین نہیں آرہا ہے؟'' اس کی بات سن کر سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ امرینہ اس دن نہیں آئی تھی۔ اچانک آنیہ بھی بے چین سی ہوگئی۔ وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر ان کے قریب آگئی۔

''یار۔۔۔!! موت اور زندگی۔۔۔!! غم خوشی تو

زندگی میں چلتی رہتی ہے۔۔۔!!اللہ تمہاری دادی کی مغفرت فرمائے۔۔۔!!''لیلیٰ نے سب پر طائرانہ نگاہیں ڈالیں۔

''آمین۔۔۔!!''پورے کلاس نے یک زبان ہوکر کہا

''یار تم لوگوں کو ایک مزے کی بات بتاؤں۔۔۔!!اس دن وین کے اندر امرینہ نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا۔۔۔!!مجھے محبت ہوجائے گی۔اس کے نام کا پہلا حرف RیاS ہوگا۔۔۔!!پتہ نہیں۔۔۔!! مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا ہے۔۔۔!!اس کا کہا بالکل ہنڈرڈ پرسن درست ثابت ہوا۔۔۔!!میرے محبوب کا نام راحم سفاح ہے۔۔۔!!مجھے بالکل بھی نہیں یقین آرہا ہے؟کوئی ایسا بھی ہے،جو مستقبل کو دیکھ سکتا ہے؟''آنیہ نے شرماتے ہوئے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر کہا۔سارا غمگین ماحول ایک دم سے جیسے بدل ڈالا۔کوئی سیٹی بجانے لگی۔کوئی اوہ۔۔!!اوہ۔۔۔!!اوہ ہو۔۔۔!!آہ ہا۔۔۔!!'' کی آوازیں بلند کرگئیں۔کوئی تالی بجانے لگی۔اچانک دوسری کلاس کی سحرش بے چینی سے کلاس میں داخل ہوگئی۔یہاں تو پورا ماحول جیسے شور میں ڈوب رہا تھا۔سب اس کو دیکھ کر جیسے اپنی جگہ بالکل ساکت ہوگئیں۔

''سحرش۔۔۔!!آجاؤ۔۔۔!!یقیناً تم امرینہ کو ڈھونڈ رہی ہوگی۔۔۔!!''ملیحہ نے اسے دیکھا۔اور ہنس پڑی۔

''ہاں۔۔۔!!وہ کہاں ہے؟مجھے اس سے ملنا ہے؟پتہ نہیں وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی؟''سحرش اندر آگئی۔

''ویسے کیا بات ہے؟تم پریشان ہورہی ہو؟''سویرا بے چین سی ہوگئی۔

''یار۔۔۔!!اس دن امرینہ نے میرا ہاتھ دیکھ کر پیش گوئی کی تھی۔۔۔!!وہ ساری کی ساری درست ہوگئی ہے۔۔۔!!آئی ایم ٹو شاکڈ۔۔۔!!یہ اس نے کیسے کیا۔۔۔!!کیا وہ مستقبل کو دیکھ رہی ہے؟''

''کیوں؟کیا کہا تھا؟''نادیہ تو اٹھ کر اس کے ساتھ جا کھڑی ہوگئی۔

''اس نے کہا تھا۔۔۔!!میں جس سے محبت کرتی ہوں۔۔۔!!وہ مجھے کبھی نہیں ملنے والا ہے۔۔۔!!مگر جس سے میری شادی ہوگی۔۔۔!!اوہ مجھ سے بہت محبت کرے گا۔۔۔!!اس نے میری منگنی کی لکیریں دیکھی تھی۔۔۔!!اور کہا تھا کہ میری منگنی بہت جلد ہوجائے گی۔۔۔!!میری شادی اپنوں میں ہوگی۔۔۔!!میری منگنی میرے ماموں زاد سے کل ہی ہوگئی ہے۔۔۔!!وہ بچپن سے مجھے چاہتا تھا۔۔۔!! میں ہی بے خبر تھی۔۔۔!!میں اس کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔۔۔!!اور اس کی فیس بھی۔۔۔!!''سحرش کی بات سن کر سارے ایک دوسرے کو حیرانگی سے دیکھنے لگیں۔

''ارے واہ۔۔۔!!بہت بہت مبارک ہو۔۔۔!!لاؤں پیسے مجھے دو،میں امرینہ کو پہنچا دوں گی۔۔۔!!''مہر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے گلے جا لگی۔سحرش نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں میں خود امرینہ کو پیسے دوں گی،اور پانچ کی جگہ میں ہزار روپے لائی ہوں۔۔۔!!''سحرش وہاں سے باہر چلی گئی،وہاں کلاس میں بہت ساری اور لڑکیاں بھی موجود تھیں۔جنہوں نے اپنے کانوں سے یہ سب سنا،اور آنکھوں سے دیکھا۔اور پھر چھٹی تک یہ ساری باتیں پورے کالج میں گردش کرتی رہیں۔اور کچھ لڑکیاں تو امرینہ کے پیچھے گھوم رہی تھیں۔مگر وہ آئی نہیں تھی۔کالج میں،سب بے چین سے ہوگئے تھے۔کچھ لڑکیاں تو ہاتھ دکھانا چاہتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''سرٹن سرکل اسکوائر بزنس مین۔۔۔''اس کی نظریں اسکرین پر وائرل اسی کارڈ پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ لڑکا بار بار اسی کو دیکھ رہا تھا۔اس نے زیر لب کئی بار یہ نام پڑھ بھی لیا تھا۔وہ دیکھ رہا تھا۔اس نے بھی یہ کارڈ اپنے آئی ڈی سے شیئر کردیا تھا۔اب وہ کارڈ آگے

فارورڈ ہو رہا تھا۔اس پر نیچے ایک خطرناک ڈھانچے کی تصویر بنی ہوئی تھی، اس کے نیچے جو عبارت لکھی تھی۔وہ کمال کی تھی۔

سرٹن سرکل اسکوائر بزنس مین۔۔۔!! اگر آپ کسی سے تنگ ہیں۔۔۔!! تو ہماری خدمات حاصل کر لیجیے گا۔۔۔!!! اپنے دشمن کی تصویر بھیج دیجیے گا۔۔۔!! ہم جیسے ہی اس کی تصویر کو ری پینٹ کریں گے۔۔۔!! وہ بالکل ختم ہو جائے گا۔۔۔!! دنیا سے مٹ جائے گا۔۔۔!! وہاں چلا جائے گا، جہاں آپ اسے پہنچانا چاہتے ہیں۔'' نیچے شیطانی مسکراہٹ کا سائمبل اور ''ہاہاہا۔۔۔!! ہاہاہا۔۔۔!!'' لکھا تھا، وہ لڑکا ہنس رہا تھا۔اس کارڈ کو اس نے ایک انجان آئی ڈی سے اپلوڈ کیا تھا۔اور ایک دن میں وہ ہزاروں لاکھوں لوگوں نے ری ٹوئٹ کر دیا۔ وہ ایک بہت اچھا پینٹر تھا۔مگر اس کے ہاتھوں میں صرف موت تھی۔

اس نے بچپن سے پینٹنگ کرنی شروع کر دی تھی۔وہ جو جو سیکھتا رہا۔وہ ماسٹر ہوتا گیا۔مگر اس نے کبھی کوئی تصویر پوری نہیں بنائی تھی۔ وہ جب پینٹنگ کو تکمیلی مراحل میں لے جاتا، اسے ایسا لگتا جیسے کوئی غیبی طاقت اسے روک رہی ہے۔ پہلے وہ اکثر بور جایا کرتا تھا۔تو پینٹ کرنا شروع کر دیتا۔اس کا اس سے ٹائم پاس اچھا ہو جاتا تھا۔ پھر یہی ٹائم پاس اس کا ذریعہ معاش بن گیا۔ پہلے تو اسے خود بھی یقین نہیں آیا۔مگر بعد میں جب بھی اس نے جس بھی زندہ چیز کی تصویر پینٹ کر دی۔وہ چیز مر گئی۔اس کو بہت جلد یہ احساس ہوا۔اس کے ہاتھوں میں پینٹ نہیں موت ہے۔

اس نے اپنے اس جادو کو کیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔لوگ اس کا وہ کارڈ مذاق کے طور پر شیئر کر رہے تھے۔مگر وہ خوش تھا۔کارڈ پر کچھ بھی نہیں تھا۔صرف ایک نمبر، اور ای میل تھا۔اسے اب لوگوں کا انتظار تھا۔اسے اس کام کی فیس سینکڑوں میں لینی تھی۔ایک بندہ جس کی جتنی کم عمر ہوتی، اتنی اس کی پینٹنگ کی قیمت زیادہ ہوتی۔البتہ وہ بوڑھوں کے معاملے میں قیمت کم کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔یہ اس کا اپنا خیال تھا۔وہ سیم فیس نہیں لینا چاہتا تھا۔مگر وہ باؤ تاؤ کا شوق بھی نہیں رکھتا تھا۔وہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔کیونکہ وہ اس دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

شام تک اسے ایک ای میل ملی۔اس نے کھولی۔وہ ایک لڑکی نے بھیجی تھی۔اس نے وہ ای میل دیکھ کر پڑھنے لگی۔

''ہے۔۔۔!! تمہارا نمبر آف کیوں ہے؟ جی میل کر رہی ہوں۔۔۔!! میں اس لڑکے کی تصویر پینٹ کرنا چاہتی ہوں۔۔۔!! آنس دے کر بتا دینا۔۔۔!! اس پینٹ کے بدلے آپ کی فیس کتنی ہوگی؟ میں یہ کام بہت جلد چاہتی ہوں۔۔۔!! جلد سے جلد۔۔۔!!'' اس نے جی میل بھیجنے والے کی پک دیکھ کر اندازہ لگایا۔وہ لڑکی بہت ینگ تھی۔اس نے جس لڑکے کی تصویر بھیجی تھی۔وہ بھی اس کا ہم عمر تھا۔مگر وہ بہت زیادہ خوبرو، اور پیارا تھا۔اس کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔اور معصومیت اس کے چہرے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔اس نے لڑکی کی تصویر بڑی کر دی۔اس کا نام پامسٹ امرینہ ڈاڈ کام ڈاڈ پی کے تھا۔جس کی تصویر اس نے بھیجی تھی۔اس کا نام اس نے نہیں لکھا تھا۔مگر اسے جھٹکا سا لگا۔

''اتنے خوبرو لڑکے کی تصویر یہ کیوں بنانا چاہتی ہے؟ آخر وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا یہ دونوں گرل فرینڈ، بوائے فرینڈ ہیں؟'' اس نے سوچنا شروع کر دیا۔

''کیا مجھے یہ کام لینا چاہیے۔۔۔!! ہاں۔۔۔!! مگر شاید یہ لڑکی میری فیس ادا نہ کر سکے گی۔۔۔!! میری فیس ینگ لوگوں کی پینٹنگ کے لیے بہت زیادہ ہے۔۔۔!!'' اب وہ مسکرا رہا تھا۔اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ چھائی ہوئی تھی۔اب وہ ای میل کا جواب لکھ رہا تھا۔

''ہاں۔۔۔!! وہ نمبر فیک تھا۔۔۔!! آپ مجھے اپنا نمبر سینڈ کر دیں۔۔۔!! میں خود رابطہ کر لوں گا۔۔۔!!

میں اپنی فیس کیش میں لوں گا۔۔۔!! فی الحال میں نے سوچا نہیں ہے۔۔۔!! میری فیس اس چہرے کی پینٹنگ کے لیے جتنی بھی زیادہ ہو۔۔۔!! وہ کم ہی ہوگی۔۔۔!! مگر ایک بار جب میں کام لے لوں۔۔۔!! میں اسے آہستہ آہستہ مکمل کرتا ہوں۔۔۔!! میں کسی کی تصویر ایک دم اور جلدی نہیں بناتا۔۔۔!! آپ کو اس کے لیے تحمل کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔۔۔!! اور کام دیتے وقت آپ کو مجھ سے ملنا پڑے گا۔۔۔!! اگر آپ کو میری شرائط منظور ہے۔۔۔!! تو میں آپ کا کام کردوں گا۔۔۔!! ورنہ آپ دوسری صورت میں رابطہ نہ کیجیے گا۔۔۔!!'' اس نے رپیلے میں لکھ کر سینڈ کردیا۔ اب وہ انتظار کرنے لگا۔

''مجھے ایسا کام نہیں لینا چاہیے۔۔۔!! ان دونوں کے بارے میں جاننا چاہیے۔۔۔!! ان دونوں کے درمیان ایسی کیا دشمنی ہوگئی ہیں۔۔۔!! یہ لڑکی اس لڑکے کی جان ہی لے لینا چاہتی ہے۔۔۔!!'' اب وہ سوچ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ای میل پر گڑی ہوئی تھیں۔ مگر وقت گزرتا رہا، اس لڑکی کا رپلے نہیں آیا۔ اس نے لیپ ٹاپ بند کردیا۔ اور اٹھ کر کھڑکی میں آ گیا۔

☆.....☆.....☆

اس کے کالج کے باہر کالج کا نام کا بہت بڑا بل بورڈ آویزاں تھا۔ نیچے گیٹ تھا۔ جس سے لڑکے لڑکیاں اندر جا رہے تھے۔ یہ اس شہر کا سب سے پیارا کالج تھا۔ جو بہت بڑے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ آگے بلڈنگز تھی، جو مختلف ڈیپارٹمنٹس کے بلاگز تھے۔ پھر بہت بڑا اناختم ہونے والا پیارا برآمدہ تھا۔ پھر قطار در قطار میں کمرے تھے، عمارت پانچ منزلہ تھی۔ سفید یونیفارم میں لڑکیاں یہاں وہاں جا رہی تھیں، لڑکے وائٹ شرٹ گرے پینٹ میں ملبوس تھے، منشال سادگی سے چلتی ہوئی وہاں دکھائی دی، یہ لڑکی بہت سادہ رہتی تھی، کبھی فیشن نہیں کرتی تھی، مگر کسی سے بھی بات نہیں کرتی تھی۔ اس کے نمبر ہمیشہ اے پلس میں آتے تھے، کالج کی ٹاپر تھی۔ جو کوئی بھی منشال سے بات کرتا، اس نے کبھی جواباً بات نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ وائٹ بورڈ کو دیکھا کرتی، وہ ہمیشہ اپنے ساتھ دائیں، یا بائیں سائیڈ والی کرسی خالی رکھتی تھی۔ کالج کے پروفیسرز نے اسے اس بات کی اجازت دے دی تھی، وہ کالج کے پروفیسرز سے اس بات کی پرمیشن لے چکی تھی۔ اگر کوئی غلطی سے بھی اس کے ساتھ والے چیئر پر بیٹھ جاتا، وہ بنا کچھ کہے، وہاں سے اٹھ جاتی، کبھی کبھی دوسرے اسٹوڈنٹ کو وہ بہت عجیب و غریب سی لگتی تھی۔ اس نئے زمانے میں کون ایسے پراسرار سی حرکتیں کرتا ہیں؟ وہ ہمیشہ چلتے ہوئے سیدھا دیکھتی تھی۔ کبھی کبھار وہ کالج کے کسی دیوار کو دیر تک دیکھا کرتی تھی۔ اس کے منہ سے کبھی کسی نے فضول بات نہیں سنی تھی۔ فضول بات تو دور کی بات، بات ہی نہیں سنی تھی۔

کچھ لڑکیوں کا خیال تھا۔ وہ گونگی ہے۔ کچھ کا خیال تھا۔ وہ مغرور ہے۔ وہ شاید سہی معنوں میں یہاں پڑھنے آئی تھی۔ فزکس کی کلاس ہو رہی تھی۔ سر اسفر یار بہت محنت سے سمجھا رہا تھا۔

اچانک کلاس روم کا دروازہ کھلا، اور ایک نیا لڑکا داخل ہوا۔ وہ کل داخل ہوا تھا، وہ سیدھا چلتا ہوا، بنا اجازت کمرے میں داخل ہوا، سر اسفر یار نے اسے آتے ہوئے دیکھا، مگر کچھ نہ کہا، اس نے کلاس روم کا دروازہ آہستہ سے بند کردیا، اور پورے کلاس روم پر نظر دوڑائی۔ اسے منشال کے بائیں طرف والا چیئر خالی نظر آیا۔ وہ چلتا ہوا، منشال کے ساتھ خالی چیئر پر بیٹھ گیا۔ پورے کلاس کے لڑکے لڑکیوں نے معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جیسے ہی وہ بیٹھا، منشال فوراً اٹھی۔ اور باہر جانے لگی۔ وہ لڑکا حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اچانک کچھ آوازیں سنائی دیں۔ سر اسفر یار نے مڑ کر دیکھا تو انہیں غصہ آیا۔

''منشال۔۔۔!! رک جاؤ۔۔۔!! تم بنا اجازت باہر نہیں جاسکتی۔۔۔!!'' سر اسفر یار نے بورڈ سے مڑ کر اسے کہا۔ مگر منشال رکی نہیں۔ اور اس نے سب لوگوں پر نظر دوڑائی۔ وہاں ایک چیئر خالی تھا۔ منشال باہر چلی گئی۔ سر اسفر یار کو شدید غصہ آیا۔ باقی کچھ بچے ہنس

پڑے تھے۔ کچھ لمحے بعد منشال واپس آئی، اس کے دونوں ہاتھوں میں دائیں، بائیں دو کرسیاں تھیں۔ اس نے سب سے آخری رو میں وہ کرسیاں رکھیں اور اس پر بیٹھ گئی۔ سر اسفر یار نے دوبارہ اسے کچھ نہیں کہا۔ وہ دوبارہ اپنے لیکچر میں مصروف ہوگئے۔

وہ لڑکا جو اس کے ساتھ خالی چیئر پر بیٹھا تھا۔ وہ مڑ مڑ کر حیرانگی سے منشال کو دیکھنے لگا۔ مگر وہ لاپرواہ تھی۔ کچھ دیر بعد کلاس خالی ہوگئی، جیسے ہی سر اسفر یار باہر نکلے۔ منشال بھی اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ باقی لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ کچھ لڑکیاں، اس لڑکے کے ارد گرد بیٹھ گئیں اور اس سے باتیں کرنے لگیں۔ مگر اس نے ان لڑکیوں سے منشال کے بارے میں پوچھنا شروع کردیا۔

''وہ لڑکی جو یہاں آکر اکیلی بیٹھی تھی؟ وہ اکیلی کیوں بیٹھی تھی؟'' سب لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک زبان ہوکر کہہ دیا۔

''وہ پاگل ہے۔۔۔!!'' سب کے منہ سے ایک بات سن کر اس لڑکے نے باہر برآمدے کی طرف دیکھا۔ وہاں منشال بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک خالی چیئر بھی رکھا تھا۔ سارے لڑکے زور دار آواز میں قہقہے لگانے لگے۔ وہ لڑکا بہت پریشان ہوگیا۔

''اور اس نے سر کی بات کیوں نہیں مانی؟'' اس نے دوبارہ سوالیہ انداز میں لڑکیوں کو دیکھا۔

''کیونکہ وہ پاگل ہے۔۔۔!!'' سب نے جیسے ایک بار پھر سے یک زبان ہوکر کہہ دیا۔ وہ سب کو حیران پریشان نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر وہ اپنا بیگ اٹھا کر جلدی سے باہر نکل گیا۔ سب لڑکیاں زور، دار انداز میں قہقہے لگانے لگیں۔ جیسے کلاس میں بھونچال آگیا ہو۔ ہر طرف سے شیطانی قہقہوں کی مانند آوازیں ارتعاش کی صورت میں پورے کمرے میں گردش کررہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

کچھ ہی دنوں میں امرینہ بہت زیادہ فینس ہوچکی تھی۔ کالج کی لڑکیاں اس کو اپنا ہاتھ دکھا کر اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ نہ کچھ جاننا چاہتی تھیں۔ وہ لائن میں لگی ہوئی تھی۔ ہر ایک کو ہاتھ دکھانے کی جلدی تھی۔ امرینہ کو یقین نہیں آرہا تھا۔ قسمت اس کا اتنا ساتھ دے رہی ہے۔ لڑکیوں نے پیسے ایڈوانس میں دینے شروع کردیے تھے۔ امرینہ نے بریک میں کچھ لڑکیوں کا ہاتھ دیکھا۔ ان کے ہاتھ کو دیکھ لکیروں کے بارے میں بتایا۔ کچھ کو اچھی پیش گوئیاں سنائیں، کچھ کو بری پیش گوئیاں کیں، مگر ایسے جیسے ان کو خبردار کررہی ہو۔ وہ لڑکیاں چلی گئیں۔ اس نے پانچ ہزار کمائے تھے۔ دس لڑکیوں کا ہاتھ وہ دیکھ چکی تھی۔ اور ابھی باقی بھی لائن میں کھڑی تھیں۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ مزید فینس ہورہی تھی۔ وہ پہلی بار تب حیرت سے رک گئی تھی، جب اس کی ایک کالج کی دوست نے اپنے ایک میل کزن کے ہاتھ کو دیکھنے کا مطالبہ کردیا تھا۔ البتہ کسی مرد کا ہاتھ دیکھنے کے لیے اس نے سوچ سمجھ کر دس ہزار پہلی بار مانگ لیے تھے۔ اور وہ لڑکی اپنے کزن سے بات کرنے چلی گئی تھی۔ اور دوسرے دن وہ اپنے کزن کو ایک مشہور فی شاپ میں لائی تھی۔ اس لڑکے نے اسے دس ہزار دے دیئے تھے۔ اس نے ہاتھ دیکھ کر جو کچھ کہا، وہ کچھ اچھا نہیں تھا۔ اس نے پھر یہ کام آن لائن شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے ہر معروف سوشل سائیڈ پر اپنا اکاؤنٹ کریٹ کیا۔ اس میں اپنے بارے میں لکھا، اپنی فیس کے بارے میں لکھا۔ جس کسی کو اپنا ہاتھ دکھانا ہوتا تھا۔ وہ اسے کسی معروف کافی شاپ، یا اچھے ریسٹورنٹ میں مل سکتا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ دیکھنے چلی جاتی تھی۔ گھر کے لڑائی جھگڑوں سے وہ دور رہنے لگی، اس کی دادی سے منہ ماری کم ہونے لگی۔ دادی اس کی بدلاؤ کو دیکھ کر حیران تھی۔ گھر میں ماں باپ سے اس نے پیسے مانگنے کم کردیئے۔ اب تو اس کا اپنا بیگ ہر وقت پیسوں سے بھرا رہتا تھا۔ اس نے آکاؤنٹ بنا کر سارے پیسے اسی میں ڈال لیے۔ وہ جیسے جیسے کہتی تھی۔ ویسا ہی ہوتا رہتا تھا۔ یہ اس کے درست اندازے نہیں تھے۔ کچھ تو

تھا۔جو اس سے کروا رہا تھا۔

یہ کام سب سے پہلے اس نے ٹائم پاس کے لیے شروع کر دیا تھا۔مگر اب اس کی زندگی کا مستقل جز بن چکا تھا۔اس کی زندگی میں ابھی بھی رُخام موجود تھا۔دونوں ابھی بھی باہر ملتے تھے۔مگر رُخام کو اس نے اپنے اس پاور کے بارے میں کبھی نہیں بتایا تھا۔اب اس نے اپنی فیس ایک ہزار کر دی تھی۔اور کالج کی لڑکیاں تو اب اپنے کزنز کو بھی لانے لگی تھیں۔اگر میل ہوتے، تو وہ باہر کسی اچھے ریسٹورنٹ میں جا کر مل لیتی تھی۔لڑکوں کا ہاتھ دیکھنے کے لیے وہ پانچ ہزار سے کم نہیں لیتی تھی، اب اس کے پاس پامسٹری کے تمام جدید آلات بھی موجود تھے۔جس میں وہ ہاتھ اچھی طرح سے دیکھ سکتی تھی۔لڑکے زیادہ تر اس شوق میں بھی اسے ہاتھ دکھا دیتے تھے، کیونکہ ان لوگوں کو امرینہ کی قابلیت سے زیادہ اس کی خوبصورتی اٹریکٹ کرتی تھی۔

امرینہ کے انتظار میں لوگوں کی لائن لگ جاتی تھی۔

☆.....☆.....☆

امرینہ کو جیسے ہی اس ای میل کا ریپلے ملا۔اس نے بے چینی سے پڑھنا شروع کر دیا۔سارا پڑھنے کے بعد وہ حیرت سے رک گئی۔

''یہ ملنا کیوں چاہتا ہے؟ شاید پیسے ایڈوانس میں مانگ رہا ہوں؟ ہاں میں مل لیتی ہوں۔۔۔!! ویسے اپنے کام کے سلسلے میں بھی اکثر کسی نہ کسی کے پاس جاتی رہتی ہو۔۔۔!!'' اس نے ای میل کا جواب لکھ ڈالا اور شہر کے مخصوص اچھے شہرت والا ایک برگر شاپ کا ایڈریس بھی لکھا۔اس نے اپنا موبائل نمبر بھی سینڈ کر دیا۔کچھ دیر وہ انتظار کرتی رہی، پھر اسے اوکے ڈن کا ریپلے ملا۔وہ خوش ہو گئی۔اب اسے انجان نمبر سے ایک میسج ملا۔اس نے دیکھا، میسج میں لکھا تھا۔

''میں آجاؤں گا۔۔۔!! ٹھیک شام پانچ بجے۔۔۔!! اس کام کے میں پانچ لاکھ لوں گا۔۔۔!! اگر آپ پیسے دے سکتی ہیں۔۔۔!! تو میں کام کروں گا۔۔۔!!'' اسے اچنبھا سا ہوا۔پھر اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ''او کے لکھ کر سینڈ کر دیا۔

''ان چند مہینوں میں میں دس لاکھ سے زیادہ کما چکی ہوں۔۔۔!! تو پانچ لاکھ نکال کر اسے دے دوں گی۔۔۔!! ویسے بھی میری نظر میں اس کام کی یہ قیمت بہت کم ہے۔۔۔!! ہنر مند کی ہنر کی قیمت انمول ہوتی ہیں۔'' وہ سوچ رہی تھی۔

''رُخام۔۔۔!! تمہیں تو اب میں اس دنیا سے اوپر پہنچا کر رہوں گی۔۔۔!! تم کیا سمجھتے ہو؟ میں خاموش رہوں گی۔۔۔!! میں تمہارے ساتھ وہ کرنے جا رہی ہوں۔۔۔!! جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا۔۔۔!!'' اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''بہت ستانے لگے ہو۔۔۔! تم میرے لیے عذاب بن گئے ہو نا۔۔۔!! مجھے دھمکا رہے ہو۔۔۔!! ہاں۔۔۔!! مانتی ہوں۔۔۔!! غلطی میری تھی۔۔۔!! مجھ سے کچھ غلطی ہو گئی۔۔۔!! مگر اب میں غلطی سدھار لوں گی۔۔۔!! وہ ڈاکٹر بھی کہتے ہیں۔۔۔!! جسم کا جو حصہ ناسور بن جائے۔۔۔!! اس کو کاٹنا ہی پڑتا ہے۔۔۔!! تو تم بھی میرے لیے ناسو بن ہی گئے ہو۔۔۔!!'' وہ اٹھی، اس نے عدد ی بڑا سا گول عدسہ اٹھا کر بیگ میں ڈالا۔اب وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔وہ گنگنا ہی رہی تھی۔

''لڑکی بڑی انجانی ہے۔سپنا ہے سچ ہے کہانی ہے۔ہاہا۔۔یہ پگلی بالکل نہ بدلی۔یہ تو بالکل نہ بدلی، یہ تو وہی دیوانی ہے۔۔۔!!'' اچانک دروازہ کھلا۔اور دادی کمرے میں آگئیں۔

''ہائے ہائے۔۔۔!! لڑکی باؤلی تو نہیں ہو گئی ہو۔۔۔!! یہ کیا بولے جا رہی ہو۔۔۔!! کم بخت۔۔۔!!'' دادی نے اسے غصے سے کہا۔اس نے مسکرا کر دادی کو دیکھا۔پھر اچانک دادی کے گلے سے جا لگی۔اور انہیں آرام سے بستر پر بیٹھا کر کہا۔

''دادی۔۔۔!! ذرا تو ہاتھ دکھانا۔۔۔!! میں

آپ کی زندگی کے دن دیکھ لوں۔۔۔!! کتنے رہ گئے ہیں۔۔۔!!'' دادی کا ہاتھ اس نے پکڑ لیا، مگر دادی نے اس کا ہاتھ پرے کرتے ہوئے غصے سے کہا۔

''کیوں۔۔۔!! ہاتھ کیوں دکھاؤں؟'' دادی مزید تپ سی گئی۔

''دادی۔۔۔!! میں آپ کی عمر کی لکیر دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔!! دیکھوں تو سہی کہاں تک گئی ہے؟ مزید کتنے دن کی زندگی جینے والی ہو؟'' اس نے دادی کا ہاتھ پکڑ کر نگاہوں کے سامنے کر دیا۔

''چل ہٹ۔۔۔!! بے غیرت۔۔۔!! میری عمر کی لکیریں دیکھنے سے بہتر ہے۔۔۔!! اپنی عمر کی لکیر دیکھ لے۔۔۔!! یہاں عمر کون دیکھتا ہے؟ اپنی دیکھ۔۔۔!! یا پھر اپنی اس زبان دراز ماں کی دیکھ۔۔۔!! جس کی وجہ سے میری یہ حالت ہوگئی ہے۔۔۔!! نا ہنجار کہیں کی۔۔۔!! بے غیرت۔۔۔!! بڑی آئی ہاتھ دیکھنے والی۔۔۔!! بدتمیز۔۔۔!!'' دادی نے اپنا ہاتھ چھڑا کر اس کے کندھے پر ہلکا سا دھب کر مارا۔ وہ ہنس پڑی۔ اب دادی باہر جا رہی تھیں۔

''اچھا ہوا جو نہیں دیکھا۔۔۔!! کیا پتہ؟ دادی کی کتنی عمر بچی ہے؟ بے چاری دادی؟ اگر دیکھ لیتی، تو اچھا ہوتا۔۔۔!! ویسے۔۔۔!! میں دادی کے ساتھ اپنا رویہ کچھ بدل دیتی۔۔۔!!! کیا پتہ کل ہوں نہ ہوں۔۔۔!! اور دادی کتنی بوڑھی ہوگئی ہیں۔۔۔!! مگر پھر بھی ان کی زبان کسی کڑوی گولی سے زیادہ تیز ہے۔۔۔!!'' وہ پرسوچ نگاہوں سے کہہ رہی تھی۔ اور اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ اچانک اس نے اپنا ہاتھ دیکھنا شروع کر دیا۔ اور وہ دھک کر کے اپنی جگہ پر بیٹھتی چلی گئی۔ وہ جیسے پاگل ہونے لگی۔

☆.....☆.....☆

وہ اکیلی بیٹھی ہوئی تھی، جس ٹی شاپ میں وہ موجود تھی، وہاں آج اتنا رش نہیں تھا، بس کچھ ٹیبل پر لوگ موجود تھے۔ وہ اس پینٹر کا انتظار کر رہی تھی، جس نے آج اس کو ملنے کا ٹائم دیا تھا۔ اس کے موبائیل پر انجان نمبر سے کال آنے لگی۔ اس نے کچھ لمحوں تک موبائیل کو دیکھا۔ پھر وہ اٹھایا۔

''ہیلو۔۔۔!!'' اس نے موبائیل کان سے لگایا۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔

''ہیلو۔۔۔!!'' اس نے دوبارہ کوفت سے کہا۔ اسے انجان نمبرز سے کوئی پریشانی نہیں تھی، مگر جب کوئی کال کر کے خاموش رہتا۔ اسے وہ لمحے زہر لگتے۔

''کبھی ہم میں تم قرار تھا کبھی تم کو ہم سے بھی پیار تھا۔۔۔! کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا۔۔۔!!'' دوسری طرف سے گھمبیر لہجے میں کہا گیا۔ وہ رُخام تھا۔ اس کی آواز وہ ہزاروں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

''سوری رانگ نمبر۔۔۔!! آئندہ یہاں فون مت کیجیے گا۔۔۔!! ورنہ۔۔۔!!'' اس نے کہہ کر فون فوراً بند کر دیا۔ وہ دو جملے بول کر جیسے سرخ پڑ گئی تھی۔ ایک بار پھر سے اس کے موبائیل کی بب بجنے لگی۔

''ہیلو۔۔۔!! جب ایک بار کہہ دیا۔۔۔!! رانگ نمبر تو دوبارہ کیوں کال کر رہے ہو؟ کیوں بات سمجھ میں۔۔۔!!'' وہ غصے سے بول رہی تھی۔

''ہیلو۔۔۔!!'' دوسری طرف سے کسی اور کی آواز سنائی دی۔ وہ رک گئی۔ آواز بہت بھاری گھمبیر سی تھی۔

''جی کون؟'' وہ ایک دم سے اپنے آپ پر قابو پا کر بولی۔

''پینٹر۔۔۔!! تم کون سے ٹیبل پر بیٹھی ہو؟ میں ٹی شاپ کے باہر کھڑا ہوں۔۔۔!!'' اس پینٹر کی آواز بڑی گھمبیر سی تھی۔ جیسے وہ ایک آواز نہ ہو۔ دو ہو۔

''اندر آجائیے۔۔۔!! میں بائیں طرف کے ٹیبل پر اکیلی بیٹھی ہوں۔۔۔!! میں نے ریڈ کلر کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اس نے فون بند کر دیا۔ اب وہ داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ لمحوں بعد ریڈ کلر کے تھری فیس سوٹ میں ایک نوجوان سا لڑکا

داخل ہوا۔ بے ساختہ امرینہ کی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں، وہ بائیں اطراف میں دیکھتا رہا۔ پھر وہ چلتا ہوا اسی کے ٹیبل کے پاس آکر رک گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تو مسکرائے، دونوں سیم لباس میں تھے۔ اچھے لگ رہے تھے۔ امرینہ جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔

''امرینہ۔۔۔!!'' اس نے امرینہ کو دیکھا۔ امرینہ نے اثبات میں سرہلایا۔ اب دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

''آپ کیا پئیں گے؟ یا کچھ لینگے؟'' امرینہ نے آداب میزبانی کے خیال سے کہا۔

''کچھ نہیں۔۔۔!! آپ میری فیس کے پیسے لائی ہیں؟'' وہ بہت دوٹوک انداز میں بات کر رہا تھا۔

''نہیں۔۔۔!! میں ایڈوانس دوں گی۔۔۔!! پورے ڈھائی لاکھ، اور ڈھائی لاکھ کام ہونے کے بعد ادا کروں گی۔۔۔!!'' امرینہ نے بھی لہجہ وہی سخت بنایا۔ کام کا انداز دونوں کا سیم تھا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔!! لاؤ دو۔۔۔!! میں زیادہ وقت یہاں نہیں رکوں گا۔۔۔!!'' امرینہ نے بیگ سے پیسے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ اٹھا کر بنا گنے کوٹ کی جیب میں ڈال چکا تھا۔

''ویسے۔۔۔!! ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟'' امرینہ جو اپنے پرس میں کچھ دیکھ رہی تھی۔ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اثبات میں سرہلایا۔

''آپ اس کی پینٹنگ کیوں بنانا چاہتی ہیں؟ اس نے کون سا جرم کیا ہے؟ میں چاہتا ہوں۔۔۔!! میں جرائم پیشہ لوگوں کی پینٹنگ بناؤں۔۔۔!! تاکہ کچھ برے لوگ اس دنیا سے کم ہو جائیں۔۔۔!!'' امرینہ اس کے سوال پر اسے دیکھ کر رہ گئی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر بڑی طنزیہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''میرے خیال میں آپ کو پرسنل نہیں ہونا چاہیے۔۔۔!! اپنے کام پر فوکس رکھیں۔۔۔!! ویسے بھی کوئی جرم کی بات ہمارے درمیان میں نہیں ہوئی تھی اور اگر جرم گزیدہ لوگوں کی تصویریں بنانا چاہتے ہیں، تو آپ کو کسی قریبی تھانے کا رخ کرنا چاہیے۔ جب آپ فیس لے رہے ہیں، تو آپ کو مجھ سے ایک بھی سوال کرنے کا اختیار نہیں ہے۔۔۔!!'' امرینہ نے دوبارہ اپنے پرس میں وہ گم چیز ڈھونڈنی شروع کر دی۔ امرینہ کی بات سن کر پینٹر نے ہوں میں سرہلایا۔

''ہوں۔۔۔!! جیسے ہی آپ کی پینٹنگ مکمل ہو جائے گی۔۔۔!! تب میں وہ پینٹنگ آپ کو دے دوں گا۔۔۔!! آپ بقایا پیسے مجھے دے دیں گی۔۔۔!! ویسے۔۔۔!! سوال پوچھنا، اور سچائی جاننا میرا حق ہے۔۔۔!! اگر بعد میں مجھے ریلائز ہوا۔۔۔!! میں پوچھ سکتا ہوں۔۔۔!! یا اگر میرا دل نہیں چاہا، تو میں پینٹنگ بنانے سے انکار بھی کر سکتا ہوں۔۔۔!! تب میں آپ کو ایڈوانس کے پیسے واپس کر دوں گا۔۔۔!!'' امرینہ نے اثبات میں سرہلایا۔ اب وہ اٹھا، اور جانے کے لیے قدم اٹھایا۔

''سنو۔۔۔!!'' امرینہ نے کچھ یاد آنے پر اسے پکارا۔ وہ مڑا، اور امرینہ کو دیکھنے لگا۔

''جی۔۔۔!! آپ کچھ پوچھنا چاہتی ہیں؟'' امرینہ نے اسے دیکھا، اور اثبات میں سرہلایا۔ وہ بیٹھ گیا۔

''آپ مجھے اپنا ہاتھ دکھائیں۔۔۔!! میں دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔!!'' امرینہ کے کہنے پر پینٹر نے بلا سوچے سمجھے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا، امرینہ نے اس کا ہاتھ دیکھنا شروع کر دیا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' امرینہ نے پوچھا۔

''پینٹر۔۔۔!!'' اس نے بتایا۔

''ویسے۔۔۔!! مجھے ہاتھ کی لکیروں پر یقین نہیں ہے۔۔۔!!'' پینٹر نے ہاتھ کھینچ لیا۔ امرینہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''جو میں دیکھنا چاہتی تھی۔۔۔!! وہ میں دیکھ چکی ہوں۔۔۔!!'' امرینہ نے کہا، اور مسکرا دی۔

''کیا دیکھا؟'' پینٹر نے الجھن سے پوچھا۔

''آپ کو تو یقین نہیں ہے؟ سو میں بتانا پسند نہیں کروں گی۔۔۔!!'' امرینہ نے کندھے اچکائے۔ وہ مسکرا کر اٹھا، اور باہر جانے لگا۔ امرینہ نے اس کا نمبر پینٹر کے نام سے سیو کیا۔

''او مائی گاڈ۔۔۔!! پہلی بار میں کچھ بھی نہیں دیکھ پائی۔۔۔!! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا میں اپنا علم کھو چکی ہوں؟'' بار بار پینٹر کا کیا گیا سوال امرینہ کے دل و دماغ میں گونج رہا تھا۔ وہ بھی اٹھی۔ اور جانے لگی۔ مگر وہ بے حد پریشان ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

''پتہ نہیں جو کچھ ہم ٹائم پاس سمجھ کر کرتے ہیں۔۔۔!! اس کے عادی ہم کیوں ہو جاتے ہیں۔۔۔!! وہ میرے ساتھ ٹائم پاس میں کیا کچھ کر گیا۔۔۔!! میرا سب کچھ لے لیا۔۔۔!!'' امرینہ نے منہ پر چشمہ لگا کر اپنے آنسو چھپا لیے۔ وہ سڑک پر چل رہی تھی۔ جب اچانک ایک طرف سے سائیکل پر سوار ایک لڑکا اس کے ساتھ، ساتھ چلنے لگا۔

''جس عادت کو ہم پسند تک نہیں کرتے ہیں۔۔۔!! وہی کام بار بار کیوں کرتے ہیں؟'' وہ سوچ رہی تھی۔ جب اس سائیکل والے نے اس کو اپنا کندھا مار کر متوجہ کر لیا۔ وہ اسپورٹس سائیکل تھی۔ اس نے غصے سے اسے دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت رہ گئی۔ وہ رُخام تھا۔ جو اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ نفی میں گردن ہلانے لگی۔

''دل لینے والے تو جان دیتے ہیں۔۔۔!! مگر دغا نہیں کرتے ہیں۔۔۔!! اور تم جیسے لوگ صرف ٹائم پاس کرتے ہیں۔۔۔!! آپ کو اس پوری دنیا میں ٹائم پاس کے لیے صرف میں ہی ملا تھا۔'' رُخام نے جیسے اس پر طنز کیا۔

''جب دل ویران ہو جائے۔۔۔!! تو وہ جنگل بن جاتا ہے۔۔۔!! اور جنگل میں صرف وحشت ہوتی ہے۔۔۔!! وحشت انسان کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔۔۔!! اور جنگل انسان کو نقصان پہنچاتا ہے۔۔۔!! اسے کبھی آباد نہیں کرتا ہے۔۔۔!! کبھی کبھار پیار ہر مشکل کا حل نہیں بنتا ہے۔۔۔!! اور ویسے بھی جو لوگ دھوکہ دیتے ہیں۔۔۔!! ان کو بھلا دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔۔۔!! چلے جاؤ۔۔۔!! جس طرح سے آئے ہو۔۔۔!!'' رُخام نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ وہ دوڑ کر بھرے بازار میں جانے لگی۔ رُخام نے اس کے پیچھے بائی سائیکل دوڑا دی۔

''پلیز۔۔۔!! میری بات سنو۔۔۔!! میں آج بھی تم سے۔۔۔!!'' وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

''تم آج بھی صرف ٹائم پاس کر رہے ہو۔۔۔!! جس طرح میں کر رہی تھی۔۔۔!! مگر میں ٹائم پاس پاس میں سیریس ہو گئی تھی۔۔۔!! تم آج بھی مجھے چیٹ کر رہے ہو۔۔۔!! جس طرح میں کر رہی تھی۔۔۔!! میں دھوکہ کھا گئی۔۔۔!! مگر تمہاری وہ بات۔۔۔!! میں کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔۔۔!! کبھی نہیں۔۔۔!! تم ایک بدذات انسان ہو۔۔۔!! تم نے میرے جذبات سے کھیلا۔۔۔!! میرے احساسات کو توڑا۔۔۔!! میرا سب کچھ چھین لیا۔۔۔!!'' اس نے مڑ کر اس کی بات کاٹ ڈالی، اور غصے سے چیخ، چیخ کر کہا۔ رُخام نے اسے غصے سے دیکھا۔ اور بائی سائیکل آگے بڑھا دی۔ وہاں کافی لوگ جمع ہونا شروع ہو رہے تھے۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ اور آگے بڑھ کر آٹو میں بیٹھ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں جیسے آگ سی بھر گئی تھی۔ وہ جیسے سب کچھ جلا کر خاکستر کر دینا چاہتی تھی۔

امرینہ اور رُخام کے درمیان ایسا کیا ہو گیا؟ وہ دونوں ایک دوسرے سے شدید نفرت کرنے لگے۔ منشال کی پراسراریت کے پیچھے کیا راز ہے؟ کیا واقعی پینٹر کے پینٹنگ میں جادو ہے؟ وہ جس کی پینٹنگ بنا دے، اس کی موت ہو جاتی ہے۔ یہ سب جاننے کے لیے ٹائم پاس کا دوسرا حصہ پڑھنا نہ بھولیں۔

باقی آئندہ ماہ انشاء اللہ۔

بھیانک حقیقت

رابعہ آفرین-لاہور

لڑکی سیدھی چلتی ہوئی قبرستان کے گیٹ پر جا کر رک گئی، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والا اندھیرا ہر سو مسلط تھا، پورے علاقے میں نہ کوئی آدم اور نہ آدم ذات تھا کہ پھر اچانک.....

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے دل گرفتہ اور دل فریفتہ ذہن کو مبہوت کرتی کہانی

''اوہ.....اوہ.....'' حماد نے پاس سے گزرتی ایک لڑکی کو دیکھ کر سیٹی بجائی۔ جب وہ آگے گزر گئی تو پھر سے بائیں جانب دیکھنے لگا۔

پینٹ شرٹ پہنے شرٹ کے اگلے تین بٹن کھول کر کالر پیچھے گرائے وہ اس وقت گلی کی ایک نکڑ کے ''تھڑے'' پر ٹانگیں نیچے لٹکائے بیٹھا آتی جاتی لڑکیوں کو تاڑنے اور اندر اتر جانے والی نظروں سے دیکھنے میں مصروف تھا۔

دو برقع پوش لڑکیاں اور ایک لڑکا جو غالباً ان لڑکیوں کا بھائی تھا حماد کو اسی گلی کی طرف سڑک سے آتے دکھائی دیے۔

گلی کی نکڑ کیونکہ میں روڈ پر تھی تو گلی میں داخل ہونے والے اور نکلنے والے، سبھی کو اسی راہ سے گزرنا پڑتا تھا۔

لڑکیاں اور لڑکا اس کے پاس سے گزرنے لگے تو ایک لڑکی کی نظر غیر ارادی طور پر ایک لمحے کے لیے حماد پر گئی جس کا اس لڑکے نے فوراً فائدہ اٹھاتے ہوئے زبان تھوڑی سی باہر نکال کر دانتوں کے نیچے دباتے ہوئے اسے دیکھا۔

''لعنت ہو اس کم بخت پر۔'' لڑکی بڑبڑاتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ کر بہن کے برابر ہوئی۔

''کیا ہوا.....؟ کس پر لعنت بھیج رہی ہو؟''

دوسری لڑکی نے شاید سن لیا تھا، اسی لیے سرگوشی کے انداز میں اپنی بہن سے پوچھا۔

''وہ کمبخت چھچھورا، جس نے ہماری گلی کے کونے پر ڈیرہ لگایا ہوا ہے۔ پتا نہیں کہاں سے اٹھ کر آ گیا ہے ہم سب کے لیے مصیبت بن کے۔''

''تم اس کم بخت کی طرف دیکھ ہی کیوں رہی تھی؟'' دوسری لڑکی سرگوشی میں بولی اور باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگیں۔ پیچھے نہ دیکھنے کے باوجود دونوں کو پتا تھا کہ وہ انہیں دیکھ رہا ہوگا۔

ہوا بھی ایسا ہی، اس نے کافی دیر تک ان برقع پوش لڑکیوں پر نظر ٹکائے ہوئے رکھی۔ جب وہ اپنے گھر چلی گئیں تو وہ پھر سے بائیں طرف دیکھنے لگا۔ سڑک پر اکا دکا لوگ تھے۔ گلی بھی سنسان تھی۔ وہ مایوس ہوا لیکن پھر اچانک ہی اس کی مایوسی خوشی میں بدل گئی۔

ایک بے حد دلکش اور خوبرو حسینہ سڑک پر ایک ادا سے چلتی ہوئی اسی کے پاس سے گزری تو اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔

''ماشاءاللہ''

لڑکی آگے گزر گئی لیکن حماد کی نظریں لڑکی کے ساتھ جیسے چپک گئیں۔ خوبصورت بند شوز، جینز اور کرتا میں ڈوپٹے سے بے نیاز وہ سڑک پر آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کا کسی کو بھی بے قابو کر دینے والا سراپا چیخ چیخ کر حماد کو اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔

لڑکی ایک دکان پر جا کر رکی، کچھ سامان لیا اور واپس آتے ہوئے جان بوجھ کر وہ اس کے اور پاس سے لہراتے ہوئے مسکرا کر نظریں ملا کر آگے گزر گئی۔

''ہنسی یعنی پھنسی..... یہ تو پٹے گی۔'' حماد نے اسے آگے بڑھتا دیکھ کر خوشی سے سوچا۔ وہ لڑکی تھوڑا سا آگے جا کر رکی، مڑ کر مسکرا کر دیکھا اور پھر آگے بڑھ گئی۔

''بلکہ پٹ گئی سمجھو.....'' حماد نے اپنے کان کے اوپر اڑسا ہوا سگریٹ اتار کر لبوں سے لگایا اور خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے خود سے ہمکلام ہوا۔

''آج تو لاٹری نکل گئی..... جلدی چل جانی..... کہیں آگے نہ نکل جائے۔'' اتنی حسین لڑکی نے پہلی بار حماد کو لفٹ کروائی تھی۔ وہ خوشی سے سرشار لڑکی کے پیچھے ہو کر چل پڑا۔

چار پانچ منٹ چلنے کے بعد وہ لڑکی قبرستان کے گیٹ پر جا کر رکی ایک بار مڑ کر دیکھا، حماد اس سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا حماد کو پیچھے آتا دیکھ کر لڑکی نے ایک دلکش مسکراہٹ اچھالی اور قبرستان میں داخل ہو گئی۔

یہ عام سا قبرستان تھا، کم از کم یہاں کے لوگوں کا اس بارے میں یہی خیال تھا کیونکہ یہاں آج تک کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اس لیے لوگ اسے آنے جانے کے لیے شارٹ کٹ کے طور پر استعمال کرتے تھے اکثر۔

''واہ جانی..... لگتا ہے نمبر دے کر جائے گی اپنا..... تبھی تو سنسان راستہ چنا ہے۔ لگتا ہے اس پری کا بھی دل آ گیا ہے مجھ پر.....'' وہ بڑبڑاتا ہوا قبرستان کے دروازے تک پہنچا اور خود ہی خوش ہوتا ہوا بولا۔

''اور کیوں نہ آئے؟ آخر ہیروں ہوں پورا میں۔'' اس نے اپنا بایاں ہاتھ بالوں میں پھیر کر کنگھا کیا اور بلیوں اچھلتے دل کے ساتھ قبرستان میں داخل ہوا۔

سارا قبرستان خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔

کل رات ہونے والی بارش کی وجہ سے قبرستان کی زمین کہیں کہیں سے پھسلن زدہ ہو چکی تھی

اور کہیں صرف گیلی تھی۔ چند ایک قبریں زمین میں دھنس چکی تھیں۔

ایک قبر ایک طرف سے مکمل زمین میں دھنس کر سوراخ نما گڑھا بنا رہی تھی۔

حماد نے اندر جھانکتے ہوئے۔ ''اندر کوئی ہے جناب؟'' کی ہانک لگائی اور پھر خود پر ہنس پڑا۔

اس حسینہ کی تلاش میں حماد نے نظریں گھمائیں تو وہ ایک درخت کے نیچے کھڑی اس کو ہی دیکھ رہی تھی۔

''جلدی چل جانی وہ رہی تیری حسینہ۔'' جلدی جلدی مگر احتیاط سے قدم اٹھاتا وہ حسینہ کے قریب جا پہنچا۔ قریب پہنچ کر وہ چند پل ساکت ہو کر اس لڑکی کو ہی دیکھے گیا۔ وہ تھی ہی حسن کا شاہکار!

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' وہ من موہنی سی آواز میں بولی۔

''مجھے پتا ہے.....'' وہ بے وقوفوں کی طرح دانت نکالتے ہوئے بولا۔

''تم پر نظر پڑتے ہی تم مجھے پسند آ گئے تھے۔ دل کر رہا تھا کہ تمہیں چوم لوں۔'' اس لڑکی نے حماد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شرما کر کہا۔

''اس میں کون سی بات ہے؟ اب آ گیا ہوں اب چوم لو۔'' حماد نے لڑکی کے حسین سراپے کو نگاہوں میں سماتے ہوئے خوشی سے سرشار ہو کر کہا اور پھر خود سوچا کہ۔

''جب لڑکی خود ہی فاسٹ ہے تو میں کیوں بریک لگاؤں؟''

''نہیں مجھے شرم آتی ہے، تم آنکھیں بند کر لو۔'' لڑکی نے شرماتے ہوئے کہا تو حماد فوراً آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔ ''لو چوم لو۔''

چند سیکنڈ میں ہی حماد کو اپنے دل کے مقام پر شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ تو اس نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے تکلیف کے مارے آنکھیں کھولیں تو اس حسینہ کے ہاتھ میں حامد کا دل دھڑک رہا تھا!

جو وہ ایک ہی جھٹکے میں ہاتھ مار کر باہر نکال چکی تھی!

حماد درد کی شدت کی وجہ سے چیخ بھی نہ سکا۔ دانت دانتوں پر جم گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ حسینہ ایک خوفناک چڑیل کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

لڑکی کا یہ خوفناک روپ حماد پھٹی، پھٹی آنکھوں سے دیکھتا ہوا زمین پر گر پڑا اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔

''تمہیں کسی نے سکھایا نہیں؟'' وہ بدصورت چڑیل اس کے قریب نیچے بیٹھ کر سرگوشی میں بولی۔

''کہ بدنگا ہی جہنم میں ہی نہیں، چڑیل کے پیٹ میں بھی لے جاتی ہے انسان کو!''

حماد کی ساکت نگاہیں چڑیل پر تھیں۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چڑیل حماد کی دل کو اپنے منہ میں ڈال کر چباتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''چلو زمین سے ایک بوجھ تو کم ہوا۔''

دعا

ایک جاگیردار کے بیٹے کو موٹر چلانے کا شوق ہوا چلتے وقت اس نے باپ سے کہا۔

''دعا کیجیے، میں صحیح سلامت واپس آ جاؤں۔'' باپ نے کہا۔

''یاد رکھنا، میری دعا صرف بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار کا ساتھ دے سکتی ہے۔ اس سے زیادہ کا نہیں۔''

(وہاب آرائیں-لاہور)

نوبل کاز

شہزاد خان-صادق آباد

کورونا وائرس کی تباہ کاریوں کے پس منظر میں لکھی گئی ایک فکر انگیز تحریر جو دل کو بھائے گی۔

حقیقت سے چشم پوشی ٹھیک نہیں اور جو ایسا کرتے ہیں وہ گھاٹے میں..... رہتے ہیں

پری میڈیکل میں اچھے نمبر نہ آنے کی وجہ سے راحیل کا ملک کے کسی بھی اچھے میڈیکل کالج میں ایڈمشن نہ ہوسکا۔ جس کی وجہ سے آج کل اس پر اداسی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ ایک دو بار تو اس کے ذہن میں یہ آیا کہ وہ اپنا ڈاکٹر بننے کا خواب بھول کر کوئی اور فیلڈ جوائن کرلے لیکن پھر..... بس یہاں آکر اس کی سوچ کی سوئی اٹک بلکہ بالکل رک جاتی تھی۔ خاندان کے افراد اور ان کی چبھتی ہوئی نظریں اور طنزیہ طعنوں کا خیال آتا تو لرز جاتا۔ اسے اپنے ملک کے ایجوکیشن سسٹم اور داخلوں کے طریقہ کار پر غصہ آنے لگتا جو اچھے خاصے ٹاپرز کو ان نام نہاد امتحانوں سے گزار کر چغد بنا دیتے تھے۔ اچھا خاصہ پوزیشن ہولڈر ایک چھوٹے سے امتحان میں اچھے نمبر نہ لے سکنے کی وجہ سے دوسروں کی نظروں میں بیوقوف اور نالائق جیسے خطابات پانے کا اہل قرار پاجاتا تھا۔ اس نے اپنے تئیں بہت سے میڈیکل کالجوں میں داخلے کے لئے بھاگ دوڑ بھی کی اور ایڈمشن ٹیسٹ بھی دیئے لیکن نتیجہ ندارد، کبھی ٹیسٹ میں نمبر کم کبھی کالجوں کے میرٹ کا بھوت اس کے سر پر سوار رہتا۔

☆.....☆.....☆

راحیل اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا شروع سے ہی لاڈ پیار میں پلا بڑھا تھا اس کے والد نادرا آفس میں ایک چھوٹے سے افسر تھے لیکن اپنے بیٹے کی ہر خواہش کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ وہ چونکہ خود ایک ڈاکٹر بننا چاہتا تھا لیکن مالی حالات کی وجہ سے اپنے اس خواب کو عملی جامعہ نہ پہنا سکا۔ وہ کسی نے سچ کہا ہے کہ باپ اپنے خوابوں کی تکمیل اپنے بچوں میں ڈھونڈتا ہے شاید یہی وجہ تھی کہ میٹرک پاس کرنے کے بعد اس نے راحیل کو شہر کے ایک اچھے اور نامی گرامی کالج میں داخل کروادیا تھا۔

میٹرک میں راحیل کے اچھے نمبروں کی وجہ سے حکومت کی طرف سے اسے ایک لیپ ٹاپ اور تعریفی سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا تھا..... اس کی محنت دیکھتے ہوئے اور خود راحیل کے ڈاکٹر بننے کے شوق کو دیکھ کر اس نے اسے مزید اچھے کالج میں داخل کروادیا تھا..... لیکن شاید قسمت کو کچھ اور منظور تھا کہ اس کے ایف ایس سی پری میڈیکل میں اچھے نمبر نہ آسکنے کی وجہ سے اسے اپنا خواب ادھورا نظر آرہا تھا۔ راحیل خود بہت پریشان تھا اس کے بقول اس نے امتحان میں اچھے پیپر دیئے میں بہت محنت کی تھی لیکن یہ بات اسے قطعی ہضم نہ ہو رہی تھی کہ آخر اس کے نمبر اچھے کیوں نہیں آئے.....؟

بہر حال تقدیر سے تو کوئی نہیں لڑسکتا اس لئے اس نے ان تمام کالجوں کی خاک چھان لی جہاں جہاں اسے امید تھی کہ اس کا داخلہ ہوسکتا تھا۔راحیل کے ابو مشتاق احمد نے اپنے کچھ دوستوں سے اس بات کا ذکر کیا تو ان میں سے دو ایک نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ اگر اس کے بیٹے راحیل کا داخلہ پاکستان میں نہیں ہو رہا تو وہ روس یا چائنہ میں کوشش کرے کیونکہ وہاں میڈیکل اور انجینئرنگ کا میرٹ بہت مناسب ہوتا ہے اور آسانی سے داخلہ مل سکتا ہے چونکہ ایسے ممالک کو صرف زرمبادلہ سے مطلب ہوتا ہے کہ کسی بھی صورت ملک میں پیسہ آنا چاہئے۔اور یہی وجہ ہے کہ چائنہ اور روس میں میڈیکل کا سالانہ خرچہ تقریباً پاکستانی چار تا پانچ لاکھ تک ہوتا ہے اور اگر کسی طور وہاں اسکالرشپ کا بھی بندوبست ہوجائے تو پھر بچوں کے وارے نیارے ہوتے ہیں اور انہیں صرف اپنا خرچ چلانے کے لئے کچھ رقم درکار ہوتی ہے۔

بہر حال یہ تو ایک الگ ٹاپک ہے۔راحیل کے ابو کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ بغیر اسکالرشپ کے اپنے بیٹے کو روس یا چائنہ بھیج سکے اس لئے اس نے کسی اچھے کنسلٹنٹ سے مشورہ لینے کا سوچا اور پھر ایک روز دفتر سے چھٹی کر کے ایک کنسلٹنٹ سے ملاقات کی اور اسے اپنا مدعا بیان کیا۔ جواب میں اسے وہ تمام معلومات پہنچادی گئیں جسے سن کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔پھر ایک روز اس نے چائنہ میں موجود ایک میڈیکل کالج سے رابطہ کر کے ان کی ضرورت کی تمام دستاویزات تیار کروالیں اور پھر ایک مکمل کیس تیار کر کے وہ تمام دستاویزات ڈی ایچ ایل کوریئر کے ذریعے چائنہ کے اس کالج کو بھجوادیں۔

تقریباً ایک ماہ کے بعد اسے ایک پیکٹ موصول ہوا جس میں اسے اس بات کی نوید سنائی گئی تھی کہ اس کے بیٹے راحیل کو اسکالرشپ دینے کی منظوری ہوگئی ہے لیکن اس کے لئے اسے کچھ تھوڑی بہت رقم جو کالج کی فارمیلٹی ہوتی ہے وہ لازمی بھیجنا ہوگی۔مشتاق احمد کی خوشی دیکھنے والی تھی اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے اب اسے اپنا خواب پورا ہوتا نظر آرہا تھا۔اس نے برے وقت کے لئے کچھ رقم بینک میں رکھوائی ہوئی تھی اور آج اسے اس بات کی خوشی اور اطمینان تھا کہ وہ رقم اس کے اور اس کے بیٹے راحیل کے خوابوں کی سیڑھی بننے جارہی تھی۔

اس نے بینک منیجر سے بھی مشورہ کیا جو اس کا دیرینہ دوست تھا اس نے بھی اپنے تئیں تمام تحقیقات کرلیں تھیں کہ آیا وہ کالج کوئی فراڈ تو نہیں ہے اس کے لئے اس نے اپنے دوست کو اس کالج کا ایڈریس ای میل کردیا تھا جو اس وقت شنگھائی میں ہی جاب کے سلسلے میں مقیم تھا۔راحیل کا ایڈمشن چائنہ میں نین جنگ میڈیکل کالج جیانگ سو میں ہوگیا تھا اور تمام کاغذات کی جانچ پڑتال کے بعد ہی اسے پاکستان سے چائنہ کے لئے روانہ ہونا تھا۔

اس تمام کام میں تقریباً تین ماہ لگ گئے اور پھر آخر کار اس کو کالج کی جانب سے روانگی کا پروانہ موصول ہوگیا۔راحیل کے والدین کی خوشی سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔راحیل الگ اڑا اڑا پھر رہا تھا۔اپنی ضرورت کی اشیاء اپنے ابو کے ساتھ بازار جاکر خریدلی تھیں اور اس وقت ان سب چیزوں کو ترتیب سے ایک نئے سوٹ کیس میں رکھنے میں مصروف تھا اور اس کام میں اس کی امی اس کی مدد کررہی تھی۔گھر میں اس وقت وہ دونوں ہی موجود تھے اور اس کے ابو بازار سے کچھ اور سامان لینے کے لئے گئے ہوئے تھے۔

ایڈمشن خط کے مطابق اسلام آباد سے روانگی مورخہ ۱۳ اگست کو تھی اور کلاسز کا آغاز ستمبر میں ہونا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے وہاں ایک اچھے اور تقریباً سستے ہاسٹل میں ایک کمرہ بھی شیئرنگ میں مل گیا تھا جس کی اطلاع خط میں موجود تھی دو وقت کے میس کے علاوہ پاکستانی روپوں میں اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ رقم بنتی تھی جو کہ مشتاق احمد نے دینے کی حامی بھر لی تھی اور تعلیم کا خرچہ اس کی اسکالرشپ کے ذریعے پورا ہوگیا تھا۔

روانگی کے مطابق اسے رات دس بجے کی فلائٹ سے تین گھنٹے پہلے لاہور سے اسلام آباد پہنچنا تھا اس لئے وہ صبح ہی وہاں سے روانہ ہو چکے تھے اور اس وقت ائیر پورٹ پر تھے۔ ویٹنگ ہال میں وہ اس وقت اکیلا موجود تھا سامان ساتھ ہی رکھا ہوا تھا اور پھر روانگی کا وقت بھی آپہنچا اور وہ دس بجے کی فلائٹ سے چائنہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

یہ صبح کے چھ بجے ہونگے جب اس کا جہاز چائنہ کے ائیر پورٹ پر لینڈ کر گیا۔ پاکستان سے چائنہ کا فضائی فاصلہ تقریباً پانچ گھنٹے چھ منٹ کا ہے اور چائنہ پاکستانی وقت سے تقریباً تین گھنٹے آگے ہے۔ ائیر پورٹ سے تمام ضروری چیکنگ کے بعد اسے ٹیکسی کے ذریعے کالج کی جانب سے بتائے گئے ہاسٹل میں پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کیونکہ اسے ایک انڈین ٹیکسی ڈرائیور مل گیا تھا جس سے باآسانی بات چیت کر کے وہ اپنے ہاسٹل پہنچ گیا تھا۔ اور اس وقت وہ اسی کے ایک ایسے کمرے میں موجود تھا جس میں چار بیڈ لگے ہوئے تھے جن میں سے ایک اس کے لئے تھا۔ بقایا تین بیڈ ابھی خالی تھے اور وہ کس کے تھے کچھ پتہ نہیں تھا اور نہ ہاسٹل کی انتظامیہ نے اسے کچھ بتانا مناسب سمجھا تھا۔

اس نے اپنے سوٹ کیس سے کچھ ضروری سامان نکال کر لاکر میں رکھ دیا تھا اور پھر ہاسٹل کے کاؤنٹر پر فون کر کے اپنے لئے کھانے کے لئے کہا۔ جواب میں اسے آدھے گھنٹے بعد ہال میں ناشتہ کے لئے کہا گیا اور ساتھ ہی اسے ہال کی نشاندہی بھی کر دی جو اسی بلڈنگ میں ہی تھا۔ مقررہ وقت پر ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ واپس اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹ گیا اور نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ نیند کی وادیوں میں خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔

☆.....☆.....☆

پھر اچانک کمرے میں یکدم شور ہو جانے کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اس کے ساتھ والے بیڈ پر تین نوجوان لڑکے موجود تھے جن میں سے گندمی رنگ والا انڈین اور بقایا دو میں سے ایک پاکستانی اور تیسرا کوئی حبشی لگ رہا تھا جس کا کالا رنگ کمرے میں بھی خوب چمک رہا تھا۔

انہیں اپنے نزدیک بیٹھا دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا اور پھر ان سے تعارف ہونے پر معلوم ہوا کہ اس کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا جن میں ایک پاکستانی جس کا نام معز تھا اس کا تعلق بہاولپور سے تھا اور دوسرا انڈین ہی تھا اور اس کا تعلق جے پور سے تھا اور تیسرا سوڈانی تھا جس کا نام آکونگ تھا۔ وہ تینوں بھی اس کی طرح اسکالرشپ پر ہی یہاں آئے تھے لیکن وہ تینوں مختلف پروفیسرز میں ڈگریاں کر رہے تھے۔ چونکہ یہ ایک بوائز ہاسٹل تھا اس لئے یہاں بہت سے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ملکی اور غیر ملکی طلباء مقیم تھے۔

بہرحال قصہ مختصر کچھ ہی دنوں میں یہ سب دوستوں کی طرح رہنے لگے۔ ہاسٹل سے کالج اور کالج سے دوبارہ ہاسٹل روزانہ کا معمول بن گیا۔ اس عرصے میں راحیل نے صرف ضرورت کے وقت اپنے ابو سے رابطہ کیا کیونکہ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ جس قدر ہو سکے یہاں پیسے بچا پائے کیونکہ اسے اپنے مالی حالات کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اس لئے وہ پھونک پھونک کر پیسے خرچ کرتا تھا۔

اس کی تعلیم کا دوسرا سال شروع ہو چکا تھا۔ چائنہ میں بہت سے پاکستانی لوگوں نے وہاں کے مقامی باشندوں کے ساتھ ساز باز کر کے مختلف ایجوکیشن کالجز بنا رکھے تھے اور دوسرے ممالک سے بہت سے طلباء کم خرچ کے سلسلے میں یہاں داخلے لیکر اپنی تعلیم کا شوق پورا کر رہے تھے۔

راحیل کو اور اس جیسے کچھ طلباء کو وہاں کے ایک مقامی ادارے ایکشن ایڈ نے سپورٹ کیا تھا اور وہی ان کے اخراجات کالجز کو ادا کر رہا تھا۔ دیگر اخراجات اسے خود ادا کرنے پڑتے تھے۔ پھر بھی اسے کافی سہارا تھا اور

وہ جلد از جلد اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے ملک پاکستان جانا چاہتا تھا تاکہ وہاں جا کر اپنے ملک کے لوگوں کی خدمت کر سکے۔ چائنہ میں رہتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے اور اب اسے ان کی زبان کی کافی حد تک سمجھ لگنے لگی تھی۔

وہاں کے کھانے اور بازاروں میں پاکی ناپاکی کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر جانوروں کی طرح خورد و نوش کی اشیاء کا استعمال بے دریغ کیا جا رہا تھا۔ اکثر جب بھی اسے کسی کام سے وہاں کے بازاروں سے گزرنا پڑتا تو بمشکل اپنی متلی کو روکنا پڑتا لیکن وہ مجبور تھا کیونکہ حقیقت سے نظریں چرانا اس کے بس سے باہر تھا..... تعلیم کا سلسلہ جاری تھا اور دھیرے دھیرے وقت کا پنچھی پر لگائے اپنی منزل کی جانب پرواز کرتا رہا اور ایک دن اسے ڈاکٹری کی ڈگری سے نواز دیا گیا۔ اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا اس نے سب سے پہلے فون کر کے اپنے گھر والوں کو اس کا بتایا اور پھر ساتھ ہی ہاؤس جاب کے لئے وہاں کے ایک پررونق علاقے و وہان میں موجود ایک بہت بڑے جنرل اسپتال میں اپلائی کر دیا..... جلد ہی اسے وہاں ہاؤس جاب کرنے کا لیٹر موصول ہو گیا اور پھر اس نے ایک سال کے لئے وہاں اپنی خدمات سرانجام دینی شروع کر دیں۔ راحیل نے اپنی تعلیم کے سالوں میں دن رات محنت کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ قدرت نے اسے یہ ایک موقعہ دیا ہے جسے وہ گنوانا نہیں چاہتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ اس کے ابو کا کوئی اور ذریعہ آمدن نہیں ہے اس لئے وہ چاہتا تھا کہ وہ ایک کامیاب ڈاکٹر بن کر اپنے ابو کا سہارا بننے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کے عوام کی خدمت بھی کر سکے۔ اس لئے جب اسے ڈاکٹری کی ڈگری ملی تو اسے اس کے ساتھ ساتھ اس کی قابلیت کی تعریفی سند علیحدہ دی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی ہاؤس جاب کے لئے وہاں کی انتظامیہ کو ایک ریکمنڈیشن لیٹر بھی بھیج دیا گیا تھا جس کے بل بوتے پر اسے فوری ہاؤس جاب کا لیٹر روانہ کر دیا گیا تھا اور اس کے نتیجے میں آج وہ وہاں ایک کامیاب ڈاکٹر کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دینے میں مصروف تھا۔ ہاؤس جاب کے دوران اس کی محنت کو دیکھتے ہوئے وہاں کی انتظامیہ نے اعزازی طور پر اس کے لئے ایک معقول وظیفہ کا بندوبست کر دیا تھا جس کی وجہ سے اسے کچھ اخراجات کی ادائیگی ہونے لگی تھی اور پھر ان پیسوں میں سے کچھ پیسے اس نے گھر بھی بھجوانے شروع کر دیئے تھے لیکن اس کے باوجود اس کے والدین اسے جلد از جلد پاکستان پہنچنے کے لئے زور دیتے رہتے تھے لیکن اس کی یہ کوشش تھی کہ وہ جب واپس اپنے ملک جائے تو ایک کامیاب ڈاکٹر کے طور پر وہاں کے لوگوں سے ملے۔ اس لئے وہ بڑے پیار سے اپنے امی ابو کو ٹال دیتا تھا اور اس کے والدین کو اس کی خوشی بھی عزیز تھی اس لئے وہ بھی مجبور ہو جاتے تھے لیکن کبھی کبھی جب راحیل کا فون آتا تو سب سے پہلے یہی مطالبہ ہوتا کہ گھر کب آ رہے ہو.....؟.....۔

☆.....☆.....☆

یہ رات کے تقریباً ایک بجے کا وقت ہو گا جب وو ہان کے ایک علاقے کے سڑک پر ایک سیاہ کار بڑی تیزی سے فراٹے بھرتی جا رہی تھی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک کرخت چہرے والا شخص موجود تھا جس کے چہرے سے اس کی سفاکی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا وہ سٹیرنگ کو یوں گھما رہا تھا جیسے کسی کی گردن کو پکڑ کر دائیں بائیں مروڑ رہا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کے خدوخال میں بھی اتار چڑھاؤ نمایاں محسوس ہوتا تھا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ایک درمیانی عمر کی عورت اور ایک ادھیڑ عمر کا شخص موجود تھے، عورت نے اپنے گٹھنوں پر ایک سیاہ بریف کیس رکھا ہوا تھا جس کے اندر مختلف قسم کی شیشے کی رنگ برنگی ٹیوبیں موجود تھیں۔ جن میں مختلف رنگوں کے محلول دکھائی دے رہے تھے۔ بوڑھا شخص بڑے غور سے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا جیسے اسے پیسے ہی اسی کام کے لئے دیئے گئے ہوں کہ اس نے اس عورت کے کام پر نظریں ٹکا کر رکھی

ں۔اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے
کام میں پوری طرح ایمانداری دکھا رہا ہو۔عورت مختلف
تم کے ٹیوبس کو الٹ پلٹ کر رہی تھی لیکن اس احتیاط
کے ساتھ کہ کوئی بھی ٹیوب ایکدوسرے سے ٹکرا نہ سکے
یسے بھی بریف کیس اس انداز کا اندر سے بنا ہوا تھا کہ
س میں ٹیوبس رکھنے کے لئے مختلف سائز کے خانے
نے ہوئے تھے جن میں تمام ٹیوبس بڑی ترتیب سے
کھی ہوئی تھیں۔وہ نہ جانے انہیں الٹ پلٹ کر کے کیا
یکھنا چاہ رہی تھی۔کافی دیر اسی کارروائی میں مصروف
رہنے کے بعد اس نے ایک طویل سانس لی اور آہستہ
سے بریف کیس کو بند کر کے پچھے والی سیٹ کے اوپر رکھ
دیا..... "کیا ٹیوبس پوری ہیں....." بوڑھے نے اسے
بریف کیس بند کرتے دیکھ کر پوچھا..... "جی ہاں پوری
ہیں..... مجھے شک ہوا کہ شاید میں اورنج والی ٹیوب
وہیں لیبارٹری میں ہی بھول آئی ہوں.....!!!۔

یہ سن کر اس بوڑھے کے منہ سے بھی اطمینان کی
سانس خارج ہوئی اور اس نے کوئی اور بات کئے بغیر ہی
پچھلے سیٹ کے ساتھ اپنا سر ٹکا لیا۔گاڑی کے اندر دوبارہ
گھمبیر خاموشی چھا گئی.....اس دوران ڈرائیور نے کوئی
بات نہیں کی اور نہ ان دونوں میں سے کسی نے اس سے
کوئی بات کی.....سڑکوں کے علاوہ چاروں طرف
بھی ایک خاموشی طاری تھی یہ وجہ نہ تھی کہ وہاں لوگ
سوئے ہوئے تھے بلکہ یہ وہان کا یک سنسان علاقہ تھا
جہاں سے صرف وہی لوگ رات کے اس وقت گزرنے
کی ہمت کرتے تھے جنہیں وہاں کے بارے میں مکمل
معلومات حاصل تھی ورنہ عام لوگ تو اس علاقے کی
طرف دن میں بھی نہیں بھٹکتے تھے۔لیکن چونکہ یہ دونوں
یہیں کے باشندے تھے لیکن اس وقت کسی اور ملک سے
آنے والی فلائٹ سے یہاں پہنچے تھے اس لئے اس
وقت ان کی منزل وہان کے اس علاقے میں موجود اپنی
ایک خفیہ لیبارٹری کی جانب تھی۔ان کے انداز سے یوں
لگتا تھا جیسے وہ بریف کیس میں کوئی بہت بڑا راز یہ خزانہ
لے کر جا رہے ہوں۔عورت کا چہرے پر ایک خاص قسم کا
جوش تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس سارے کام میں
اس کا کردار بہت اہم تھا لیکن اس کے برعکس بوڑھا
اطمینان سے سر ٹکائے ادھ کھلی آنکھوں سے نیند کے
مزے لے رہا تھا.....۔

☆.....☆.....☆

ایک بہت ہی بھیانک اور لرزا دینے والا تجربہ تھا
جو اس وقت کامیابی کے دھانے پر کھڑا تھا اور کسی بھی
لمحے ایک زوردار دھماکے کی مانند یہ خبر گونجی تھی کہ ان کا یہ
بھیانک تجربہ کامیاب ہو گیا ہے اور وہ ایک بڑی سپر پاور
بن کر پوری دنیا میں ابھریں گے اور دنیا کے تمام ممالک
کی تقدیریں ان لوگوں کی مٹھی میں ہونگیں۔وہ جب اور
جہاں چاہیں گے ایک بیماری یا وائرس کی صورت میں
قیامت برپا کر کے اس ملک کو نیست و نابود کر دیں گے یا
دوسرے لفظوں میں ایسے ملکوں کو دھمکیاں دیکر ان سے
بہت سی دولت اور دیگر راز اگلوا سکیں گے۔اس خونی
کھیل میں دو چائنیز ایک عورت زنگ چاؤ اور ایک ادھیڑ
عمر مرد وانگ فینگ کا بہت بڑا ہاتھ تھا وہ دونوں پیشے کے
لحاظ سے سائنسدان تھے اور جاب کے سلسلے میں یہاں
ایک لیبارٹری میں تعینات تھے۔انہیں لگ بھگ دس تا
بارہ سال ہو گئے تھے اور اس دوران انہوں نے بہت
سے ایسے تجربات اور ایجادات کیں کہ جنہیں استعمال
کر کے بہت سے ملکوں نے مالی فائدہ اٹھایا اور بہت
سے ملکوں نے ان کی بنائی ہوئی ایجادات کو غلط مقاصد
کے لئے استعمال کر کے اپنے ظالمانہ کردار کو اجاگر کیا اور
اپنی سفاکانہ طبیعت کے لئے تسکین حاصل کی۔اس
تجربہ سے کسی بھی ملک میں ایک بہت ہی خطرناک اور
جان لیوا وائرس کو چھوڑ کر وہاں موجود تمام جانداروں کو
ایک بہت ہی موذی مرض میں مبتلا کیا جا سکتا تھا جس کی
وجہ سے وہ جاندار سانس گھٹنے یا پھیپھڑوں کے ضائع
ہو جانے کی وجہ سے موت کے منہ میں چلے جاتے۔اور
سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ یہ لوگ زہر تو تیار کر چکے
تھے لیکن اس کے تریاق کے لئے انہوں نے کوئی کام
نہیں کیا تھا دوسرے لفظوں میں اگر کوئی اس موذی

وائرس کا شکار بنتا تو سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہتا کہ وہ سسک سسک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کو گلے لگالیتا۔ پوری دنیا کا قانون ہے کہ جب بھی دنیا میں کوئی مڈیسن تیار کی جاتی ہے تو جب تک اس کے ری ایکشن کا توڑ نہ ڈھونڈ لیا جائے تب تک اس میڈیسن کو مارکیٹ میں نہیں لایا جاتا۔ لیکن اس وقت لیبارٹری میں موجود تمام کے تمام بیوقوف جی ہاں میری نظر میں وہ سب بڑے بڑے اور نامور سائنسدان بیوقوف ہی تھے جنہوں نے ایک وائرس تو تیار کرلیا تھا جو اس وقت وہاں ایک مخصوص اور چاروں طرف سے بند جگہ پر چھوڑا جاچکا تھا لیکن اس سے ہونے والے نقصان کی شدت کا اندازہ لگائے بغیر بڑی خوشی سے اس کے نتیجے کے انتظار میں آنکھیں گاڑے اس شیشے کے کیبن کی طرف سانس روکے دیکھنے میں مگن تھے جس میں ایک چھپن سالہ شخص بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور اس بیڈ کے سوا کمرہ ہر قسم کے سامان سے خالی تھا۔ سامنے گھڑکی پر لگا شیشہ یکطرفہ تھا یعنی کمرے کے اس طرف کھڑے تمام افراد اس بوڑے کو دیکھ رہے تھے لیکن وہ بوڑھا بڑی حیرت سے آنکھیں پھاڑے کمرے میں ادھر ادھر نظریں گھما رہا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اسے اسپتال کے وارڈ سے اٹھا کر اس کمرے میں کیوں لاکر چھوڑ دیا گیا ہے اور حیرتناک بات یہ بھی تھی کہ یہ بیڈ اسی اسپتال کا ہی تھا..... وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اسپتال والوں نے اسے کسی اور کمرے میں تو نہیں شفٹ کردیا.....!!!..... لیکن پھر اسے اپنا یہ خیال جھٹکنا پڑا کیونکہ اگر یہ اسپتال کا کمرہ ہوتا تو کم از کم اس میں کچھ ساز و سامان تو ہوتا.....!! اور اسپتال کا کوئی عملہ یا کوئی نرس ہی دکھائی دے جاتی.....!!..... لیکن یہاں تو اس کے علاوہ کوئی دکھائی نہ رہا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بیڈ سے نیچے اتر کر سامنے نظر آنے والے کمرے کے اکلوتے دروازے کو کھولنا چاہا لیکن دروازہ تو ایسے بند تھا جیسے کسی نے اسے بڑی مضبوطی سے دوسری جانب سے بند کردیا ہو..... چونکہ شیشہ اس قسم کا تھا کہ جس سے صرف باہر سے اندر کی طرف دیکھا جاسکتا تھا لیکن کمرے میں موجود اس کو شیشے میں صرف اپنی شکل ہی دکھائی دے رہی تھی اس لئے وہ اس بات سے قطعی لاعلم تھا کہ اس کی ہر حرکات و سکنات کو دوسری طرف کھڑے افراد بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ گزرے ہونگے کہ اچانک دروازے پر ایک کھٹکا ہوا اور دوسرے لمحے آہستہ آہستہ دروازہ کھلنے لگا اور دوسری طرف ایک چقندر کی شکل والے شخص کی صورت دکھائی دی جس نے چہرے پر ایک فیس ماسک پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے پکڑی ہوئی تھی اس نے دروازے میں کھڑے کھڑے اسے اشارہ کیا اور ٹرے آگے بڑھادی بوڑھا جو دروازہ کھلتا دیکھ کر ایک دم چونک گیا تھا اس نے حیرت کے ملے جلے رجحان سے قدم بڑھاتے ہوئے دروازے کے اندر سے ٹرے تھام لی اور دوسرے لمحے ایک پانی کی بوتل بھی اسے تھمادی گئی اور پھر اچانک اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے دروازہ دوبارہ ایک زوردار جھٹکے سے یوں بند ہوگیا جیسے کسی نے بڑی عجلت سے اسے بند کردیا ہو۔ بوڑھا ٹرے ہاتھ میں لئے دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور پانی کی بوتل ایک جانب رکھ کر کھانا کھانے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہورہا ہے.....؟ اور یہ کون لوگ ہیں اور اسے کیوں یہاں قید کررکھا ہے.....!!..... کافی دیر سوچ سوچ کر اس کے سر میں درد شروع ہونے لگا تو اس نے کندھے جھٹکتے ہوئے برتن ایک جانب رکھے اور لمبی تان کر سوگیا۔

☆.....☆.....☆

اسی طرح روزانہ کا معمول بن چکا تھا اور اسے اس کمرے میں قید ہوئے تقریباً چودہ روز ہوگئے تھے .....اس دوران وہی شخص اسے برابر تین وقت کا کھانا پہنچادیتا تھا اور اس کے کسی سوال کا جواب دیئے بغیر تیزی سے دروازہ بند کردیتا تھا۔ دو چار روز تک اس بوڑھے نے جب کوئی جواب نہ پایا تو خاموش ہوگیا اور پھر خود بھی بڑی خاموشی سے اس سے کھانا وصول کرتا اور پھر خود ہی دروازہ بند کردیتا۔ ایک رات اچانک اسے

کھانسی کا دورہ پڑا اس نے کھانسی روکنے کی بہت کوشش کی لیکن اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے اس کا ناک اور منہ چٹکی سے پکڑ کر بند کر دیا ہو اور اسے سانس لینے میں بہت مشکل پیش آنے لگی۔ کھانس کھانس کر اس کے سینے میں درد شروع ہو چکا تھا.....اس نے کوشش کر کے بہت دفعہ دروازہ پیٹا لیکن دوسری طرف سے بالکل خاموشی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس بلڈنگ میں اکیلا ہو۔ جب اسے کھانسی کا دورہ پڑتا تو اس کی آنکھیں خون کبوتر ہو جاتی تھیں۔ ایک رات اسے اچانک بہت تیز بخار بھی ہو گیا لیکن اس دوران کوئی بھی اس کی خبر گیری کو نہیں آیا۔ شام کے وقت جب اسے کھانا دینے وہ شخص آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک تھی جیسے کسی کو اس کی من پسند چیز نظر آ گئی ہو.....!!.....لیکن اس دوران اسے کھانسی کچھ کم محسوس ہوئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ اسے کوئی دوا لانے کا کہتا وہ جا چکا تھا۔ اور اس وقت رات کے تقریباً گیارہ بجے تھے کہ اسے ہلکا ہلکا بخار ہونے لگا .....اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اسے بہت تیز بخار ہو گیا اور اسے سردی محسوس ہونے لگی اور اس کے ساتھ ساتھ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے پکڑ کر اسے الیکٹرک چیئر پر بٹھا دیا ہو اور وہ تیزی سے جھٹکے لینے لگا درد کی شدت سے اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں لیکن کوئی بھی اس کی مدد کے لئے کمرے میں نہیں آیا.....!!.....اور چند ہی منٹوں میں اس نے ایک زوردار سانس لیا اور دوسرے لمحے اس کی جان قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور دوسرے لمحے رات کے وقت دوسری جانب موجود چند افراد نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا اور کمرہ تالیوں کے شور سے گونج اٹھا.....ان کا تجربہ کامیاب ہو چکا تھا اور اب پوری دنیا پر حکمرانی کا خواب پورا ہونے جا رہا تھا اس نئی ایجاد کی بناء پر انہیں ان ممالک پر بھی فوقیت حاصل ہونے جا رہی تھی جو اس کی طرح ایک ایٹمی طاقت تھے لیکن اس ایجاد کی بدولت وہ اس کے غلاموں کی لسٹ میں شامل ہونے جا رہے تھے.....!!!

☆.....☆.....☆

اور آج اسی کامیاب اور بھیانک تجربہ کو لئے یہ عورت زنگ چاؤ اور وہ ادھیڑ عمر شخص وانگ فینگ چائنہ کے لئے روانہ ہو چکے تھے اور اس وقت کار میں بیٹھے ووہان کی جانب بڑھ رہے تھے۔ گاڑی میں گھمبیر خاموشی طاری تھی اور اس کی سپیڈ سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہوا میں اڑتی جا رہی ہو۔ چونکہ رات کے اس پہر اور سنسان ہونے کی وجہ سے ٹریفک سارجنٹ وغیرہ بھی ندارد تھے اس لئے کسی نے بھی اسے غیر معمولی سپیڈ کیساتھ سفر کرتے نوٹس نہیں کیا۔ جب وہ لیبارٹری کے نزدیک پہنچے تو اس وقت رات کے پونے دو بج چکے تھے چونکہ انہوں نے وہاں کے عملے کو پیشگی اطلاع دے دی تھی اس لئے انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے چند افراد پہلے سے موجود تھے۔ ان کی حیثیت ملک کے صدر جیسی ہوگئی تھی یہ ان کے استقبال کے لئے آنے والے بڑے افسران کے رکھ رکھاؤ سے ظاہر ہو رہا تھا.....!! یہ دیکھ کر ان دونوں نے بڑے نخوت بھرے میں انداز میں ان کے سلام کا جواب صرف اپنا سر ہلا کر دینا زیادہ مناسب سمجھا اور اور عورت نے ہاتھ میں پکڑے بریف کیس کو بڑی احتیاط سے لیبارٹری میں داخل ہو کر ایک ہال میں موجود شیشے کی ایک بڑی سی میز پر رکھ دیا ان دونوں کے پیچھے پیچھے وہ چند افراد بھی ہال میں داخل ہو کر ایک جانب کھڑے ہو گئے۔ پھر کچھ دیر تک وہ دونوں انہیں اپنی کامیابی کے متعلق بریفنگ دیتے رہے کہ کس طرح انہوں نے ایک بہت بڑا اور ناقابل یقین کارنامہ سرانجام دے دیا ہے اور یہ بھی کہ اس کا تجربہ اپنی زندہ آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ وہ لوگ پتھر کے بت بنے اور حیرت سے اپنے منہ کھولے ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے اور پھر ان کے خاموش ہوتے ہی جیسے غباروں سے ہوا نکلتی ہے ان لوگوں نے اپنے روکے سانسوں کو یکدم باہر نکال دیا۔ اور پھر اپنے لاشعور کے بیدار ہوتے ہی تمام کہانی ان کی سمجھ میں آتے ہی ان سب نے ایک

فلک شگاف نعرہ بلند کیا۔ لیبارٹری کی خاموش فضا میں جیسے ایک بھونچال آگیا ہو ظاہر ہے اپنے تئیں انہوں نے ایک ناقابل یقین حقیقت کو ثابت کرکے دکھادیا تھا۔ پھر ضروری کارروائی کے بعد انہوں نے خاموشی سے اس ایجاد کو ایک لاکر میں محفوظ کرکے مقفل کردیا اور کچھ دیر آپس میں گفتگو وشنید اور کچھ ہدایات دینے کے بعد وہ دونوں ایک طرف دکھائی دینے والے چھوٹے سے دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

☆.....☆.....☆

راحیل اپنی ڈیوٹی باقاعدگی سے سرانجام دینے میں مشغول تھا کہ ایک روز اسے ایک سائنسی میگزین میں کسی کا لکھا ہوا پیپر پڑھنے کو ملا جس میں مختلف اقسام کے وائرسز پر بڑی جامع تحقیقاتی رپورٹ لکھی گئی تھی جیسے جیسے وہ رپورٹ کا متن پڑھتا گیا ویسے ویسے اسے بھی ایک وائرس "فلووائرس" کے متعلق سپیشلائزیشن کرنے کا شوق پیدا ہونے لگا۔ رپورٹ کے مطابق اس وائرس سے کسی بھی جاندار کی موت واقع ہوسکتی تھی۔ لیکن سب سے حیرت انگیز بات یہ لکھی گئی تھی کہ جو بھی جاندار اس وائرس کا شکار بنے گا اس میں بظاہر واضح نشانیاں دکھائی نہیں دیتی تھیں لیکن دو تین ہفتوں میں ہی مریض دم توڑ دیتا تھا۔ بڑا ہی خوفناک قسم کا وائرس تھا۔ مزید یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اس وائرس کا ابھی تک کوئی توڑ تیار نہیں کیا جاسکا تھا اور نہ ہی ابھی تک کسی بھی سائنسدان نے کوئی ایسا تریاق تیار نہیں کیا تھا جو ایسے وائرس کے زہر کا اثر کم کرسکے۔ یہ بات پڑھ کر راحیل کسی سوچ میں گم ہوگیا اور پھر اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند اس کے دماغ میں لپکا کہ کیوں نہ وہ اس خوفناک اور بھیانک اہمیت کے حامل وائرس کا کوئی اینٹی تیار کرکے رہتی دنیا کے لئے کوئی کام کرسکے۔ لیکن جس ڈاکٹر کی لکھی گئی رپورٹ وہ پڑھ چکا تھا وہ بھی ایک نامور ڈاکٹر تھا جس نے دعویٰ کیا تھا کہ ابھی تک کوئی بھی اس وائرس کے اثر کو ختم کرنے والی دوا تیار نہیں کرپایا تھا۔ لیکن اس کے باوجود راحیل کو اپنے اللہ پر پورا یقین تھا۔ پھر اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ ضرور اس کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس موذی وائرس کے توڑ کے لئے کوئی دوا تیار کرلے گا۔ یہ سوچ کر اس نے اطمینان کی گہری سانس لی اور میگزین ایک جانب رکھ کر لائٹ بند کی اور کچھ دیر بعد کمرے میں اس کے خراٹے گونج رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

راحیل نے یہ فیصلہ اپنے امی ابو کو بھی فون کرکے بتادیا پہلے انہوں نے صاف انکار کردیا کہ اب باؤس جاب مکمل کرتے ہی وہ واپس اپنے گھر لوٹے لیکن راحیل نے جب انہیں تمام حقیقت سے آگاہ کیا تو کسی قدر مان گئے۔ راحیل کو اجازت ملتے ہی اس نے تمام معلومات اکٹھی کرکے ایک نامور سائنسدان سے رابطہ کیا اور اسے اپنے کام کے متعلق بتایا۔ تھوڑی سی گفتگو اور باہم معلومات کا تبادلہ کرنے کے بعد بالآخر اسے ایک گائیڈ لائن مل گئی اس نے اس سائنسدان کی تمام باتیں بڑے غور سے سنیں.....اور اس سے اجازت ملنے کے بعد اس پر اپنے کام کا آغاز کردیا۔ وہ ڈیوٹی سے واپس آکر اپنے پروجیکٹ پر کام شروع کردیتا اور رات کے تقریباً دو ڈھائی بجے تک مسلسل کام کرتا رہتا۔ اب چونکہ اس نے ایک علیحدہ فلیٹ لے لیا تھا اس لئے بغیر کسی روکاوٹ کے اسے کام کرتے دیکھ کر کسی کے آنے کا تصور ہی نہیں تھا.....صرف ایک نوکر تھا جو اس کے لئے کھانا وغیرہ پکادیتا اور گھر کی صفائی وغیرہ کردیتا تھا۔

مسلسل نو ماہ گھر میں بنائی گئی چھوٹی سی تجربہ گاہ میں اسے کام کرتے ہوگئے تھے۔ وہ ستر فیصد اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تھا اور اس دوران اسے اس سائنسدان کی مکمل راہنمائی ملتی رہی تھی۔ اس عرصے میں وہ اس کی قابلیت اور اخلاق سے بہت متاثر ہوا تھا اس لئے اس نے بھی راحیل کی ہر ممکن مدد کی تھی اور کوئی بھی اپنی پیشہ ورانہ بات اس سے نہیں چھپائی تھی۔ اب تک کے کام کے مطابق راحیل اپنی ایجاد کردہ دوا سے فلو وائرس سے متاثرہ مریض کی زندگی تو نہیں بچاسکتا تھا

لیکن اس کے اثرات کو کسی قدر کم کرنے میں مدد ضرور دے سکتا تھا۔اس کے مطابق ایسے مریض پر استعمال کرنے پر اگر مریض دو ہفتوں میں سسک سسک کر مرجاتا تھا تو اس دوا کے استعمال سے ایک تو اسے تکلیف میں کچھ کمی محسوس ہوتی تھی اور دوسرے اس کی قوت مدافعت کو بہت تقویت ملتی تھی۔لیکن راحیل ابھی مایوس نہیں ہوا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کی ایجاد کردہ دوا سے متاثرہ مریض مکمل صحت یاب ہوں تاکہ وہ دوبارہ اپنی نارمل زندگی گزار سکیں۔وہ ایک عام مقولہ ہے کہ ہمت مرداں مدد خدا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کبھی کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔راحیل کی دن رات کی محنت اور اپنے کام سے لگن کو دیکھتے ہوئے اسپتال میں اسے ایک بہت بڑے عہدے سے نواز دیا گیا اور اب راحیل کو اپنے فلو وائرس والے پروجیکٹ پر کام کرنے کے لئے ایک وسیع پلیٹ فارم مل گیا، معاشی طور پر بھی اسے کافی سپورٹ مل گئی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی سیٹ پر رہتے ہوئے اس نے مزید سائنسدانوں سے روابط تیز کردیئے۔جیسے جیسے وہ اپنے وائرس والے موضوع پر گفتگو شنید کرتا ویسے ویسے اس کا جوش بڑھتا جاتا کیونکہ باہم گفتگو کرنے اور معلومات شیئر کرنے کی وجہ سے اسے مزید راہنمائی ملنے لگی۔ایک روز لیبارٹری میں کام کرتے ہوئے اسے تقریباً چار گھنٹوں سے زائد گزر چکے تھے اور اس دوران اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے بہت بڑی خوشخبری یا کامیابی ملنے والی ہے.....اس کے مطابق اس کا پروجیکٹ پچاسی فیصد کامیابی کے زینے پر پہنچ گیا تھا اور اب صرف پندرہ فیصد اس کی منزل دور تھی۔اس بات کو لے کر اس کی بھوک پیاس سب اڑ چکی تھی۔رات کے تقریباً دو بج چکے تھے چونکہ صبح اس کا آف تھا اس لئے بھی آج اس نے کافی وقت لیبارٹری میں ہی گزارا تھا.....کچھ دیر بعد اسے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی تھی جو اس کے چہرے سے صاف عیاں تھی۔اس نے گھڑی پر وقت دیکھا تو ڈھائی بج چکے تھے اس نے باقی کام کل کے لئے چھوڑا اور تمام بکھرا سامان سمیٹ کر ترتیب سے رکھا اور لیبارٹری سے نکل کر اسے تالا لگایا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔لیبارٹری چونکہ اس نے گھر میں ہی بنا رکھی تھی اس لئے اسے گھر پہنچنے کی بھی فکر نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

زنگ چاؤ اور وانگ فینگ بڑے نخوت بھرے انداز میں ایک بڑی سی کانفرنس میز کے سامنے بیٹھے تھے ان دونوں کے بیٹھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی بہت بڑی سلطنت کے ولی عہد ہوں۔میز کے اردگرد تقریباً بارہ افراد اور بھی بیٹھے تھے جنہوں نے کالے رنگ کے سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے اور سب نے سیاہ سوٹوں پر بلیو ٹائی لگائی ہوئی تھی .....ان سب کے چہروں پر ایسے منحوست چھائی ہوئی تھی جیسے وہ ابھی ابھی کسی کو دفنا کر آئے ہوں۔کمرے میں خاموشی تھی حتیٰ کہ ہلکی سی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ابھی انہیں بیٹھے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ دائیں جانب کا دروازہ خودکار طریقے سے کھلا اور ایک انتہائی مسخرے چہرے کا شخص اندر داخل ہوا جس نے بڑا مضحکہ خیز قسم کا لباس پہنا ہوا تھا.....اس کے جسم پر زرد رنگ کا سوٹ تھا جس پر کالے رنگ کی ٹائی لگی ہوئی تھی اور اس کے جوتوں کا رنگ سرخ تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں ایک سفید رومال تھا۔سر پر پائیڈ پائپر کی طرح کی ٹوپی تھی۔سمجھ سے باہر تھا کہ اتنی سنجیدہ قسم کی میٹنگ میں یہ جوکر کیسے آگیا.....؟ لیکن اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ان سب کے چہرے یوں ہوگئے جیسے سب کی ماں مرگئی ہو۔وہ سب یوں مؤدب ہوکر بیٹھ گئے جیسے کلاس میں استاد کو آتا دیکھ کر تمام بچے بیٹھ جاتے ہیں۔صدارت کی کرسی پر بیٹھتے ہی اس جوکر نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر اس کی گھومتی ہوئی نظریں زنگ چاؤ اور وانگ فینگ دونوں پر آکر ٹک گئیں۔اور انہیں دیکھتے ہی جیسے اس کے مسخرے چہرے پر ایک انتہائی پروقار قسم کی مسکراہٹ آگئی اس نے ان دونوں کو دیکھ کر اپنا سر ہلایا اور مخاطب ہوا....."ہیلو.....ڈیجورس آپ کو اس ایمرجنسی میٹنگ

میں خوش آمدید کہتا ہے اور یہ کارنامہ جو آپ لوگوں نے سرانجام دیا ہے اس کی قدر کرتے ہوئے آپ دونوں کے جو چھ بلین روپے اپروو ہوئے ہیں وہ ٹوکن منی کے طور پر آپ دونوں کے بنک اکاؤنٹس میں منتقل کرنے کے احکامات جاری کردیئے گئے ہیں۔ بہت جلد یہ رقم آپ دونوں کے اکاؤنٹس میں ڈیپازٹ ہوجائے گی "۔ڈیجورس نے بات کا آغاز کرتے ہوئے ان دونوں کو مخاطب کیا۔لیکن جس طرح اس نے یہ تمام گفتگو کی اس سے ایک فیصد بھی نہیں لگتا تھا کہ یہ شخص جو چہرے مہرے یا لباس سے ایک جوکر لگ رہا تھا اس طرح کی سنجیدہ گفتگو بھی کرسکتا ہے۔اس کی بات ختم ہوتے ہی ان دونوں کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے اور انہوں نے بھی جواب میں ڈیجورس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کردیا۔اس کے ساتھ ہی دیگر لوگوں کے مرے ہوئے چہروں کی وجہ سمجھ آگئی کیونکہ ہر میٹنگ کی طرح اس میٹنگ میں یہ بات آشکار ہوگئی تھی کہ ان دونوں کو ایک بہت بڑی رقم سے نوازا جائے گا اسی لئے ان سب کے چہروں پر جلن اور حسد کے آثار چھائے ہوئے تھے۔لیکن ہر ایسے موقعہ پر ان لوگوں نے بھی منافقت کے ساتھ ان دونوں کو ان کی کامیابی اور انعام کے لئے مبارکباد دے دی۔پھر اسی طرح کی مختصر گفتگو کرنے کے بعد وہ لوگ اپنے اصل مقصد پر آگئے اور اس موقعہ پر وہ سب آپس میں سر جوڑ کر بیٹھے جو پلاننگ کرنے لگے اسے اگر شیطان بھی سن لیتا تو شاید ایک لمحے کے لئے خوف سے جھرجھری لے لیتا۔لیکن وہ لوگ تو اس طرح اس بھیانک منصوبے پر بات چیت کررہے تھے جیسے یہ سب ان کا روز کا معمول ہو۔ان کے منصوبے کے مطابق وہ چائنہ کے ایک شہر ووہان میں ایک ایسا وائرس پھیلانا چاہتے تھے جس کی وجہ سے وہ بغیر ہتھیار کے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔ اس سے چونکہ یہ اموات ایک بیماری کی وجہ سے واقع ہوتیں اس لئے کوئی کسی پر شک بھی نہیں کرسکتا تھا۔جو وائرس زنگ چاؤ اور وانگ فینگ اپنے ساتھ لائے تھے وہ اس کو اس شہر میں پھیلا دینا چاہتے تھے۔اس کے لئے انہوں نے وقت اور دن مقرر کیا اور پھر کچھ دیر تک اپنے بھیانک منصوبے کو عملی جامعہ پہنانے کے لئے وہیں موجود دیگر افراد کو کام کا طریقہ کار سمجھایا اور میٹنگ برخواست کرکے وہی مسخرہ شخص دوبارہ اپنے چہرے پر ازلی حماقت سجائے جس دروازے سے آیا تھا واپس اسی میں داخل ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

راحیل کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا.....آج کی رات اس کی زندگی کی سب سے اہم رات تھی سرشام ہی وہ کھانا وغیرہ کھا کر اپنی لیبارٹری میں آگیا تھا اور گھر کے ملازم کو سختی سے منع کردیا تھا کہ کسی قسم کا فون یا ملنے جلنے والے کو اس کی غیر موجودگی کا ہی بتائے اور اسے بالکل بھی مداخلت پسند نہ ہوگی۔یہ ہدایات دیکر وہ شام سے ہی لیبارٹری میں گھسا ہوا اپنے پروجیکٹ کو فائنل شکل دینے میں لگا ہوا تھا.....رات دھیرے دھیرے اپنی منزل کی جانب گامزن تھی۔رات کا سناٹا ہونے کی وجہ سے بہت خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔رات کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے اسے مسلسل کام کرتے ہوئے چار گھنٹے گزر چکے تھے۔جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ویسے ویسے اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہوتا جارہا تھا.....اور پھر یکدم وہ لیبارٹری میں باقاعدہ ناچنے لگا اسے یقین ہی نہیں ہورہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تھا اس نے اپنے پروجیکٹ کو بالآخر مکمل کرلیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے بھی اسے کامیابی سے ہمکنار کردیا تھا۔وہ ایک ایسی دوا ایجاد کرچکا تھا جس سے کسی بھی قسم کا وائرس کسی جاندار کی جان نہیں لے سکے گا۔اس کا تجربہ وہ اپنی لیبارٹری میں موجود ایک چھوٹے سے جانور پر جسے وہ ایک وائرس سے متاثر کرچکا تھا اس پر آزمانا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لئے آج اسی جانور کو بڑے آرام سے بیٹھا دیکھ کر اسے بہت اطمینان ہوچکا تھا۔کیونکہ وہ اپنے روزانہ کے تجربہ کو اسی پر ہی آزما کر دیکھتا رہا تھا اور آج اس کو اس دوا کی ڈوز دیئے پندرہ دن ہوچکے تھے اور اس دوران وہ

اس کی حرکات بہت غور سے دیکھتا رہا تھا جس میں اسے دن بہ دن بہتری ہی دکھائی دے رہی تھی لیکن وہ اپنی ایجاد کردہ دوا کا نتیجہ دیکھنے کے لئے آخری حد تک جانا چاہتا تھا اور آج جب اس نے دیکھا کہ وہ جانور بالکل چنگا بھلا دکھائی دے رہا تھا اور پنجرے میں بڑی پھرتی سے ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا اسے یقین ہوگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ایجاد کردہ دوا کو کامیابی سے ہمکنار کردیا تھا۔ وہ لیبارٹری میں ہی جائے نماز بچھا کر سجدہ ریز ہوگیا اور خوشی کے آنسوؤں سے اپنے رب کا شکر بجالانے لگا۔ اس نے اپنی اس دوا کو ابھی خفیہ ہی رکھنا بہتر سمجھا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کسی ملک میں کوئی اچھا اور انسانیت کے لئے فائدہ مند کام شروع کیا جاتا ہے تو اس کے موجد کو دنیا کی نظروں سے غائب کردیا جاتا ہے۔ کیونکہ طاغوتی اور دجالی قوتیں سب انسان دشمن ہیں وہ بھلا انسانیت کا بھلا کیوں چاہیں گی.....؟ اس لئے راحیل کو بھی اس بات کی فکر تھی کہ کہیں اس کی ایجاد کردہ دوا کو دیکھ کر کوئی اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ اسی لئے اس نے اپنی اس کامیابی کو اپنے گھر کے ملازم حتیٰ کہ پاکستان میں موجود اپنے والدین کو بھی فون پر بتانے سے گریز کیا ایسا وہ صرف حفظ ماتقدم کے طور پر کر رہا تھا۔ کافی دیر تک مصلے پر بیٹھے رہنے کے بعد اس نے تمام سامان سمیٹا اور لیبارٹری کو تالا لگا کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

زنگ چاؤ اور وانگ فینگ کا ایجاد کردہ وائرس ووہان شہر میں ایک مذموم طریقے سے پھیلا دیا گیا تھا اس کے لئے انہوں نے اس شہر میں گھوم پھر کر ایسے گھر تلاش کئے تھے جن میں موجود بزرگوں سے ان کے اپنے تنگ اور بیزار تھے اس کے لئے انہوں نے ان کے گھر کے افراد کو بڑی بڑی رقمیں دے کر ان بزرگوں پر وہ وائرس چھوڑ دیا تھا۔ اس وائرس کا خاصہ یہ تھا کہ اس کا اثر ڈینگی کی طرح آہستہ آہستہ جسمانی طور پر ختم کرتا تھا۔ اور اس کا مکمل اثر پندرہ روز کے بعد نمودار ہونا شروع ہوجاتا تھا۔ ان بزرگوں کو ہمدردی دکھا کر ان کے گھر والوں سے ایک ایسی جگہ رکھا گیا تھا جہاں انہیں کھانے پینے اور آزادانہ زندگی گزارنے کا جھانسہ دیکر لایا گیا تھا۔ وہ تمام بزرگ چونکہ خود اپنے گھر والوں سے تنگ تھے اس لئے بڑی خوشی سے ان لوگوں کے ساتھ ان کے بنائے ہوئے فارم ہاؤسز میں آکر رہنے لگے تھے۔ ان سب کو ایک ہی وقت میں اس وائرس کا شکار بنایا گیا تھا وہ یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ کتنی عمر والے بزرگ پر کتنی دیر میں اس وائرس کا اثر ہوتا ہے.....!!! ان سب کو ان کی تفریح کے لئے ہر قسم کا سامان دیا گیا تھا اور وہ سب وہاں موج مستی میں موجود تھے.....لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ایک انتہائی دردناک قسم کا عذاب اور خونی عفریت ان کی گھات لگائے بیٹھا ہے۔ ان کی حرکات وسکنات کو روزانہ کی بنیاد پر جانچا جارہا تھا اور اب ان میں سے کچھ بزرگ جو قدرے زیادہ عمر کے تھے ان پر نقاہت اور سستی طاری ہوتی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ جب انہیں کھانسی کا دورہ پڑتا تو چاروں طرف ان کے کھانسنے کی

زہر

شوہر، بیوی سے فون پر:

آج کیا پکایا ہے۔

بیوی غصہ سے:

زہر۔

شوہر: تم کھا کر سو جانا۔ میں آج دیر سے گھر آؤں گا۔

(بلال۔ کراچی)

آوازوں کی گونج سنائی دیتیں..... لیکن ان کے علاج وغیرہ کے لئے کوئی بھی ان کی مدد کو نہ پہنچتا..... وہ تکلیف سے چیختے رہتے تھے لیکن ان کی پکار کسی کو سنائی نہ دیتی بلکہ اب تو ایک کمرے میں خاموشی سے کھانا لگا کر ایک سپیکر کے ذریعے انہیں کھانا کھانے کے لئے کہا جاتا تھا اور کوئی بھی ان کے سامنے نہیں آتا تھا۔ بارہویں دن ان بزرگوں میں سے دو اچانک یوں زمین پر گر کر تڑپنے لگے جیسے کسی نے مچھلی کو پانی میں سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا ہو.....!!..... ان کے دیگر ساتھیوں نے انہیں سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کا جسم ان کے قابو میں نہیں آرہا تھا..... چند ایک نے چیخ چیخ کر کسی کو بلانے کی کوشش کی لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہاں ان کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ ہر طرف ایک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان سب کی نظروں کے سامنے وہ تڑپتے ہوئے بزرگ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے..... وہ سب ہکا بکا ان کی لاشوں کو دیکھتے رہ گئے۔ جو دس بارہ روز پہلے ان کے ساتھ تھے اب لاشوں کی ڈھیر کی صورت میں ان کے سامنے پڑے تھے۔ سب سے حیرت ناک بات تو یہ تھی کہ ان کی لاشوں کو اٹھانے تک کے لئے کوئی نہیں آیا بس کھانے کی اطلاع انہیں اسپیکر پر مل جاتی تھی اور پھر ایک گھمبیر خاموشی چھا جاتی۔ لاشوں کے گلنے سڑنے سے بہت تعفن پھیل چکا تھا وہ سب ایک اور کمرے میں داخل ہوگئے اور دروازہ اچھی طرح بند کر دینے کے باوجود لاشوں کی بدبو اور سڑاند سے ان کی حالت بھی غیر ہونے لگی اور پھر ایک دو روز میں ان میں سے صرف دو افراد کچھ بہتری محسوس کر رہے تھے لیکن زیادہ تر اسی حالت کو پہنچ چکے تھے۔ بڑی عجیب اور پریشان کن صورتحال پیدا ہو چکی تھی۔ باقی بچ جانے والے دونوں افراد کو بھی اپنے سانس اکھڑتے محسوس ہونے لگے لیکن ان کی چیخ و پکار کو سننے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ تھک ہار کر انہوں نے چپ سادھ لی اور اپنی موت کا انتظار کرنے لگے۔ انہیں محسوس ہو چکا تھا کہ کسی نے جان بوجھ کر انہیں اس مصیبت کا شکار بنایا ہے لیکن اس کے پیچھے ان کا کیا مقصد ہے یا تھا.....؟ اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ رات ہوتے ہی اسی طرح انہیں سپیکر پر کھانا کھانے کے لئے ہال میں موجود ٹیبل کا کہا گیا جہاں ان کے لئے کھانا رکھا جا چکا تھا۔ مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق وہ دونوں تقریباً پاؤں گھسیٹنے کے انداز میں کھانے والے کمرے کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ ظاہر ہے جب تک جسم میں جان باقی ہے کھانا کھانے کے لئے انہیں اپنے پیٹ کی آگ تو لازمی طور پر بجھانا تھی..... کمرے میں داخل ہوتے ہی ان دونوں کی حیرت سے آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ جی ہاں.....!!..... کیونکہ سامنے ٹیبل پر صرف دو افراد کے لئے کھانا چنا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان تمام یعنی پندرہ افراد میں سے صرف وہ دو ہی بچے تھے اور اس سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں کھانا پہنچانے والے ان کے دیگر ساتھیوں کی اموات کے متعلق بخوبی جانتے تھے اور جان بوجھ کر ان کی لاشیں اٹھانے نہیں آئے تھے۔ اب تو انہیں پورا یقین ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی خوفناک کھیل کھیلا گیا ہے.....!!..... وہ اب اس وقت کو پچھتا رہے تھے کہ جب یہ لوگ انہیں ان کے بچوں کے گھروں سے اپنے ساتھ لائے تھے اس سے تو اچھا یہی تھا کہ وہ وہیں رہتے کم از کم اس ازیت ناک موت سے تو بچ جاتے۔ لیکن اب کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اب تو جیسے تیسے انہیں ان حالات کا مقابلہ کرنا ہی تھا لیکن یہ ان دونوں کی خام خیالی تھی کیونکہ موت کا فرشتہ ان کی تاک میں تھا اور کسی بھی روز وہ دونوں بھی عنقریب اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح لاشوں میں تبدیل ہو کر اسی کمرے میں پہلے سے پھیلے ہوئے تعفن میں اضافے کا سبب بنتے۔ یہ سوچ کر انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی کسی نہ کسی طرح کھانا کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھائی۔ اور اسی طرح قدم گھسیٹتے ہوئے اپنے اس کمرے کی جانب بڑھنے لگے جہاں ان کے سونے کے لئے بستر موجود تھے۔

☆.....☆.....☆

دوسری صبح کا سورج ان دونوں بزرگوں کے لئے ایک خوشی کی نوید لیکر ابھرا۔ کیونکہ جب ان دونوں کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک ایسے کمرے میں موجود تھے جس کے سامنے والا دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر لان کا منظر صاف نظر آرہا تھا وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے جب لان میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ باہر کے بڑے گیٹ میں موجود چھوٹا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا انہوں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو وہاں کوئی موجود نہ تھا انہوں نے ایکدوسرے کی جانب دیکھا اور جیسے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ محتاط انداز میں قدم اٹھاتے اس کھلے ہوئے چھوٹے دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔ جلد ہی وہ اس کے نزدیک پہنچ کر رکے اور پھر اپنا سر باہر نکال کر دیکھا تو باہر کسی کو موجود نہ پا کر باہر نکل گئے۔ باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی کوئی گاڑی یا شخص دکھائی نہ دے رہا تھا..... سڑک کے دونوں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا انہوں نے اندازے سے ایک جانب بڑھنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ اس گیٹ سے دور ہونے لگے تقریباً بیس پچیس منٹ تک مسلسل چلنے کے بعد انہیں تھکن محسوس ہونے لگی وہ تھک کر ایک سائیڈ پر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ آخر انہیں چھوڑ کیسے دیا گیا.....!! لیکن انہیں اس بات کی بہت خوشی تھی کہ وہ اس موت گھر سے بچ نکلے تھے اور اب وہ یہی بات سوچ رہے تھے کہ اب انہیں واپس گھروں کو جانا چاہیے یا کہیں اور.....!!..... ابھی انہیں وہاں بیٹھے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی قریب آنے پر دیکھا کہ وہ ایک کار تھی جسے ایک نوجوان عورت چلائی رہی تھی۔ اس عورت نے قریب آتے ہی ان کے نزدیک کار روک دی اور ان سے کچھ پوچھنے لگی جواب میں انہوں نے مختصر سا بتایا کہ وہ اپنے گھر کا پتہ بھول گئے ہیں اور کچھ یاد نہیں آرہا ہے کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس عورت نے انہیں کار میں بیٹھنے کے لئے کہا اور پھر انہیں ایک بارونق علاقے میں موجود ایک فلاحی ادارے کی بلڈنگ کے سامنے اتار کر چلی گئی۔ وہ دونوں اس کا شکریہ ادا کر کے سامنے موجود ایک دوکان میں داخل ہوگئے جہاں بتانے پر انہیں اس فلاحی ادارے کے دفتر پہنچا دیا گیا۔ اس تمام عرصے میں ان دونوں کی طبیعت میں یہ تبدیلی آچکی تھی کہ وہ وقفے وقفے سے کھانسنے لگے تھے اور ان کا سانس بھی ٹھیک طور پر نہیں آرہا تھا۔ یہ دیکھ کر دفتر کے سٹاف نے انہیں ایک طرف رکھے صوفہ پر بٹھا دیا اور انہیں پانی وغیرہ پلایا اور ان کے لئے کھانا وغیرہ منگوا کر دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ان سے تفصیلات پوچھی گئیں جو انہوں نے مختصر بتائیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ان کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ یہ سن کر انہیں ایک اولڈ ہاؤس میں پہنچا دیا گیا۔ وقت گزرتا چلا گیا اور پھر فلاحی ادارے کے چند افراد کی حالت بھی غیر ہونے لگی انہیں بھی کھانسی اور سانس کی تکلیف ہونے لگی ان کے دیکھتے ہی دیکھتے چند دنوں میں تقریباً پورا آفس سٹاف اس مرض کا شکار ہوگیا۔ میڈیکل رپورٹس کے مطابق یہ ایک انتہائی خطرناک وائرس تھا جسے "کرونا" کا نام دیا گیا تھا اور یہ کہ اس کا اینٹی ابھی تک دستیاب نہیں تھا۔ اسپتال میں اس کا علاج کرنے کی بھرپور کوششیں کی گئیں لیکن چند ہی روز میں وہ سب تڑپ تڑپ کر موت کو گلے لگا چکے تھے۔ اسپتال کی انتظامیہ بہت حیران اور پریشان تھی کہ آخر یہ کیسا وائرس ہے جس کی ابھی تک کوئی دوا نہیں بنائی جا سکی تھی۔ انہوں نے اپنے طور پر بہت سے ملکوں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے بھی آن لائن روابط کئے لیکن کہیں سے بھی کوئی مثبت جواب موصول نہ ہو سکا۔ تھک ہار کر وہ کسی معجزے کا انتظار کرنے لگے۔ سب سے حیرت ناک اور پریشان کن یہ بات تھی کہ آفس سٹاف کے تمام خاندان کے افراد بھی اس موذی مرض کا شکار بن چکے تھے اور وقفے وقفے سے وہ سب موت کا شکار بنتے جا رہے تھے۔ لیکن میڈیکل سائنس بے بسی سے انہیں مرتا دیکھتی رہی۔

☆.....☆.....☆

کل کا سورج راحیل کے لئے ایک بہت بڑی

خبر لیکر طلوع ہوا۔صبح کی اخبار میں شہہ سرخی کے ساتھ یہ خبر چھپی تھی کہ شہر ووہان میں بہت سے خاندان ایک بہت ہی خطرناک وائرس کا شکار ہوکر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور یہ کہ اس وائرس کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا ہے۔ڈاکٹر بہت پریشان ہیں اور کسی معجزے کا انتظار کررہے ہیں.....!!.....لیکن اس ساری خبر میں یہ بات بہت اہم تھی کہ تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ یہ وائرس کھانسنے اور نزلہ کی کیفیت سے پھیلتا ہے اور اس کے لئے اس بیماری سے متاثرہ شخص کے سامنے جاتے وقت چہرے پر ماسک کا استعمال لازمی کرنے سے کسی قدر اس کے اثرات سے بچا جاسکتا ہے۔خبر بہت بڑی تھی اور اس کے پیشے سے تعلق رکھتی تھی اس لئے اس نے اس کا کھوج لگانے کا فیصلہ کیا اور جلدی جلدی ناشتہ کرکے اور تیار ہوکر اسپتال کی جانب بڑھ گیا۔اسپتال پہنچ کر اس نے اخبار میں دیئے گئے پتہ پر معلوم کرکے ان کے بچ جانے والے افراد سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا اور پھر دو تین گھنٹوں بعد وہ اس خاندان کے بچ جانے والے ایک دو افراد کے سامنے اپنے چہرے پر ماسک لگائے موجود تھا۔پھر ان سے مرنے والے افراد کے متعلق کچھ تفصیلات پوچھیں اور انہیں کل صبح اپنے اسپتال پہنچنے کے لئے کہا اس نے اپنے خدشے کے پیش نظر انہیں آگاہ کرتے ہوئے بتادیا تھا کہ وہ ان دونوں کا ٹیسٹ کرنا چاہتا ہے جس پر وہ دونوں آمادہ ہوگئے تھے اور اس سے وعدہ کیا وہ کل صبح دس بجے تک اس کے اسپتال پہنچ جائیں گے۔راحیل کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ان سے اجازت لیکر اپنے گھر واپس لوٹ گیا۔وہ اس نقطے پر سوچ رہا تھا کہ قدرت نے اس کے ایجاد کئے ہوئے اینٹی وائرس کو اس وقت ایک نئے تجربے سے روشناس کروانے کا ایک موقع فراہم کردیا ہے۔چونکہ اس وقت اس موذی وائرس کا کوئی علاج موجود نہیں ہے اور یہ کہ اگر یہ دونوں افراد اس وائرس سے متاثرہ ہوئے تو وہ ان کا علاج کرکے وائرس کے توڑ کو آزما کر اس دنیا میں ایک تہلکہ مچا سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

ووہان شہر میں پریشانی کی لہر دوڑ گئی تھی ہر گھر میں ایک آدھ مریض اسی موذی وائرس کا شکار بن چکا تھا۔زیادہ تر افراد ان میں وہ تھے جو پچاس سال سے زیادہ عمر کے لگ بھگ تھے جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے۔شہر کے اسپتالوں میں چیخ وپکار مچ گئی تھی یوں لگتا تھا جیسے شہر کا ہر بڑی عمر کا شخص اس موذی وائرس کا شکار ہوچکا ہے۔اسپتالوں میں افراتفری پھیل گئی تھی ڈاکٹر اور نرسیں ادھر ادھر بھاگ پھر رہی تھیں۔لوگوں نے اپنے چہروں پر ماسک چڑھالئے تھے۔پورے شہر میں ہر شخص اپنے چہرے کو ڈھانپے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ڈاکٹروں نے بھی حفاظت کے طور پر اپنے چہروں کو ماسک سے ڈھانپ رکھا تھا۔مریضوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ ایک ایک بیڈ پر دو دو مریض لٹائے ہوئے تھے۔بیڈ کم پڑ گئے تھے غرض پورے شہر میں ایک ہنگامی صورتحال پیدا ہوچکی تھی۔یوں لگتا تھا جیسے اس سے پہلے مرنے والے اس وائرس سے متاثرہ لوگوں کی وجہ سے یہ وائرس شہر بھر میں پھیل گیا تھا اور دوسرے لوگوں کو بھی یہ مرض لگ چکا تھا۔جب تک لوگ اپنی حفاظت کے لئے کوئی تدبیر کرتے یہ وائرس ان پر حملہ کرچکا تھا۔اور چونکہ اس کی ابھی تک کوئی دوا ایجاد نہیں ہوئی تھی اس لئے ڈاکٹر صرف اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے ادھر ادھر بھاگ دوڑ میں مصروف تھے ورنہ وہ بے بسی سے اپنے ہونٹ بھینچے ایک دوسرے کو بیچارگی سے دیکھتے رہتے تھے اور لوگ مکھیوں کی طرح تڑپ تڑپ کر اپنی جان سے ہاتھ دھوتے جارہے تھے۔کچھ ہی دنوں میں یہ وباء اس قدر پھیل گئی کہ ہر گھر کا فرد اس کا بری طرح سے شکار ہونے لگا۔پرنٹ میڈیا اور ٹی وی چینل والوں نے آسمان سر پر اٹھالیا اور یہ خبر ووہان سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل گئی۔راحیل کے والدین نے جب ٹی وی پر یہ خبر سنی تو انہوں نے فوراً راحیل کو پاکستان پہنچنے کے لئے کہا۔لیکن راحیل کے سمجھانے پر کہ وہ بالکل خیریت سے ہے اور یہ کہ وہ ابھی پاکستان واپس نہیں آسکتا کیونکہ

اسپتال میں اس کی ڈیوٹی مزید سخت ہوگئی تھی۔ لیکن اس کی امی نے اسے اپنی قسم دیکر گھر پہنچنے کے لئے زور دیا۔ راحیل اس کے اس اصرار پر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اوراس کی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھیں کہ وہ اس مصیبت کی گھڑی میں یہاں سے بھاگ جائے۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے اس بات کا فیصلہ کسی اور دن کے لئے چھوڑا اور اطمینان سے اپنی ڈیوٹی کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

راحیل کے اسپتال میں بھی ایمرجینسی نافذ ہوچکی تھی اور دھڑا دھڑ مریض وہاں لائے جانے لگے۔ راحیل کو انتظامیہ کی طرف سے فوراً اطلاع دیکر اسپتال بلالیا گیا تھا اور اس وقت وہ لیبارٹری میں ایک مریض کے ٹیسٹ کے ساتھ موجود تھا رپورٹس اس کے ہاتھ میں تھیں اور وہ ایک گھمبیر سوچ میں مبتلا تھا۔ اس نے فوری طور پر اپنی اینٹی وائرس دوا کا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ سوچ کر اس نے لیبارٹری سے نکل کر سیدھا اپنے گھر کا رخ کیا جلد ہی وہ اپنے گھر کی لیبارٹری میں موجود تھا اور ایک بیگ میں اس نے وہ دوا رکھ لی تھی۔ جو نارنجی رنگ کی ٹیوبس میں موجود تھی۔ اس نے احتیاط سے وہ بیگ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیا اور تیزی سے گاڑی بھگاتا اسپتال پہنچ گیا۔ بیگ اپنے آفس میں رکھ کر اس نے دو تین ٹیوبس نکال کر بیگ بند کیا اور ایک بڑے سے کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں بہت سے مریض شور وغل مچانے میں مصروف تھے ہر کوئی تکلیف سے بری طرح تڑپ رہا تھا۔ راحیل کے لئے یہ فیصلہ بہت مشکل ہوگیا تھا کہ وہ پہلے کس پر اس دوا کا استعمال کرے۔ کیونکہ سب کے سب تکلیف میں مبتلا تھے پھر اس نے کمرے میں ایک طائرانہ نظر ڈالی اور ایک ایسے بیڈ کی طرف بڑھ گیا جس پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص لیٹا زور زور سے کھانسنے میں مصروف تھا اور اس کے نزدیک ایک چھوٹا بچہ جس کی عمر تقریباً دس پندرہ سال کے قریب ہوگی موجود تھا۔ شاید اسپتال کی انتظامیہ نے اسے بھی ماسک فراہم کردیا تھا اسی لئے اس کے چہرے پر ماسک موجود تھا یہ دیکھ کر راحیل نے اطمینان کا ایک سانس لیا اور اس بوڑھے کے نزدیک پہنچ کر ایک انجکشن اسے لگادیا۔ اس کے لئے راحیل کو بڑی مشکل سے اسے انجکشن لگانا پڑا کیونکہ وہ شخص مسلسل کھانس رہا تھا اور اس حالت میں انجکشن لگانا بہت مشکل تھا، اسے انجکشن لگا کر راحیل دوسرے بیڈ کی جانب بڑھ گیا اسی طرح اس نے ایک ہی وقت میں تقریباً سات افراد کو انجکشن لگادیئے۔ اب وہ دوسرے روز ان کے دوبارہ ٹیسٹ کرواکر دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اس کے لگائے ہوئے انجکشن کا کیا اثر ہوا ہے.....؟.....اپنی ڈیوٹی پوری کرکے وہ واپس گھر آگیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر اور لیبارٹری میں موجود دیگر کام نبٹا کر وہ واپس اپنے کمرے میں آکر اس وقت بیڈ پر موجود تھا۔ پھر ایک کتاب کا مطالعہ کرتے کرتے اسے نیند نے آدبوچا اور وہ لائٹ آف کئے بغیر ہی نیند کی وادیوں میں کھوگیا۔

☆.....☆.....☆

یہ ایک بہت بڑا صحرا تھا دور دور تک ریت ہی ریت تھی۔ آسمان لگتا تھا حقیقت میں سوا نیزے پر آگیا تھا۔ ایسے میں راحیل نے خود کو وہاں موجود پایا وہ دور دور تک اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن سوائے ٹیلوں کے اسے وہاں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ابھی اسے وہاں کھڑے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ جیسے دور ریت کا ایک طوفان اٹھتا دکھائی دیا یوں لگتا تھا جیسے کسی نے ایک بہت بڑا پنکھا لگا کر ریت اڑادی ہو۔ پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے یکدم ریت کے بادل چھٹ گئے اور سامنے بہت سے افراد کھڑے نظر آنے لگے۔ راحیل اپنی آنکھیں مل مل کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ کچھ دیر پہلے وہاں سوائے ریت کے ٹیلوں کے کچھ نہیں تھا اور اب وہاں بہت سے افراد کھڑے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ چونکہ فاصلہ کافی تھا لیکن اس کے باوجود اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ افراد اس سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر ہوں۔ یہ دیکھ کر وہ

قدم اٹھاتا ان کی جانب بڑھنے لگا جیسے جیسے وہ ان کے نزدیک بڑھتا جارہا تھا ویسے ویسے وہاں کا منظر واضح ہوتا جارہا تھا اور پھر ان کے نزدیک پہنچتے ہی راحیل کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی .....وہ سب وہی مریض تھے جنہیں وہ صبح سے دیکھ رہا تھا اور پھر وہ چیختا ہوا اس بیڈ کی جانب بھاگ اٹھا جہاں اسے اپنی والدہ تڑپتی دکھائی دی اور اس کے قریب اس کا والد بیٹھا تھا جس نے اپنے چہرے پر ایک ماسک لگا رکھا تھا لیکن وہ اپنے والد کی نظریں پہچانتا تھا اس لئے بہت آسانی سے پہچان گیا کہ وہی اس کا والد ہے۔اس کی والدہ درد کی شدت سے بن پانی کی مچھلی کی مانند تڑپ رہی تھی۔وہ جیسے ہی اس بیڈ کے نزدیک پہنچا اور زور سے امی پکارا تو یکدم اس کی آنکھ کھل گئی وہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اس کے کپڑے پسینے سے تر ہو چکے تھے اور اس کے جسم پر ایک لرزہ طاری تھا۔اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ بھیانک خواب ہی تھا کوئی حقیقت نہ تھی۔لیکن اس نے صبح اپنے امی ابو کی خیریت پوچھنے کے لئے اپنے گھر فون کرنے کا ارادہ کیا اور دوبارہ بیڈ پر لیٹ گیا بڑی مشکل سے اسے نیند آئی اور کمرے میں اس کے خراٹے گونجنے لگے۔

☆.....☆.....☆

ووہان شہر میں قیامت برپا تھی ہر طرف چیخ وپکار مچی ہوئی تھی۔مریضوں کی تعداد اس قدر بڑھ چکی تھی کہ سڑکوں اور بازاروں میں مریض تڑپتے دکھائی دے رہے تھے۔حقیقت میں ایک قیامت کا سماں تھا جو اس وقت ووہان شہر میں برپا تھا۔1945 میں دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان کے شہر ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو ایٹم بم گرائے گئے تھے جس میں لاکھوں معصوم افراد پل بھر میں موت کا شکار بن گئے تھے۔اس کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔چاروں طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔شہر میں ایمرجنسی نافذ کردی گئی۔وہاں رہنے والے دوسرے ملکوں کے باشندے جیسے تیسے وہاں سے اپنے ملکوں کو لوٹنے لگے۔حکومت نے ووہان شہر میں کرفیو نافذ کرتے ہوئے تمام علاقہ مکمل لاک ڈاؤن کردیا۔جو اس شہر کے اندر تھے انہیں وہیں قید کردیا گیا۔اتنی پابندی اور احتیاط کے باوجود وہ موذی وائرس ووہان شہر سے نکل کر دوسرے شہروں اور پھر کچھ دنوں بعد خبر آئی کہ اس کا دائرہ کار ایک مخصوص علاقے سے نکل کر دوسرے ملکوں تک جا پہنچا ہے۔میڈیا کے مطابق جو باشندے فلائٹس سے اپنے ملکوں کو لوٹ گئے تھے ان کی وجہ سے وہاں بھی یہی وائرس پھیل چکا تھا اور کئی اموات ہو چکی تھیں اور بہت سے لوگ اسپتالوں میں تڑپ رہے تھے۔سب سے پریشان کن بات یہ تھی کہ کسی ملک سے بھی ابھی تک کوئی ایسی تسلی بخش خبر نشر نہیں کی گئی تھی کہ اس موذی وائرس سے متاثرہ کوئی مریض صحت یاب ہو چکا ہے۔راحیل اپنے ان مریضوں پر برابر نظر رکھے ہوئے تھا جنہیں اس نے یہ دوا ایک انجکشن کی صورت میں دی تھی۔تین چار دنوں کے بعد اس نے ان کے دوبارہ ٹیسٹ لئے تو یہ دیکھ کر اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا کہ ان میں قوت مدافعت بڑھ چکی تھی اور اس وائرس کے کسی قدر اثرات کم ہو چکے تھے اس کا مطلب تھا کہ اگر انہیں باقاعدگی سے دو ہفتوں تک مزید انجکشن دیئے جائیں تو وہ اس بیماری سے مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں گے۔پھر یکدم ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند اس کے دماغ میں آیا کہ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس روز اس کی امی کی بیماری کی صورت میں غیبی اشارہ کردیا تھا کہ یہاں موجود مریض جو اس مرض سے تڑپ رہے تھے انہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔وہ چونکہ دوسرے روز اپنے گھر فون کرکے اپنی امی کی خیریت دریافت کرچکا تھا وہ دونوں بالکل خیریت سے تھے۔لیکن وہ سمجھ گیا کہ اس کی ضرورت گھر کی بجائے یہاں تھی۔اس لئے اس نے اپنی دوا کا نتیجہ دیکھتے ہی اس کے متعلق اسپتال کی انتظامیہ کے سینئرز سے فوری بات کرنے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ وہ اکیلا اتنی مقدار میں اس طرح کے انجکشن تیار نہیں کرسکتا تھا۔اس نے فوری طور پر اپنے سینئرز سے بات کرکے ایک ہنگامی میٹنگ طلب کروائی اور پھر جب اس نے ان کے سامنے اپنی اس ایجاد کا ذکر کیا تو وہ سب

حیرت سے اسے تکنے لگے اور پھر وہ اٹھ کر اس کی طرف بڑھے اور اسے اپنے گلے سے لگالیا۔ ان سب کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے۔ فوری طور پر سینئرز نے اعلیٰ حکام سے رابطہ کرکے میڈیسن کمپنیوں کو راحیل کا فارمولہ مہیا کردیا جس پر وسیع پیمانے پر انجکشن تیار ہونے کی کارروائی شروع کردی گئی۔ راحیل کے پاس زیادہ انجکشن موجود نہیں تھے جو تھے وہ تقریباً مزید سات اور افراد کو لگائے جاسکتے تھے۔ اس لئے اس نے یہی انجکشن اپنے ان مریضوں پر ہی استعمال کئے جن میں ریکوری کے اثرات شروع ہوچکے تھے۔

☆.....☆.....☆

دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں یہ وائرس انتہائی تباہ کن انداز میں پھیل چکا تھا اور بہت سے معصوم لوگوں کی زندگیاں نگل چکا تھا اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ اسپتالوں میں سسک سسک کر اپنی موت کا انتظار کررہے تھے۔ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ میڈیا والے الگ چیخ رہے تھے۔ کسی کو کسی کی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ایک قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر، ان سے اٹھتا ہوا تعفن، ٹرکوں میں بھر بھر کر لاشوں کو اجتماعی طور پر ایک گڑھے میں جلانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ حفاظتی سامان ناپید ہوچکا تھا جو بچ گیا تھا وہ سونے کے بھاؤ مل رہا تھا۔ دنیا کے سپر پاور ملکوں میں بھی یہ وائرس پھیل چکا تھا اور یہ پیغام دے رہا تھا کہ انسان چاہے جتنی بھی ایٹمی ترقی کرلے لیکن یہ دنیا صرف ایک وائرس کی مار ہے۔ ان سب سے بڑی سپر پاور تو اوپر بیٹھی ہوئی ہے جس کے آگے یہ دنیاوی طاقتیں کچھ بھی نہیں ہیں۔ حکومتی لیول پر اس کی ایٹی دوا فوری طور پر تیار کرکے اسے اسپتالوں میں تڑپتے مریضوں پر استعمال کروانا شروع کردی گئی۔ اسپتال کی انتظامیہ کی نظروں میں راحیل ایک مسیحا سے کم نہ تھا وہ اسے بڑی عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ بہت سے انجکشن راحیل کے اسپتال میں بھی پہنچادیئے گئے تھے جنہیں بڑی تیزی سے وہاں مریضوں پر استعمال کیا جانے لگا اور کچھ ہی دنوں میں ووہان شہر میں مریضوں کی تعداد صحت یابی کی جانب بڑھنے لگی۔ مریض بڑھنے کی ریشو بہت کم ہوگئی اور پھر کچھ ہی دنوں میں ووہان شہر کو دوبارہ کھول دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ حفاظتی اقدامات کے پیش نظر وہاں موجود لوگوں کو حکومت کی طرف سے ہدایات پر عمل پیرا ہونے کے لئے سخت احکام دیئے گئے۔

راحیل نے دن رات محنت کرکے اپنی ڈاکٹری کی تعلیم کا بھرم رکھا اور کچھ دنوں تک ووہان شہر اور آس پاس کے دیگر اسپتالوں کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی ان انجکشنوں کا استعمال کرکے بہت سے مریضوں کو صحت یاب کردیا گیا۔ چونکہ اسپتال کی انتظامیہ نے حکومت کو اس بات کی سفارش کی تھی کہ راحیل نے انسانیت کی بھلائی کے لئے ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے اس لئے اسے چائنہ کی اعزازی شہریت کے علاوہ نوبل پرائز سے بھی نوازا جائے۔ حکومت نے ان کی اس پیش کش کو بخوشی تسلیم کرتے ہوئے راحیل کو ایک بہت بڑے اور اعلیٰ سطح کے اجلاس میں اسے وہاں کی شہریت اور نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ اس کی اس کامیابی کو پوری دنیا میں براہ راست دکھایا گیا اور یہ منظر راحیل کے والدین نے بھی پاکستان میں اپنے گھر ٹی وی پر دیکھا۔ راحیل کے ابو کے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اس کے بیٹے نے ان کے ساتھ ساتھ اپنے ملک پاکستان کا بھی سر فخر سے بلند کردیا تھا۔ انہوں نے فوراً راحیل سے رابطہ کرکے اسے اس کی اس بہت بڑی کامیابی پر ڈھیروں مبارکبادیں اور دعائیں دیں۔ راحیل کی امی نے روتے ہوئے اسے واپس گھر پہنچنے کے لئے کہا جسے راحیل نے فوری قبول کرتے ہوئے پہلی فلائٹ میں سیٹ بک کروالی۔ وہ جلد از جلد پاکستان پہنچ کر اپنے والدین کے ساتھ مل کر اپنی اس کامیابی کا جشن منانا چاہتا تھا۔

بددعا

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

تاریخی حوالوں کے مطابق مصر پر فرعونوں کی حکومت 3100 قبل مسیح سے شروع ہو کر 332 قبل مسیح تک قائم رہی۔ اس دوران میں تیس خاندانوں کے کوئی 170 فرعون تخت نشین ہوئے پھر.....

ایک ایسی کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو حیران ہی نہیں بلکہ پریشان بھی.....کردے گی

سائمن پیشے کے لحاظ سے صحافی تھا۔ دوستوں کی محفلوں میں اس کی وجہ سے جان آجاتی تھی مگر خواتین سے وہ یوں بدکتا تھا جیسے بلی کتے سے اور ایک حسین نسوانی چہرہ سائمن کے لیے یوں ہی تھا جیسے کسی بل فائٹر کے ہاتھ میں پکڑا ہو سرخ رنگ کا کپڑا کسی بیل کے لیے۔ یہ سب اس لیے بھی حیرت انگیز تھا کہ خود سائمن شاندار مردانہ وجاہت کا مکمل نمونہ تھا۔ سیاہ چمک دار آنکھیں اور نقوش کسی یونانی دیوتا سے ملتے جلتے۔ اٹھنے بیٹھنے میں کسی مشرقی نواب جیسی شان۔ کسی بھی مخلوط محفل میں جب وہ جاتا تو خواتین اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو جاتیں۔ اس میں جنس مخالف کے لیے بے پناہ مقناطیسی کشش تھی مگر سائمن نے اپنی حد سے کبھی ایک قدم آگے نہ بڑھایا۔

اس قدر شان دار آدمی ایک دن اچانک غائب ہو گیا۔ کہاں گیا کسی کو کچھ علم نہیں تھا نہ ہی اس نے اس بارے میں کسی دوست کو آگاہ کیا تھا۔ اس کی گمشدگی نے پورے قاہرہ میں ہلچل پیدا کر دی۔ اس وقت یہ ایک قدرتی عمل تھا مگر جب کچھ عرصہ اس کی کوئی خبر نہ ملی تو لوگ اسے بھی بھول گئے اور کسی نئی دل چسپی میں کھو گئے۔

قصہ مختصر سائمن چھٹیاں لندن میں گزارنے کے بعد چند دن پہلے ہی اپنی صحافتی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے قاہرہ واپس پہنچا تھا اور ایک گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک شام معمول کے مطابق چہل قدمی اور ہوا خوری کے لیے باہر نکلا اور سگریٹ کا دھواں اڑاتا عظیم اہرام مصر کی طرف مڑا اور پھر دوبارہ کبھی نظر نہ آیا۔ یہی اس کی مکمل کہانی ہے۔

مگر یہ کہانی جو میں آپ کو اب سنانے لگا ہوں اس میں اپنی گمشدگی سے آگے کے واقعات سائمن نے خود بیان کیے ہیں اور یہ سب اس کی اپنی لکھائی میں تحریر ہے۔ اس میں کچھ بھی میری طرف سے اضافہ نہیں ہے۔ اب آپ پوچھیں گے یہ تحریر میرے پاس کہاں سے آئی تو یہ میں آپ کو مختصراً بتاتا ہوں۔ سائمن کے غائب ہونے کے تقریباً دو سال بعد کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں بھی قاہرہ میں تھا اور اپنے کچھ دوستوں سے ملنے ایک رات اسی گیسٹ ہاؤس آیا ہوا تھا جہاں سے سائمن غائب ہوا تھا۔ دوستوں سے ملنے کے بعد جب میں باہر آیا اور ٹیکسی میں بیٹھنے لگا تو ایک لمبا تڑنگا مقامی شخص جس نے اپنا چہرہ رومال سے اس طرح چھپایا ہوا تھا کہ صرف آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر بغیر کچھ بولے ہاتھ ماتھے تک اٹھا

کر سلام کیا اور اندھیرے میں ایک طرف غائب ہو گیا۔

یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی اگرچہ ٹیکسی کا ڈرائیور بھی قریب ہی موجود تھا اور گیسٹ ہاؤس کا ایک ملازم بھی جو میرے پیچھے ہی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ میں ملگجے اندھیرے میں کھڑا اپنے ہاتھ میں پکڑے اس لفافے کو گھورتا رہا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس لمبے تڑنگے مقامی شخص نے یہ لفافہ غلطی سے مجھے تھما دیا ہے۔ لاشعوری طور پر میں اس پیکٹ کو ٹیکسی کی لائٹ کے قریب کر کے بغور دیکھنے لگا۔

بظاہر اس لفافے کے اندر موٹے کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔ یہ ایک باریک مگر مضبوط رسی سے بندھا ہوا تھا اور اس کے اوپر خالی جگہ پر میرا نام جلی حروف میں درج تھا۔ میں ذہنی ادھیڑ بن میں ٹیکسی کے اندر بیٹھ گیا۔ لفافے کی رسی کھولی اور اندر سے کاغذ نکال کر سیدھے کیے اور پڑھنا شروع کر دیا۔ لفظوں پر نظر پڑتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ پورا مسودہ کالے رنگ کی روشنائی میں تھا اور لکھائی بلاشبہ سائمن کی تھی مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ تحریر کے لیے کاغذ کی بجائے قدیم فرعونی دور کا ''پیپرس'' استعمال کیا گیا تھا۔ یہ وہ چیز تھی جو عہد فراعنہ میں درخت کی چھالوں سے بنائی جاتی تھی اور دستاویزات لکھنے اور محفوظ کرنے کے کام آتی تھی۔ اسی نے بعد کے ادوار میں ترقی کر کے آج کل کے جدید کاغذ کی شکل اختیار کی۔ بعد میں کئی ماہرین نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ آج کل یہ چیز بالکل مفقود ہے اور اس کا ملنا ناممکنات میں سے ہے۔

سائمن کی اپنی تحریر کے مطابق اگر یہ سب واقعی سائمن نے ہی لکھا تھا تو یہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب اس دن وہ گیسٹ ہاؤس سے نکلا۔ گیسٹ ہاؤس کا گائیڈ حسن عبدالکبیر اس وقت بھی اس گیسٹ ہاؤس کے لیے کام کر رہا تھا جب میں وہاں گیا۔ اس نے تصدیق کی کہ سائمن کی کہانی میں جس سنگ لاجورد سے بنے دل کا ذکر ہے وہ اس نے سائمن کے پاس دیکھا تھا اور وہ اس بڑھیا کو بھی جانتا ہے جس کا ذکر سائمن نے اپنی کہانی میں کیا ہے۔

باقی کہانی سائمن کا یہ مسودہ خود بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

اس دنیا کو چھوڑے مجھے بارہ سال گزر چکے ہیں۔ میں اپنے ایک ساتھی کے مشورے پر اپنی یہ کہانی

اس لیے تحریر کر رہا ہوں کہ میں جس عجیب اور محیر العقول تجربے سے گزرا ہوں اس میں ان کو بھی حصے دار بنا سکوں جو زندگی میں میرے قریب رہے ہیں کیونکہ ایسا تجربہ کسی انسان کو نہیں ہوا ہوگا اور مجھے پورا یقین ہے کہ کوئی بھی انسان میری اس کہانی پر یقین نہیں کرے گا مگر مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ کہانی لکھنا میرے خون میں شامل ہے لہٰذا اس تحریر کو ایک کہانی کے طور پر پڑھا جائے تو سارے واقعات آسانی سے سمجھ میں آجائیں گے۔

یہ کہانی کہاں سے اور کب شروع ہوتی ہے اس کو میں قاری کی سمجھ بوجھ پر چھوڑتا ہوں مگر ان واقعات کا آغاز ہوتا ہے اس سہ پہر سے جب میں قاہرہ میں سناروں کے بازار میں یونہی آوارہ گردی کر رہا تھا اور اس کی تنگ گلیوں میں تنہا چکر لگا رہا تھا کیونکہ اس طرح تنہا گھومنا میری پرانی عادت ہے باوجود اس کے کہ میں یہاں کی مقامی زبان عربی اور رسم و رواج سے بالکل نابلد ہوں۔

برسوں سے میری خواہش تھی کہ مصر اور اس کی قدیم تاریخ کی سیر کروں مگر پیشہ ورانہ مصروفیات ہمیشہ آڑے آتی رہیں۔ اب جب کہ میں یہاں موجود تھا تو میں اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ گیسٹ ہاؤس میں سیاحوں کے ہجوم اور حسین خواتین کے جلووں سے اکتا کر جلد ہی میں وہاں سے نکل آیا اور اس اجنبی شہر میں گھومنے لگا۔ صحرا مجھے پیار بھرے انداز میں اپنی طرف بلا رہا تھا۔ مشرقی انداز کے مکان اور دکانیں، بازار کا شور اور مشرقی خوشبو میرے دل کو اپنی مٹھی میں لے رہی تھی۔

وہاں میں نے بڑے بڑے پہیوں والی تجارتی گاڑیوں کو گزرتے دیکھا جو ان تنگ گلیوں میں مختلف قسم کا سامان پہنچاتی تھیں۔ ان گلیوں میں جو زیادہ چوڑی نہیں تھیں، ایرانی تاجر اپنے قالینوں کے ساتھ اور عرب تاجر چمک دار ریشمی لباس لے کر دکانیں سجائے بیٹھے تھے۔ تند خو صحرائی بدو اور قاہرہ کے نرم خو تاجر بھی وہیں موجود تھے۔ ان کے پاس منقش کپڑے سے لے کر مہین ریشمک تک ہر مال موجود تھا۔ اس قسم کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

میں عموماً دوپہر میں بازار میں نکلنے سے کتراتا تھا کیونکہ اس وقت یورپین اور امریکی گاہک وہاں بہت کم پائے جاتے تھے۔ یہ جس وقت کا میں ذکر لکھ رہا ہوں گلی کے سرے پر جہاں بڑے بڑے سناروں کی دکانیں تھیں وہاں میں اکیلا غیر ملکی تھا۔ اچانک لوگوں کا ایک ہجوم گلی سے دندناتا ہوا نکلا۔ جب میری توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی اس وقت وہ یوں بھاگ رہے تھے جیسے پاگل کتے ان کے پیچھے لگ گئے ہوں۔ اس ہجوم میں اپنے ٹھگنے سے گدھے پر سوار ایک سفید ریش بوڑھا شخص بھی تھا جو اچانک میرے سامنے آیا۔ وہ مڑ مڑ کر اپنے کندھے کے اوپر سے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ میرے بچنے کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ مجھ سے تقریباً ٹکرا ہی گیا۔ میں نے ایک طرف ہو کر بچنے کی کوشش کی تو ایک بڑھیا سے ٹکرا گیا جو گلی سے باہر آرہی تھی۔

وہ گدھا سوار جو اس حادثے کی اصل وجہ تھا گولی کی رفتار سے وہاں سے بھاگ نکلا اور میں وہاں اس بڑھیا کے پاس تنہا رہ گیا۔ ساری گلی ویران ہو چکی تھی۔ دکان دار بھی اپنی دکانوں کے اندر دبک گئے تھے۔ وہ کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ پیدل چلنے والے تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھے۔

وہ بڑھیا جو مجھ سے ٹکرائی تھی اب میرے قدموں کے پاس گری درد سے کراہ رہی تھی۔ اس کی مدد کرنے کی غرض سے جونہی میں اس کی طرف جھکا تو مجھ کو جھرجھری آگئی اور میں کانپ اٹھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا اسے میں کیسے بیان کروں۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اس قدر خوف ناک، ڈراؤنا اور کراہیت آمیز چہرہ کبھی کسی کا نہیں دیکھا تھا۔ اس کا وہ سیاہ بوسیدہ حجاب جسے وہ اوڑھے ہوئے تھی گرنے کی وجہ سے اس کے چہرے سے ہٹ گیا تھا اور اس کا بدصورت، جھریوں بھرا زرد چہرہ پوری طرح عیاں ہو گیا تھا۔ بغیر دانوں کے جبڑے کے ساتھ وہ بمشکل ہی انسان دکھائی دے رہی تھی۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ چہرہ کسی نوے یا سو سالہ بڑھیا کا معلوم نہیں ہو رہا تھا بلکہ

صاف نظر آرہا تھا جیسے اس کی عمر کئی سو سال ہو۔ جیسے وہ صدیوں کی مسافر ہو۔ اس عورت کا چہرہ بالکل کسی مردے یا ڈائن کا چہرہ نظر آرہا تھا۔

جونہی میں نے بے ساختہ جھرجھری لی تو ہلکے سے کراہ کر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنے استخوانی پنجوں جیسے ہاتھ سے آنکھوں کو ڈھک لیا مگر مجھے وہ گہرا در صاف نظر آ گیا جوان عمر رسیدہ آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ وہ شاید میری اضطراری کراہیت کو بھانپ گئی تھی۔

وہ لوگ جو مجھے جانتے ہیں اس بات کی گواہی دیں گے کہ میں جذباتی یا سطحی آدمی نہیں ہوں جو فوراً کسی چیز سے متاثر ہو جاؤں لہٰذا ان کے لیے یہ تعجب خیز بات ہوگی کہ اس بڑھیا کی آنکھوں میں تیرتی بے بسی نے میری اس کراہیت کو ترس میں بدل دیا۔ یہ بوڑھی عورت میری وجہ سے گری تھی اور اب میں اسے دوبارہ اٹھنے میں مدد دینے سے ہچکچا رہا تھا۔ یقیناً اس عورت کو ہر کسی نے دھتکار دیا تھا۔ میرے اندر ہمدردی کی ایک ایسی لہر ابھری جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جسے روکا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا اس کا کسی پرانی کھوپڑی جیسا سر میں نے اٹھایا اور اپنے زانو پر رکھ دیا۔ نیچے جھکا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے ہونٹ برف کی کسی یخ ٹھنڈی سل پر رکھ دیے گئے ہوں۔ وہ عجیب لمس تھا۔

فوراً ہی ردعمل ظاہر ہوا اور وہ بڑھیا ایک ایسے عجیب انداز میں کراہی جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ اس کے بعد اس کے چہرے پر ایک عجیب خوشی کا تاثر اُبھرا جو گہری جھریوں کے نیچے نہیں چھپ گیا۔ وہ سہارا لیتی ہوئی بمشکل اپنے قدموں پر اٹھی اور ہاتھ یوں اٹھائے جیسے دعا دے رہی ہو۔ عربی زبان میں کچھ بڑبڑائی اور پھر لڑکھڑاتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔

یہ سب اتنی جلدی ہو گیا کہ بظاہر کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی لیکن ایک عجیب شرمندگی اور ندامت کے احساس کے ساتھ مڑ کر میں سناروں کے اس بازار سے نکلا اور دوبارہ معمول کی سرگرمیوں میں مشغول ہو گیا۔ اس بوسے کا احساس عجیب سا تھا۔ میں اپنے ہونٹ صاف کرنا چاہتا تھا مگر یوں جیسے کوئی مجھے اندر سے اس عمل کے لیے منع کر رہا ہو۔

پہلی دفعہ میرے اندر خواہش پیدا ہوئی کہ لوگوں کے ہجوم میں جاؤں۔ کسی محفل میں جا کر بیٹھوں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کسی خوب صورت نسوانی چہرے کو دیکھوں۔ اپنی حالت پر پریشان میں واپس گیسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

اس رات کھانا کھانے کے بعد میں گیسٹ ہاؤس سے باہر نکلا۔ مجھے اپنے گائیڈ حسن عبدالکبیر کی تلاش تھی جس کے ساتھ اگلے روز میں نے اونٹ پر صحرا کی سیر کا ارادہ کیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے رات ساڑھے آٹھ بجے ملے گا تاکہ ہم اگلی صبح صحرا کی طرف روانگی کی تفصیلات طے کر لیں۔

چند ایک گائیڈ ہوٹل کے باہر بیٹھے تھے اور باتوں میں وقت گزاری کر رہے تھے مگر ان میں مجھے حسن کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں اس کے انتظار میں سڑک پر ٹہلنے لگا۔ ابھی دس گز بھی نہ چلا ہوں گا کہ ایک دراز قد مقامی شخص اندھیرے سائے سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ اس کے سر پر سفید رنگ کی پگڑی تھی جس کے پلو سے وہ اپنا منہ چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی پوٹلی میرے ہاتھ میں تھمائی۔ اپنے ابرو، ہونٹ اور سینے کو ہاتھوں سے چھوا، تھوڑا جھکا اور دوبارہ اندھیرے میں گم ہو گیا۔

میں وہیں سڑک کے کنارے کھڑا بے وقوفوں کی طرح اس پوٹلی کو گھورتا رہا جو عمدہ نفیس ریشمی کپڑے میں بندھی ہوئی تھی۔ اس کے اندر کوئی چھوٹی مگر سخت چیز تھی۔ میں سمجھا کہ سفید پگڑی والا مجھے غلطی سے یہ پوٹلی تھما گیا ہے حالانکہ یہ میرے لیے بالکل بھی نہیں ہے۔

گیسٹ ہاؤس لوٹتے ہوئے میں نے سڑک کے کنارے لیمپ کی روشنی میں اس کپڑے کو کھولا جو عمدہ قسم کے عطر میں معطر تھا۔ اس کے اندر سنگِ لاجورد کا ایک ٹکڑا تھا جو دل کی شکل میں تراشنے کے بعد سونے کے خول میں جڑا گیا تھا اور اس پر عربی زبان میں کچھ حروف کندہ تھے جن کے اندر سونا بھرا ہوا تھا۔

میں اس پتھر کو کافی دیر دیکھتا رہا۔ یقیناً اس دراز قد نقاب پوش نے عجیب غلطی کر ڈالی تھی۔ یہ محبت کی نشانی تھی جو یقیناً میرے لیے نہیں تھی۔ میں تو ان چیزوں سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ میں حیرت زدہ انداز میں وہاں کافی دیر کھڑا سنگ لاجورد کے اس ٹکڑے کو ابھی دیکھ ہی رہا تھا جب حسن کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''معافی چاہتا ہوں حضور مجھے دیر ہوگئی۔''

میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ حسن پھٹی پھٹی نظروں سے دل کی شکل والے اس سنگ لاجورد کے ٹکڑے کو گھورے جا رہا تھا جو میری ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا۔ ''کیا بات ہے۔ کیا تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟'' میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ پتھریلا دل ہے۔'' وہ عجیب سی آواز میں بولا۔ ''یہ سنگی دل ہے۔''

''یہ تو صاف ظاہر ہے..... مگر تم حیران کیوں ہو۔''

''کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟'' اس نے اپنا ہاتھ میری طرف پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے سنگ لاجورد اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

''اس کے اوپر جو لفظ کھدا ہوا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ لفظ ''الف'' بنا ہوا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''الف..... کیا یہ کسی کا نام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''عربی زبان میں اس کا مطلب ہے دس سو۔'' وہ سر سرایا۔

''یعنی ایک ہزار.....؟''

''ہاں..... ایک ہزار۔'' حسن نے سنگ لاجورد کا وہ ٹکڑا میری طرف واپس بڑھا دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میں واقعی پریشان ہونے لگا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ہمدردی کے ایسے جذبات نظر آرہے تھے جو میں یہاں بیان نہیں کر سکتا۔

''حسن.....'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''تم مجھے اس پتھر کے متعلق وہ سب کچھ بتاؤ جو تم جانتے ہو۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم سمجھ رہے ہو کہ میں نے اس پتھر کو کہیں سے چرایا ہے۔''

''ارے نہیں حضور.....'' وہ تیزی سے بولا۔ ''مگر جو میں جانتا ہوں اس کو سن کر شاید آپ کو یقین نہ آئے۔''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ بس تم بتا دو۔''

پھر حسن عبدالکبیر نے مجھے جو حیرت انگیز کہانی سنائی وہ واقعی الف لیلیٰ کی کہانی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں جو کچھ سنایا اسے میں اپنے رواں الفاظ میں درست تاریخی حوالوں اور تواریخ کے ساتھ یہاں آپ کے سامنے دہراتا ہوں تاکہ آپ اس کو با آسانی سمجھ سکیں۔

تاریخی حوالوں کے مطابق مصر پر فرعونوں کی حکومت 3100 قبل مسیح سے شروع ہو کر 332 قبل مسیح تک قائم رہی۔ اس دوران میں تیس خاندانوں کے تقریباً ایک سو ستر (170) فرعون تخت نشین رہے۔ 343 قبل مسیح میں ایرانیوں نے دوسری مرتبہ مصر پر قبضہ کر کے عہد فراعنہ کا خاتمہ کیا۔ اس عہد کو فراعنہ کا اکتیسواں خاندان کہا جاتا ہے۔ اس عہد کے آخری حکمران کا نام ''داریوش سوم'' تھا جو 336 قبل مسیح سے لے کر 332 قبل مسیح تک تخت نشین رہا۔ اسی بادشاہ کے زمانے میں قاہرہ شہر کا گورنر ایک ایرانی امیر تھا۔ اس گورنر کی ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام ''شہرزاد'' تھا۔ شہرزاد کے حُسن کا شہرہ چار دانگ عالم میں تھا۔ جو ایک دفعہ دیکھتا دوسری سانس لینا بھول جاتا۔ ہر کوئی اس کو اپنے

حرم کی زینت بنانے کو بے تاب تھا۔ کئی وزیروں اور شہزادوں نے اس کا ہاتھ تھامنے اور مانگنے کی کوشش کی مگر شہزادنے کسی کو گھاس نہ ڈالی کیونکہ وہ تو اپنا دل قاہرہ کے ایک نوجوان تاجر ''ایزد'' کے سامنے ہار چکی تھی۔

ایزد اس شہر کا امیر ترین آدمی تھا۔ گورنر اگرچہ اپنی بیٹی کے اس فعل پر خوش نہیں تھا مگر وہ اپنی بیٹی کی خوشیوں کو برباد بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح شہزاد کو اس کی ضد سے ہٹا سکے مگر ناکام رہا۔ ابھی وہ اس مسئلے کا کوئی حل سوچ ہی رہا تھا کہ کہ ایک دن شہزاد محل کی دوسری منزل پر واقع اپنے کمرے سے رسی کی سیڑھی لگا کر نکل بھاگی۔ یہ سیڑھی اس کے کمرے تک پہنچانے کا انتظام ایزد نے کیا تھا۔ اس نے محل کے ایک غلام کو سونے کے سکوں کی ایک تھیلی دے کر اس کام پر آمادہ کیا تھا۔ ایزد محل کے عقبی باغ کے باہر تیز رفتار گھوڑے لیے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

شہر پناہ کے محافظ بھی ایزد نے خرید رکھے تھے لہٰذا یہ نوجوان جوڑا بحفاظت قاہرہ شہر سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ گورنر کو جب اس کا علم ہوا تو اس کو غصہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ مشتعل گورنر نے شہر میں موجود ایزد کی دولت اور ساری جائیداد حکومت کے حق میں ضبط کرلی اور اس کی غیر حاضر میں اسے موت کی سزا سنادی گئی۔ گورنر نے حکم جاری کر دیا کہ وہ جہاں ملے گرفتار کر کے سزائے موت پر عمل کیا جائے۔

ایزد اور شہزاد صحرا میں ایک دور دراز نخلستان میں جا چھپے۔ اس نخلستان کا سردار، ایزد کا دیرینہ دوست تھا۔ اس نے بخوشی ان کو پناہ دے دی مگر محل کی وہ خوش حالی اور آسائش جو شہزاد کے لیے بہت پرکشش تھی اب دھواں بن گئی تھی۔ دولت کے بناء زندگی گزارنا اس کے لیے وبال بنتا جا رہا تھا۔ ایزد کے لیے بھی اس کے رویے میں تبدیلی آگئی۔ اس لیے ایزد کوئی منصوبہ بنانے لگا کہ وہ کیسے قاہرہ شہر میں اپنی ضبط شدہ دولت واپس حاصل کرے اور اپنی حسین بیوی کو ہر وہ آسائش مہیا کرے جس کی وہ عادی تھی مگر اس کو کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔

ایک روز اس کو علم ہوا کہ صحرا کے دور دراز کونے میں بھو ڑیوں کے غار میں ایک ساحر کا ٹھکانا ہے۔ اس ساحر کے پاس ماورائی اور جادوئی طاقتیں ہیں۔ اس ساحر تک پہنچنا بہت دشوار تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر رکے بغیر پورے ہفتے کا سفر تھا۔ راستہ بھی اجنبی تھا جس سے ایزد پوری طرح لاعلم تھا۔ بدقت تمام اس نے نخلستان کے ایک بوڑھے سے راستہ سمجھا اور اپنے گھوڑے کو ساحر کے غار کی طرف اڑا لگادی۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ ساحر اپنی جادوئی طاقتیں سے اس کی ضبط شدہ دولت واپس حاصل کرنے میں اس کی مدد کرے۔

جس وقت ایزد اپنے گھوڑے کو بھوری پہاڑیوں کی جانب دوڑا رہا تھا عین اسی وقت ولی عہد مصر قاہرہ شہر کے دورے پر آیا۔ ایک صبح وہ شکار کے لیے صحرا میں نکلا تو راستہ بھٹک کر اسی نخلستان میں پہنچ گیا جہاں شہزاد اور ایزد نے پناہ لے رکھی تھی۔ یہ شہزادہ بھی شہزاد کے حسن کا مداح تھا۔ وہ وہاں شہزاد کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

دوسری طرف ساحر نے ایزد کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ایزد نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا تو ساحر نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کرلیا۔ ایزد پورے سات دن کا تھکا دینے والا اور کٹھن سفر طے کر کے یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کو سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ وہ سات دن سے شہزاد سے دور تھا اور اس کے دیدار سے محروم تھا اس لیے اس نے ساحر سے درخواست کی کہ وہ اپنے مشہور جادوئی آئینے میں اسے شہزاد کے حسن بے مثال کا نظارہ کروا دے۔ ساحر اس کی بات سن کر مسکرانے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ عاشق دلگیر اپنے محبوب کی جدائی میں پریشان ہے۔ اس نے ایک خاص خوشبو جلائی اور جادوئی منتر پڑھنے کے بعد ایزد سے بولا۔ ''اب اس سامنے پڑے آئینے پر سے رومال سرکاؤ اور اپنے محبوب کا دیدار کرلو۔''

ایزد نے آئینے میں جھانکا تو کچھ واضح نظر نہ آیا ہر منظر دھندلا تھا مگر پھر دھیرے دھیرے سب واضح ہوتا چلا گیا۔ ایزد نے دیکھا کہ نخلستان کے چشمے کے قریب

جھکے ہوئے کھجور کے درخت کے نیچے شہزاد کھڑی تھی۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ اس کی دودھیا روشنی میں شہزاد کا حسن اور بھی قاتل ہوگیا تھا۔ پھر اچانک اس کے قدموں تلے زمین سرکنے لگی۔ سر گھومنے لگا اور دل یوں دھڑکنے لگا جیسے ابھی سینہ پھاڑ کر باہر آجائے گا۔

اس نے دیکھا کہ ایک خوب رو نوجوان نے جو بیش قیمت لباس میں ملبوس تھا، آگے بڑھ کر شہزاد کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ شہزاد کے چہرے کی مسکراہٹ اس کی رضامندی کی دلیل تھی۔ اب نوجوان اس کے نرم گداز لبوں کا بوسہ لے رہا تھا۔ ایزد پہچان گیا کہ یہ نوجوان ولی عہد مصر ہے۔

ایزد کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ جو اتنا طویل اور جان جوکھوں والا سفر کر کے اپنی محبوبہ کی خوشیاں خریدنے آیا تھا ایک دم یوں جیسے آسمان سے زمین پر آن گرا ہو۔ عورت کی بے وفائی پر اس کا دل پارہ پارہ ہوگیا۔ روتی ہوئی آنکھوں سے اس نے ساحر سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے جادو سے شہزاد کو کوئی سخت سزا دے۔

ساحر نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور بولا۔ ''نہیں..... اے نوجوان میں اپنے علم کو کسی کے خلاف استعمال نہیں کر سکتا۔ تم اپنی محبوبہ کو کوئی سزا دینا چاہتے ہو تو اپنی طاقت یا اپنی تلوار استعمال کرو۔''

ایزد غصے اور بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس نے اپنی تلوار نکال کر جادوگر کے گلے پر رکھ دی اور دھمکی دی۔ ''اے ساحر!..... یا تو تمہیں میری بات ماننا پڑے گی یا پھر تم میری تلوار کا نشانہ بننے کو تیار ہو جاؤ۔''

ایزد کے جنون اور غصے کو دیکھتے ہوئے ساحر سمجھ گیا کہ یہ نوجوان پاگل پن میں کچھ بھی کر گزرے گا لہٰذا اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ساحر نے کچھ دیر اپنی آنکھیں بند کیں۔ منہ ہی منہ میں کچھ بدبدایا پھر ایزد کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''میں جو منتر تمہیں بتاتا ہوں تم اسے پڑھ کر شہزاد کو جو بددعا دو گے وہ پوری ہوگی۔''

ایزد نے اس کے کہنے کے مطابق منتر پڑھا اور پھر ٹوٹے دل کے ساتھ دل گرفتہ انداز میں بولنے لگا۔ ''اے میرے دل کی ملکہ!..... میں نے تمہیں اپنی جان سے بڑھ کر چاہا مگر تم نے مجھ سے دغا کیا۔ تم صرف دولت کی پجارن نکلی۔ میرا انتظار بھی نہ کیا۔ میں تمہیں موت کی دعا تو نہیں دے سکتا مگر یہ بددعا ضرور دوں گا کہ تم جتنی حسین ہو اتنی ہی زیادہ بدصورت ہو جاؤ اور تم اپنی بدصورتی اور کراہیت آمیز جسم کے ساتھ اس وقت تک زندہ رہو گی جب تک ایک ہزار مرد کسی کے کہے بغیر اپنی مرضی سے کراہیت کھائے بغیر تمہاری اس بدصورتی کو بوسہ نہیں دے دیتے۔ چاہے اس میں صدیاں ہی کیوں نہ گزر جائیں۔ اس کے بعد تم اپنی جوانی، حسن اور محبت دوبارہ حاصل کر لو گی اور پھر مر جاؤ گی۔''

شہزاد کو یہ بددعا دینے کے بعد دل گرفتہ ایزد ساحر کی گپھا سے باہر نکلا۔ وہ صحرا میں بے منزل اپنا گھوڑا دوڑاتا رہا۔ اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ اسی سفر کے دوران میں ایک رات وہ گھوڑے سے گرا اور مر گیا۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے حسن الکبیر کی آواز بھرا گئی اور کچھ دیر سانس لینے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہو۔ ''ایزد تو مر گیا مگر شہزاد کسی کی نہ ہو سکی۔ اس نے ایزد کی دی ہوئی بددعا کے ساتھ وقت کا سفر شروع کیا۔ اس کا توبہ شکن حسن ختم ہوگیا اور بدصورتی کی چھایا نے اسے گھیر لیا۔ وہ ایزد کی دی ہوئی بددعا لے کر در بدر پھرنے لگی اور اس بددعا کے ختم ہونے کی دعا کرنے لگی۔ وہ گلی گلی، کوچے کوچے بھیک مانگتی دیکھی گئی۔ اس طرح اس نے کافی دولت جمع کر لی۔ یونہی نہ جانے کتنے برس یا پھر صدیاں گزر گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ آخر کار وہ اپنے آبائی شہر قاہرہ واپس پہنچی اور یہاں رہنے لگی۔ اس دوران میں جس جس شخص نے اسے ایک ایک بوسہ دیا تھا وہ اسے سنگ لاجورد سے بنا ایک دل بھیجتی اور ایسا شخص شاذ و نادر ہی کوئی ہوتا۔ اس دل کے اوپر سونے سے ایک نمبر کھدا ہوتا جو اس بوسے کا نمبر ہوتا۔ اسے ایک ہزار بوسے پورے ہونے کا انتظار تھا۔ اپنے بچپن میں بھی میں نے ایک

دفعہ ایسا ہی سنگ لاجورد کا بنا دل دیکھا تھا۔ اس پر نو سو ننانوے کھدا ہوا تھا۔''

حسن عبدالکبیر کی یہ کہانی دل چسپ تو تھی مگر ناقابل یقین تھی۔ میرے نزدیک یہ صرف ایک مشرقی روایت یا لوک کہانی تھی مگر یہ دیکھنے کے لیے کہ حسن اس سے کتنا متاثر ہے میں نے اسے اس بڑھیا کے متعلق بتایا جس سے میں بازار میں ٹکرایا گیا تھا۔

میری بات سنتے ہی وہ خوف بھرے لہجے میں چلا اٹھا۔ ''وہ یقیناً وہی تھی۔۔۔۔ وہ شہرزاد تھی۔۔۔۔۔ اور یہ اس کا آخری بوسہ تھا۔''

''اب کیا ہوگا۔۔۔؟'' میں نے حسن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔۔۔۔ میں نہیں جانتا۔'' حسن کے لہجے کا خوف اب بھی نمایاں تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلے روز سارا دن صحرا نوردی کے دوران میں نے محسوس کیا کہ حسن بار بار مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے تاثرات عجیب سے تھے جس میں بیک وقت ہمدردی اور حیرت کے تاثرات تھے۔ کئی بار میں نے اس سے پوچھنے کی کوشش مگر اس نے کچھ بھی ظاہر نہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ دنیا میرے قدموں تلے پھسلتی جارہی ہے اور مجھ میں خواہش پیدا ہورہی تھی کہ اس جدید دنیا کو تیاگ دوں اور صحراؤں کی وسعتوں میں کہیں کھو جاؤں۔ میں نے بے اختیار ہوکر اس سنگ لاجورد کے دل کو چوم لیا۔ میں نے ایسا کیوں کیا یہ میں خود بھی سمجھ نہ پایا۔ میں اپنا آپ کھو رہا تھا مجھے اپنا ہوش ختم ہورہا تھا۔

اس شام جب گیسٹ ہاؤس کے باہر حسن عبدالکبیر مجھ سے رخصت ہوا تو نجانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں اس سے آخری بار مل رہا ہوں۔ آج کے بعد ہماری ملاقات نہ ہوگی۔ اگرچہ اس شہر میں میرا طویل قیام کا ارادہ تھا مگر ہم یوں ملے جیسے آخری بار جدا ہورہے ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد میں نے سگریٹ سلگایا اور گیسٹ ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ میرا رخ اہرام کی جانب تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر گیسٹ ہاؤس کو خاموش نظروں سے الوداع کہا۔ سنگ لاجورد کے اس دل کو جیب سے نکالا اور بے اختیار ہوکر اسے چومنے لگا۔ ایسا میں نے اپنی پوری زندگی کسی چیز یا انسان کو نہیں چوما تھا۔ میری حالت ایسی کیوں تھی مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

آپ جو میری یہ کہانی پڑھ رہے ہیں یقیناً سمجھ رہے ہوں گے کہ میرا دماغ کام کرنا چھوڑ رہا ہے اور میں زندگی سے نکل رہا ہوں اس دنیا سے نکل رہا ہوں مگر ایسا نہیں تھا۔ آخری تاریخوں کا تھکا تھکا چاند ابھی کہیں دور دھا۔ جب میں اہرام کے قریب پہنچا تو ایک تاریک گوشے سے ایک دراز قد مقامی شخص ہیولے کی مانند نمودار ہوا۔ یہ یقیناً وہی تھا جو مجھے سنگ لاجورد کا دل تھما گیا تھا۔

عورت

جوانی میں بیوی محبوبہ ہوتی ہے، ادھیڑ عمر میں ساتھی، بڑھاپے میں نرس۔ (فرانس بیکن)

عورت تمہارے سائے کی طرح ہے اس کا پیچھا کروگے تو وہ ہاتھ نہیں آئے گی اور اس سے دور بھاگو گے تو وہ تمہارے پیچھے آئے گی۔ (اچیم فورٹ)

عورت زخم معاف کردیتی ہے لیکن خراشوں کو کبھی نہیں بھولتی (اپیلی برتن)

میرے خیال میں مرد جھوٹ بولنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور عورتیں یقین کرنے کے لئے (گوئٹے)

جو عورت بہت آہستگی سے انکار کرے وہ نیم آمادہ ہوتی ہے (اووڈ)

(مہک مسکان.....چیچہ وطنی)

میں ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا۔

اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ چھوا۔ ''میرے پیچھے آؤ.....'' اس نے سرگوشی کی اور ایک اندھیرے گوشے کی طرف چل پڑا۔

میں بے اختیار اس کے پیچھے تھا۔ اچانک ایک تبدیلی ہوئی میرے اندر کا جدید آدمی بیدار ہوگیا۔ میں ایک دم رک گیا اور چیخ کر پوچھا۔ ''کون ہو تم!۔۔۔ تم مجھے کہاں لے جارہے ہو.....؟

جواب میں ایک ریشمی رومال میرے سر پر آگرا اور سختی سے کھینچ گیا تاکہ میں چیخ نہ سکوں مگر اتنا خیال رکھا کہ میرا سانس بھی نہ رکے۔ کوئی تھا جو دبے پاؤں میرے پیچھے چل رہا تھا۔ میں نے مزاحمت کی تو کسی نے مجھے آہنی ہاتھوں میں دبوچ کر اوپر اٹھایا اور کندھے پر لاد لیا۔ پھر مجھے کسی نرم چیز پر بٹھا دیا گیا۔ مجھے احساس ہو کہ وہ اونٹ کی پیٹھ تھی کیونکہ وہ جانور بے ترتیب سا اوپر اٹھا، بلند ہوا اور پھر تیزی سے چل پڑا۔ میرے اندر جتنی تیزی سے بغاوت ابھری تھی اتنی ہی تیزی سے ڈوب گئی۔ میں مطمئن ہو گیا اور میرا جوش ختم ہوگیا۔ اب میرے بندھن غیر ضروری تھے۔ کوئی مجھے پکار رہا تھا اور میری روح جواب دے رہی تھی۔

کافی دیر تک وہ اونٹ بلا رکے تیزی سے بھاگتا رہا۔ میرے چاروں طرف خاموشی تھی۔ پھر کچھ دور آوازیں سنائی دیں اور اونٹ کی رفتار دھیمی پڑھنے لگی حتیٰ کہ وہ رک گیا۔ کسی نے بے معنی آواز نکالی اور اونٹ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ کسی نے مجھے گھسیٹ کر نیچے اتار لیا اور کسی نرم معطر گدے پر پھینک دیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اسے گدے سے اٹھا کر اپنے قدموں پر کھڑا کر دیا گیا۔ کچھ دیر میں یونہی کھڑا رہا پھر کسی نے آگے دھکیلا اور میں ایک راہ داری میں چلنے لگا۔ میرے قدموں کے نیچے سنگ مرمر کا فرش تھا۔ فوارے چلنے کی آواز آرہی تھی اور ہوا میں آگ کے جلنے کی مہک تھی۔ مجھے ایک ستون کے ساتھ کھڑا کر کے باندھ دیا گیا۔ میرے سر سے رومال بھی ہٹا دیا گیا مگر میری آنکھیں ابھی کچھ صاف صاف دیکھنے سے قاصر تھیں۔ دھیرے دھیرے جب نظر ٹھہری تو میں نے دیکھا میرے سامنے تھوڑی دور ایک پرتعیش، شاندار دیوان پڑا تھا جس پر ایک نوجوان عورت بیٹھی تھی۔

اگر میں اس کا حسین سراپا بیان کرنا شروع کروں تو شاید میرے الفاظ اور یہ صفحات بھی کم پڑ جائیں۔ میرا قلم اس کے ملکوتی حسن کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ خوابوں کی پری جیسی خواب آگیں تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں اپنی زندگی کے تشنہ خواب نظر آئے۔

وہ دھیرے سے مسکرائی۔ ایک بل کھا کر دیوان سے اٹھی تو یوں جیسے شام اودھ چھا گئی ہو۔ اس نے اپنے پہلو میں رکھا ہیروں سے مزین ایک خنجر اٹھایا اور میری طرف بڑھی۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا سانس سینے میں اٹکتی محسوس ہوئی۔ قریب آکر وہ جھکی اور اس خنجر سے میری بندشیں کاٹ ڈالیں۔ وہ کسی عرب شاعر کے تخیل کا مجسم شاہ کار دکھائی دے رہی تھی۔ پھر اس نے وہ خنجر میرے ہاتھ میں تھما دیا اور بولی۔ ''میری یہ زندگی تمہاری امانت ہے لے لو اسے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سینے سے یوں پلو ہٹایا جیسے مجھے دعوت دے رہی ہو کہ میں اس کے دل پر خنجر کا وار کروں۔ میرا ہاتھ کپکپایا۔ کوئی طاقت مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں یہ منقش دستے والا خنجر اس کے گداز سینے میں پیوست کر دوں۔ ایک دوسری طاقت نے یوں جیسے میرے ہاتھ کو مفلوج کر دیا تھا۔ اسی کشمکش میں خنجر میرے ہاتھ سے سنگ مرمر کے فرش پر گر پڑا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر بے اختیار ہو کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کے حسین، نرم اور لذت آفرین ہونٹوں پر جھک گیا۔ ایک ہزار اور ایک واں بوسہ۔

یہاں سائمن کی تحریر ختم ہوگئی۔

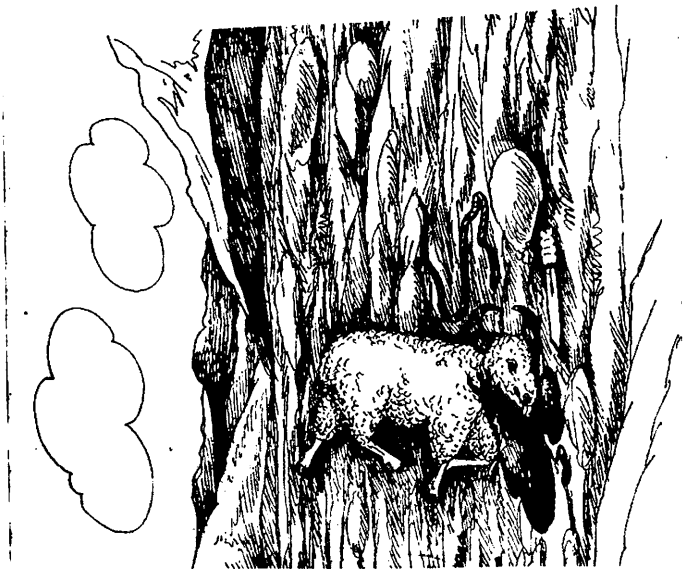

آسیبی میمنا

حافظہ مون بخاری-سرگودھا

لڑکے کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے سوکھے پتے جوتوں تلے آکر چرمرانے لگے اور شام کی سرخی رفتہ رفتہ سیاہی میں بدل رہی تھی کہ اتنے میں زبردست چیخ سنائی دی تو.....

ڈراؤنی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ناقابل یقین برسوں یاد رہنے والی کہانی

حامد بکریوں کے ریوڑ کو ہانکتا ہوا واپسی کے لئے روانہ ہوا وہ اکثر بکریوں کو چرانے کے لئے قبرستان سے ملحق جنگل کا رخ کرتا تھا۔

آج اسے کچھ دیر ہوگئی تھی۔ وہ ذرا سا پریشان تھا کیوں کہ شام گہری ہوتی جارہی تھی۔ اور سورج کی زردی گھل گھل کر افق کے رخ پر غازہ مل رہی تھی۔

اس کی بوڑھی ماں ہمیشہ اسے یہ تاکید کرتی کہ جنگل کی طرف نہ جانا مگر وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتا۔

حامد غریب گھر کا لڑکا تھا اور ان کی گزر اوقات بکریوں کے دودھ کی فروخت پر ہوتی تھی، اس کی ماں اس کے لئے عدم تحفظ کا شکار تھی۔

وہ اکلوتا تھا۔ اسی وجہ سے ماں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اسے گھر لوٹنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ بے چین ہو اٹھتی۔ اور گھر پہنچنے پر حامد سے جھگڑتی وہ ہنس کر کہتا۔

''میں میں کوئی بچہ تھوڑی ہوں جو تو پریشان ہو جاتی ہے۔ اب تو میں بیس برس کا ہو چکا ہوں اور اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں..... تو خواہ مخواہ وہم کرتی ہے۔''

وہ جواباً خفگی سے کہتی۔

"کیسے نہ وہم کروں..... تو میری کل کمائی ہے۔ چھوٹا سا تھا تو جب تیرا باپ فوت ہو گیا..... تو اس کی نشانی اور میرے بڑھاپے کا سہارا ہے۔"

پھر وہ "معافی" مانگنے کے انداز میں ہاتھ جوڑتا اور ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا۔ تو وہ ہنس دیتیں۔

بس یہی سادہ سی زندگی تھی..... جس میں شب و روز کٹ رہے تھے۔ گاؤں کے لوگ اس جنگل کی طرف آنے سے کتراتے تھے۔ بڑے سے بڑا اجی دار بھی یہاں آنے سے احتراز کرتا۔ کیوں کہ ان کے مطابق یہ جنگل آسیب زدہ تھا۔ حامد نے کبھی کان نہ دھرے تھے۔

وہ بھری دوپہروں اور گہری شاموں میں اکثر ریوڑ لے کر یہاں کا رخ کرتا۔ اسے آج تک کوئی غیر معمولی شے اپنے وجود کا احساس نہ دلا سکی۔

مگر آج کی بات علیحدہ تھی۔

جانے کیوں اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

پیشانی پر پسینے کے ننھے قطرے پھوٹ پڑے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی "چھڑی" سے ادھر ادھر گھاس چرتی بکریوں کو ہانکا اور ہوکا لگایا۔

اس کا "ہوکا" اتنا زوردار تھا کہ دیو قامت درختوں پر شور مچاتے پرندے حواس باختہ ہو کر آسمان پر اڑنے لگے۔ ایک بار تو وہ خود بھی حیران رہ گیا شاید وہ اپنا خوف ختم کرنے کے لئے اتنا زور آور "ہوکا" لگا بیٹھا تھا۔

درختوں کی شاخیں زمین پر جھول رہی تھیں۔ اور کیڑے مکوڑے قطاریں باندھے زیرِ زمین کے گئے سوراخوں میں گھس رہے تھے۔

اچانک "تراخ" کی آواز پر وہ پلٹا۔ ایک بوسیدہ سی کھوپڑی اس سے ڈھائی فٹ کے فاصلے پر گری تھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے زمین پر پڑے سوکھے پتے۔ جوتوں تلے آخر چرمرانے لگے۔ اب تو شام کی سرخی بھی رفتہ رفتہ سیاہی میں بدل رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا بکریوں کا ریوڑ بھی کچھ سہما ہوا ہے۔ تا آنکہ ایک زوردار "دھاڑ" فضا میں گونجی۔ وار بکریوں کی "میں، میں" شمع فراشی کا باعث بننے لگی۔ حامد کا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

وہ اس کے سوا کچھ نہ کر سکتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے نکل لے۔ مگر جنگل شیطان کی آنت کی مانند لمبا ہو گیا۔

وہ زیرِ لب قرآنی آیات کا ورد کرتا ہوا محوِ سفر رہا۔

جیسے ہی قبرستان دکھائی دیا۔ اسے کچھ اطمینان حاصل ہوا۔ دراصل یہ عیسائیوں کا قبرستان تھا۔ ہر قبر پر کتبے کے ساتھ "صلیب" گڑی تھی۔

اس کے اطمینان کی وجہ یہ تھی کہ گاؤں کا فاصلہ کم رہ گیا تھا۔ وہ قبروں کے بیچوں بیچ سے ہوتا ہوا ریوڑ کو چھڑی کے زور پر ہانکے جا رہا تھا۔ کہ اسے اپنی پشت پر آواز سنائی دی۔

"او بھائی..... اپنا یہ میمنا تو لے لو۔"

حامد نے ناچاہتے ہوئے بھی مڑ کر دیکھا۔

اس کے پیچھے کالے چوغے میں ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ آدمی کے گلے میں "سنہری صلیب" لٹک رہی تھی۔ اور ہاتھوں میں نرم سا سفید میمنا" تھا۔

حامد نے خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کیا اور بمشکل بولا۔ "جناب..... یہ میرا میمنا نہیں ہے۔"

آدمی کے چہرے پر ناگواری اور کرختگی کے ملے جلے تاثرات تھے۔

"مگر میں نے خود دیکھا ہے یہ تمہارے ریوڑ میں شامل تھا۔"

حامد عاجز ہو کر منت آمیزی سے بولا۔

"جناب آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے..... میرے ریوڑ کی سب بکریاں دھاری دار گہرے رنگوں کی ہیں۔ جب کہ یہ میمنا۔"

لمبے تڑنگے آدمی نے درشتگی سے حامد کی بات کاٹی۔

"جب کہ یہ میمنا تمہاری بکریوں سے مشابہت نہیں رکھتا۔ یہی کہنا چاہ رہے ہو ناں تم۔"

"جی ہاں..... بالکل جناب....."

حامد نے جلدی سے سر ہلا کر آگے بڑھنا چاہا۔

"رکو۔"

آدمی کے انداز میں تحکم تھا۔

حامد نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ آدمی سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے..... تم ایک نافرمان لڑکے ہو..... جسے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے..... بہت نادان ہو..... خیر یہ میمنا تو تم کو اپنے ساتھ لے جانا پڑے گا خواہ تم اس کے مالک ہو یا نہیں....."

حامد کو محسوس ہوا یہ آدمی اسے یوں نہیں جانے دے گا۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ تاہم اس نے آخری کوشش کی۔

اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر مودب ہو کر بولا۔

"جناب..... میری ماں نے مجھے نصیحت کی ہے کہ ہمیشہ ایمان داری سے کام لو..... اگر میں یہ میمنا رکھ لوں تو اس کا اصل مالک پریشان ہوگا..... میں اپنی ماں کو ناراض نہیں کرسکتا۔ لہٰذا میں یہ میمنا اپنی ملکیت میں لینے سے قاصر ہوں..... حضور میری معذرت قبول کریں اور مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔"

وہ آدمی طنزیہ ہنسی ہنسا۔

"یہی سمجھ لو کہ یہ تمہاری ایمان داری کا انعام ہے، مجھے کچھ اور نہیں سننا تم یہ میمنا رکھ رہے ہو۔"

یہ کہہ کر آدمی نے زبردست قوت کا استعمال کرتے ہوئے دھونس کے ساتھ میمنا، اس کے بازوؤں میں جکڑ دیا۔

آدمی کے چونغے سے اٹھتی اگربتیوں اور کافور کی تیز سوگوار مہک حامد کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ ایک عجیب احساس میں گھیرا رہ گیا۔

حامد نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے۔ مگر آدمی نے ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنے سے روک دیا۔

"بس اب تم جاسکتے ہو۔"

حامد نے ناچار بازوؤں میں پڑے "میمنے" کو بے بسی سے دیکھا اور اسے ایک بازو پر منتقل کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے چھڑی اٹھا کر "منتشر" ریوڑ کو اکٹھا کیا۔

اس کے منہ سے "آں" نکلی۔

قبرستان نہایت طویل تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

وہ سیاہ چوغے والا آدمی فتح کے نشے میں چور کھڑا تھا۔ اور حامد کو دیکھتے دھواں بن کر تحلیل ہوگیا۔ سست روی سے چلتے حامد کو جھرجھری آگئی۔ وہ سخت حیران تھا۔

خوف دو آتشہ ہوگیا۔

وہ جلد از جلد قبرستان کا راستہ کاٹ رہا تھا۔ کہ اسے اپنے بازوؤں پر غیر معمولی بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اس کی نظر میمنے پر پڑی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل کانپ گیا۔ کہ میمنے کی ٹانگیں گز گز بھر ہو کر زمین کو چھونے لگی تھیں۔

حامد نے خوف زدہ ہو کر میمنے کو نیچے پٹخنا چاہا۔

مگر "میمنا" مقناطیس کی طرح چپکا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

حامد کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اپنے بستر پر پایا۔

گزشتہ واقعات کو یاد کرتے ہوئے اس کا سر دکھنے لگا۔

اسے ہوش میں آتا دیکھ کر "ماں" لپک کر پاس آئی۔

"کیا ہوا تجھے..... ویسے مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے..... پھر بھی....."

حامد نے شرمندگی سے دریافت کیا۔

"پہلے تو بتا ناں ماں..... مجھے گھر کون لایا؟"

حامد کی ماں کا جی چاہا اسے ایک دو تھپڑ جڑ دے مگر وہ ضبط کرگئی۔

"جب تو کافی دیر گھر نہ لوٹا تو مجھے تشویش ہوگئی تھی میں نے محلے والوں کی منت سماجت کر کے انہیں جنگل جانے کا کہا تھا۔ جب سب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ تو بے ہوش پڑا ہے..... میں تجھے منع کرتی تھی ناں..... مگر تو نے میری سنی ان سنی کردی..... شکر کر خدا کا جس نے تجھے زندگی دی۔"

حامد نے نادم ہو کر ساری روداد سنائی اور آئندہ جنگل کی طرف جانے سے توبہ کرلی۔

موت کی سرگوشی

مظہر الحق علوی

قسط نمبر 9

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی جسم و جاں پر کپکپی طاری کرتی اور روح کو دہلا دینے والی کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو تحیر کے سمندر میں غوطہ زن کرکے رکھ دے گی صدیوں بعد ہارر کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے تحفۂ خاص

ایک ایسے.....شخص کی داستان حیرت جو مرنے کے بعد تابوت..... سے نکل آیا تھا

نینا اپنے زمانے کی چھٹی ہوئی عیار اور اول درجہ کی دھوکے باز عورت تھی چنانچہ اس نے اپنے کرتوتوں کی پردہ پوشی کے لئے جیدو کو محبت بھرے خط لکھے جس میں شہد کے سے میٹھے الفاظ اور دیوانہ بنا دینے والے وعدے وعید تھے کہ اس بیوقوف کو ذرہ برابر بھی شک نہ ہوا اور نہ ہی اس کے دل میں رشک و رقابت کی آگ بھڑک اٹھے اور یہ خطوط اس نے اس عیار ساحرہ نے اس وقت لکھے جبکہا دھر وہ مجھے اپنا شوہر بنانا قبول کر چکی تھی۔ مجھے! میرے خدا! کیسا رقص ابلیس اور رقص موت تھا یہ!

''.....آپ کا تمام قرض۔ ایک ایک پائی میں مع سود ادا کردوں گا اور اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ آپ کے دل میں میری عزت اور بھی بڑھ جائے گی۔''

شاید جیدو صاحب۔ جب میں اپنا ''تمام قرض'' وصول کرلوں گا اس کے بعد شاید میں تمہارے متعلق ہمدردی سے سوچوں گا، تب تک تو بے شک نہیں اور تم نہیں جانتے جیدو میرا کتنا بھاری قرض ہے تمہارے سر پر جو تمہیں ادا کرنا ہے۔

میں سنجیدگی سے مسکرایا۔ چند منٹوں تک سوچتا رہا اور پھر قلم دوات لے کر بیٹھ گیا اور جیدو کو ایک خط لکھا جو یوں تھا۔

''کاروامیکو!

خط ملا، مسرت ہوئی اور یہ معلوم کرکے خوشی حاصل ہوئی کہ قسمت آپ پر کھل کر مسکرائی ہے اور آپ کو امیر بنا دیا ہے اور یہ پڑھ کر تو خوشی دوبالا ہوگئی کہ آپ بہت جلد واپس آنے والے ہیں۔ آپ اپنی فوری اور بلا اطلاع آمد سے کونٹس کو اچنبھے میں ڈالنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ آپ کی خواہش میری خواہش ہے۔ میں کونٹس سے آپ کے اس خط کا ذکر نہ کروں گا اور انہیں بے خبر رکھوں گا۔

لیکن اس کے بدلے میں بھی ایک درخواست کررہا ہوں جو آپ امید ہے قبول کریں گے۔

جب سے آپ یہاں سے گئے ہیں ہماری زندگی سخت بے رنگ اور بیزار کن گزری ہے جس کو ہم دوبارہ رنگین اور دلچسپ بنائیں گے۔ آپ کی آمد پر 24 دسمبر کو کرسمس کی سام ہے اور اس رات آپ کی آمد کی خوشی میں اور آپ کے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دے رہا ہوں جس میں صرف ہمارے دوست شریک ہوں گے۔ چنانچہ آپ سے میری درخواست ہے کہ آپ اسی دن یعنی 24 دسمبر کو بہر حال واپس آجائیں کہ یہ

آپ کی مجھ پر بڑی مہربانی ہوگی اور نیپلز پہنچتے ہی سیدھے میرے ہوٹل چلے آئیں کہ سب سے پہلے آپ کو مبارکباد دینے کا فخر مجھے حاصل ہو اور میں آپ کا ایسا استقبال کرنے اور آپ کا ایسا استقبال کروں گا جس کے آپ بجا طور پر مستحق ہیں۔

میرے اس خط کا جواب تار سے دیجئے گا اور بتایئے کہ کون سی ٹرین سے آرہے ہیں اور میں اپنی بگھی اسٹیشن پر بھیج دوں گا۔ بیشک رات کے کھانے کا وقت آپ کی مرضی سے اور آپ کی سہولت کے مطابق طے کیا جائے گا۔ آٹھ بجے کا وقت ٹھیک رہے گا؟

کھانے سے فارغ ہو کر آپ جب چاہیں ویلا رومانی چلے جائیں اور اپنی اچانک اور خلاف توقع آمد سے کوشس کو حیرت میں ڈالدیں اور ان کی حیرت سے جتنا جی چاہیں لطف اٹھائیں۔

امید ہے کہ آپ اس بوڑھے کی اس من کی موج کا احترام کرتے ہوئے درخواست نہ ٹھکرائیں گے۔

فی الحال آپ کا اپنا

سیرزولا دیہ

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ خط میں نے ٹیڑے میڑھے حروف اور بگڑی ہوئی تحریر میں لکھا کہ یہ میرے بہروپ کا ایک حصہ تھا۔ میں نے خط تہہ کر کے لفافے میں رکھا، لفافہ بند کر کے اس پر پتہ لکھا اور ونسانزو کو بلا کر ہوالہ ڈاک کرنے کے لئے خط اسے دیا۔

ونسانزو خط لے کر چلا گیا تو میں میز پر بیٹھ گیا۔ جس پر دیر سے ناشتہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اب میں نے ناشتہ کیا تو لقمہ حلق سے نیچے نہ اتر رہا تھا۔ دل پر جبر اور کوشش کر کے چند لقمے زہر مار کئے۔

میرے خیالات باگیں تڑا کر یوں بگٹٹ بھاگ رہے تھے کہ میں کسی اور طرف..... ناشتہ کی طرف بھی متوجہ ہو ہی نہ سکتا تھا۔

میں نے اپنی انگلیوں پر دن شمار کئے۔ چار..... صرف چار دن باقی تھے میرے اور..... کاہے کے درمیان؟

ایک بات تو بہر حال یقینی تھی۔ مجھے اپنی بیوی سے..... بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ اپنی منگیتر سے اسی دن ملنا تھا۔

اور اب میں اس بات پر غور کرنے لگا کہ جس شام نینے نے مجھ سے اقرار محبت کیا تھا تب سے اب تک ہماری محبت بلکہ یوں کہئے کہ ''کورٹ شپ'' میں کتنی ترقی ہوئی تھی۔ میں روزانہ نہیں بلکہ اکثر اس کے پاس جاتا رہا تھا۔ اور اس کا رویہ کبھی پرستشانہ ہوتا، کبھی مشفقانہ، کبھی دلدارانہ اور کبھی وہ محبت میں بے خود ہو جاتی اور جب اس کی یہ آخری حالت ہوتی تو میں اسے آگے قدم بڑھانے سے بڑی صفت سے روک دیتا وہاں سے کسی نہ کسی طرح ٹل جاتا۔ ہر چند کہ بہت کچھ برداشت کر سکتا تھا لیکن نینا کی یہ بناوٹ، یہ جھوٹی محبت کا اظہار اور مصنوعی لگاوٹ میرے دل میں غصے اور نفرت کا شدید جذبہ بیدار کر دیتی تھی کہ مجھے یہ خوف ہونے لگتا تھا کہ کہیں میرا دبا ہوا اور اندر ہی اندر کھولتا ہوا غصہ پھٹ نہ پڑے اور میں اس عیار عورت کی گردن مروڑ دوں یا سر کچل دوں۔ جس طرح کہ لوگ زہریلی ناگن کا سر کچل دیتے ہیں۔ اور یہ میں چاہتا نہ تھا۔ کیونکہ نینا جیسی عورت کے لئے ایسی موت آسان اور رحم دلانہ ہوگی۔

چنانچہ میں اپنے عشق کا اظہار بوس و کنار سے نہیں بلکہ قیمتی تحفے تحائف سے کر رہا تھا اور میں یا اور کوئی اسے جو کچھ بھی دیتا تھا۔ اسے قبول کرنے کے لئے اس لالچی عورت کا ہاتھ ہمیشہ بڑھا رہتا تھا۔ نایاب ہیرے سے لے کر معمولی سے پھول تک..... ہر چیز وہ قبول کر لیتی۔ کوئی چیز لینے سے اس نے کبھی انکار نہ کیا۔ لالچ، جھوٹی شان اور نمائش اس کی فطری اور زبردست کمزوریاں تھیں۔ کارمیلو یزی کے خزانے کے نظر خیرہ کر دینے والے جواہرات، زیورات جو میں نے خاص نینا کے لئے بنوائے تھے، خوبصورت جھالروں والے اور کڑھے ہوئے رومال، ریشمی اور قیمتی لباس، حرارت کانے سے حاصل کئے ہوئے رنگ برنگ پھولوں کے گلدستے اور مٹھائیوں کے بکس..... غرض جو بھی میں نے

اسے دیا۔ اس نے آنکھوں میں حریصانہ چمک اور ہونٹوں پر فتح مندانہ مسکراہٹ کے ساتھ قبول کرلیا اور مجھ پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں اسے جو کچھ دے رہا تھا اس کی وہ بجا طور پر حقدار تھی اور اگر میں اس عورت سے واقف نہ ہوتا تو بے شک اس کے اس ''بجا حق'' کو تسلیم کرلیتا۔

اس دن میں ین ویلا رومانی کے لئے روانہ ہونے میں دوسری دفعہ نہ سوچا۔

ایک لمحے کی بھی تاخیر کئے بغیر میں اپنی بگھی میں سوار ویال رومانی کی طرف جارہا تھا اور ہر دفعہ کی طرح اس دفعہ بھی میں اپنی پچھلی بیوی اور حالیہ منگیتر کے لئے محبت کا ایک تحفہ ساتھ لئے جارہا تھا اور یہ بنفشی پھولوں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری تھی جو بنی ہوئی تو بید کی تھی۔ لیکن اس پر سونے کا پترچڑھا ہوا تھا۔ ان کی بھینی بھینی خوشبو نے مجھے وہ صبح یاد دلادی۔ جب اسٹیلا پیدا ہوئی تھی اور وہ ساتھ ہی مجھے وہ الفاظ یاد آگئے جو اس وقت جیدو فیراری نے کہے تھے۔ اس وقت اس کے الفاظ مجھے کس قدر پراسرار معلوم ہوئے تھے لیکن اب..... ان کے معنی کس قدر صاف تھے۔

ویلا رومانی پہنچا تو اپنی منگیتر کو اس کی ''خلوت گاہ'' میں پایا۔ اس نے کشمیری سلک کا سفید لبادہ پہن رکھا تھا جس کے کنارے زمین پر لوٹ رہے تھے اور جس میں بہت باریک کام ہلکے فالسئی رنگ کا گوٹا ٹنکا ہوا تھا۔ اس کے گھنے بال ریشمی ڈھیر کی طرح اس کے شانوں پر پڑے ہوئے تھے اور وہ ایک گدی دار آرام کرسی میں آتش دان کے قریب بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

وہ بے فکری اور اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی لیکن جیسے ہی ملازمہ نے میری آمد کی اطلاع دی وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مخصوص ساحرانہ انداز سے میرے استقبال کو آگے بڑھی لیکن انداز شاہانہ تھا جیسے حکمران اپنی رعایا کے سامنے جاتا ہے۔

چونکہ ملازمہ وہیں منڈلا رہی تھی۔ اس لئے میں نے رسمی الفاظ کے ساتھ اور بے قدرے تکلف سے وہ تحفہ پیش کیا جو لایا تھا اور پھر بے حد نیچی آواز میں کہا۔

''ایک بے حد! اہم خبر لے کر آیا ہوں۔ تنہائی میں بات کرسکتا ہوں تم سے؟''

وہ آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر مسکرائی، بڑے نازک انداز سے مجھے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور ملازمہ سے کہا۔

''تم جاسکتی ہو۔''

ملازمہ نے باہر نکل کر دروازہ بند کیا ہی تھا کہ میں نے جیسے بے صبری سے فوراً ہی بولنا شروع کردیا اور اس سے پہلے کہ آتشدان کے قریب اپنی کرسی میں بیٹھتی میں نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

''سگنور فیراری کا خط آیا ہے..... ابھی ابھی۔''

وہ ذرا چونکی ضرور لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ صرف اپنا سر جھکا کر بھوئیں سوالیہ انداز میں یوں اچکائیں جیسے کہہ رہی ہو۔

''اچھا! لیکن اس سے مجھے کیا واسطہ؟''

میں ایک منٹ خاموش رہا، غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا اور پھر کہا۔

''دو تین دنوں میں ہی وہ واپس آرہا ہے اور اس نے بڑے وثوق سے لکھا ہے۔'' اور یہاں میں مسکرایا۔ ''کہ اسے یقین ہے کہ تم اسے دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔''

اس دفعہ اس نے اپنی کرسی میں نہ صرف بے چینی سے پہلو بدلا بلکہ ذرا کھڑی بھی ہوگئی، اس کے ہونٹ بھی ذرا کپکپائے جیسے وہ بولنے جارہی ہو لیکن پھر وہ خاموش رہی، وہ ایک بار پھر بیٹھ گئی اور میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی جیسے مردے کے چہرے پر ہوتی ہے۔

میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اگر تمہیں خوف ہے کہ ہماری منگنی کی خبر سن کر وہ مارے حسد یا غصے کے ایک طوفان اٹھادے گا اور انتہائی مایوسی سے یا خود غرضی کی بنا پر تمہارے ساتھ گستاخی کر گزرے گا تو تم میری مانو اور چند دنوں کے لئے نیپلز سے باہر اپنے کسی دوست یا سہیلی کے یہاں

چلی جاؤ اور جب سگنور فیراری کا غصہ اور بے چینی ذرا کم ہو جائے تو واپس لوٹ آنا۔ کیا خیال ہے؟''

چند جانیوں تک وہ سر جھکائے کچھ سوچتی رہی پھر اس نے نظریں اٹھائیں تو اس کی آنکھوں میں فکر مندی تھی اور اطاعت بھی۔

''جیسا تم کہو سینزر'' وہ بولی۔ سگنور فیراری معلوب الغضب جسم کے آدمی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ بے حد گستاخ اور بے دھڑک بھی ہیں۔ غصے میں آگے پیچھے سوچتے ہی نہیں اور جو جی میں آتا ہے کر گزرتے ہیں۔ بے حد خطرناک قسم کے آدمی ہیں۔ لیکن سینزر! تمہیں میری فکر ہے اور اپنی فکر نہیں؟''

''مجھے! مجھے کیا فکر ہو سکتی ہے۔''

''سگنور فیراری کی طرف سے تمہیں بھی تو اتنا ہی خطرہ ہو سکتا ہے جتنا کہ مجھے۔ سب کچھ معلوم ہو جانے کے بعد وہ بے شک وشبہ تمہارے ساتھ بھی گستاخی کریں گے۔ سخت تو ہیں کریں گے تمہاری عزت کے ٹکڑے کر دیں گے۔ تم جانو سینزر! اس شخص سے کچھ بعید نہیں۔''

''میں ہوشیار رہوں گا اور تم جانو کہ میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔

''اس کے علاوہ میں اس کی تمام گستاخیوں اور غصے کو نظر انداز کر سکتا ہوں۔ کیونکہ اس کا یہ غصہ ظاہر ہے کہ فطریا ورحق بجانب ہوگا۔ تمہارا پیار اور محبت حاصل کرنے کی اور تمہیں فتح کرنے کی تمام امیدیں منہ کے بل گریں گی تو ظاہر ہے کہ وہ دیوانہ ہو جائے گا۔ ایسی مایوسی کو بھی پاگل کر سکتی ہے۔ بے چارہ فیراری'' اور میں نے جیدو کی بدقسمتی پر بظاہر ترس کھاتے ہوئے سر ہلایا۔

''ارے ہاں۔ سگنور فیراری کا کہنا ہے کہ انہیں تمہارے کئی خط ملے ہیں؟''

یہ سوال میں نے بڑی بے تعلقی سے پوچھا تھا لیکن وہ گڑبڑا گئی۔ اور اب وہ گھبرائی ہوئی خوفزدہ سی بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت اور وحشت تھی لیکن میرا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولی۔

''جی ہاں۔ ایک دو دفعہ لکھے تھے۔ میرے شوہر کے کاروباری معاملات کے سلسلے میں لکھنے پڑے تھے۔ کیا کرتی میرے شوہر انہیں اپنا ٹرسٹی جو بنا گئے تھے..... میرا مطلب ہے کہ اگر ان کا انتقال ہو جائے تو سچ کہتی ہوں سینزر میرے مرحوم شوہر میرے حق میں بہت برا کر گئے۔ اس طرح سگنور فیراری کو مجھ پر اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ حقیقت میں ان کے پاس میرا کوئی خط نہیں ہے اور پھر انہوں نے اس سلسلے میں مبالغے سے کام لیا ہے۔ میں نے بہت سے دو تین خط لکھے ہوں گے لیکن انہوں نے اس دو تین دفعہ کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ یہ ان کی فطرت ہے۔''

یہ آخری بات بلاشبہ سوالیہ انداز میں مجھ سے ہی کہی تھی لیکن میں نے جیسے بے پروائی سے اسے نظر انداز کر دیا اور اپنے اصل موضوع کی طرف واپس آ گیا۔

''تو اب کیا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہیں رہو گی یا چند دنوں کے لئے یہاں سے چلی جاؤ گی؟''

''تمہاری اجازت ہو تو میں اس کانوینٹ میں چلی جاؤں جہاں میں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ کانوینٹ یہاں سے کوئی آٹھ دس میل دور ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ میں لگے ہاتھوں وہاں ''ری ٹریٹ (اعتکاف جو عیسائی کرتے ہیں یعنی ایک مخصوص مدت کے لئے گوشہ نشین ہو جاتے اور مکمل خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ یعنی اس عرصہ میں بالکل بھی نہیں بولتے) بھی کر لوں گی۔'' (اور یہاں اس کے خوبصورت بشرے سے ایسی پاکبازی اور تقدس کا اظہار ہوا کہ اس میں خود بھی گھڑی بھر کے لئے دھوکا کھا گیا) دوسری شادی کرنے سے پہلے یکسوئی سے عبارت کر لوں تو مجھے قرار آ جائے۔ کانوینٹ کی نیس مجھے دیکھ کر خوش ہو جائیں گیا ور یقین ہے کہ تمہیں اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ہے نا ڈیئر؟

''مستقبل کی تیاری کے سلسلے میں یہ پہلا قدم بڑا مبارک رہے گا۔''

میں نے اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے

پکڑے جو میری رانیں سہلا رہے تھے۔ وہ میرے سامنے گھٹنوں کے بل عبادت کرتی ہوئی۔ دلیہ کی طرح جھکی ہوئی تھی۔

''بے شک بڑا مبارک ہوگا۔'' میں نے کرخت آواز میں کہا۔

''مستقبل کی تیاری ابتدا میں مقدس رسم سے ہونی چاہئے کیونکہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ کیا ہونا چاہئے اور نہ تم کہہ سکتی ہو اور نہ میں کہ خوشگوار زندگی ہماری منتظر ہے۔''

زندہ رہے تو دنیا اور مر گئے تو عقبیٰ اس عبادت سے سدھر جائے گی۔ جان من! میں تمہارے اس جذبے اور مذہبی جوش کی قدر کرتا ہوں۔ بے سک کانوینٹ میں ہی چلی جاؤ۔ جب ہمارے دوست سگنور فیراری کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور دیوانگی کا دورہ بھی گزر جائے گا تو میں تمہارے پاس وہیں، کانوینٹ میں آجاؤں گا اور ہاں ''ری ٹریٹ'' بھی ضرور کر لینا اور اپنے مرحوم شوہر کی مغفرت کی اور۔ ہاں۔ میرے لئے بھی دعا کرنا۔ ایسی بے غرضانہ دعائیں جو خلوص سے کی گئی ہوں اور متہارے جیسے ہونٹوں سے نکلی ہوں، فوراً قبول ہو جاتی ہیں۔ رہا ہمارا جوان دوست جیدو تو تم اس کی طرف سے بے فکر رہو۔ اس کا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ بھی وہ تمہیں پریشان نہ کرے گا۔

''تم اسے نہیں جانتے پیارے۔'' اس نے میرے ہاتھ چوم کر کہا۔ ''میں جانتی ہوں۔ وہ بہت پریشان کرے گا تمہیں۔''

''میں اسے خاموش کرنا جانتا ہوں۔'' میں نے اسے چھوڑ دیا۔

اور اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ نازک اور خوب صورت، ہوا کے جھونکوں سے جھومتی ہوئی سوسنی ہو جیسے۔ ''ظاہر ہے کہ تم نے اسے کوئی جھوٹی امید نہیں دلائی نہ ہی دھوکے میں رکھا۔ چنانچہ اس کے پاس شکایت کی وجہ نہیں ہے۔''

''یہ سچ ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بلا جھجک جواب دیا۔ ''لیکن تم جانو میں ذرا ذرا سی بات میں گھبرا جاتی ہوں۔ خیر! تو بتاؤ اب کب روانہ وجاؤں کانوینٹ کے لئے؟''

میں نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔

''میا بیلا! جب جی چاہے چلی جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی میں تمہاری مجازی خدا نہیں بنا ہوں کہ تم میری اسی فرمانبردار بنی جا رہی ہو۔ بہرحال میں تمہاری فرمانبرداری سے خوش ضرور ہوا۔''

''تو پھر میں آج ہی چلی جاؤں گی کیونکہ میرا دل کہتا ہے کہ جیدو خلاف توقع بہت جلد یہاں ٹپک پڑے گا اور پھر جو طوفان اٹھے گا اس کے تو تصور سے بھی میرا کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ ٹھیک ہے۔''

اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''میں آج ہی چلی جاؤں گی۔''

اور میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اس صورت میں مجھے چلنا چاہئے۔ کیونکہ تمہیں سفر کی تیاری کرنی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تمہارا یہ فیصلہ پسند آیا۔ ہاں۔ وہاں جاتے ہی مدر سوپیریر Mother Supperior کانوینٹ کی اعلیٰ منتظمہ یعنی نن ہوتی ہے۔ لیکن ''مدر'' یعنی ماں کہلاتی ہے) کو بتا دیاں کہ میں تمہارا منگیتر اور ہونے والا شوہر ہوں۔ اس کے بعد تو، میں جب بھی آؤں گا، وہ مجھے تم سے ملنے دیں گی نا؟''

''بے شک۔ بہت بھلی ہیں کانوینٹ کی نن میں اور مجھ پر تو شروع سے ہی مہربان ہیں۔ میں ان کی چہیتی طالب علم تھی۔''

''ضرور ہوگی۔ خیر تو تم وہاں ری ٹریٹ بھی کرو گی؟''

''ضرور کروں گی۔''

''اور میرے لئے دعا بھی کرو گی؟''

اس نے ایک بار پھر اپنے چہرے پر پاکبازی اور تقدس طاری کر کے تارک الدنیا دلیہ کے سے کراہتی یقین سے میری طرف دیکھا۔

''ضرور کروں گی۔'' اس نے خوابناک آواز

میں جواب دیا۔

''شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔''

اور میری آواز گلوگیر تھی۔ تشکر سے نہیں بلکہ نفرت، گھن اور غصے سے۔ کس قدر مکار عورت تھی یہ۔

''اچھا تو میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔''

اور وہ میرے قریب آ گئی۔ اس کا سفید ریشمی لباس اس کے چاروں طرف جیسے نور کا حلقہ ہو اور اس کے بال آتش دان کے شعلوں کی روشنی اور کھڑکی میں سے آتی ہوئی موسم سرما کی ملائم دھوپ میں سنہری تاروں کی طرح چمک رہے تھے اور وہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور معلوم ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی مخمور آنکھیں اوپر اٹھائیں اور ان کا سحر میرے وجود پر طاری ہو گیا اور اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ ذرا سے کھل گئے اور وہ بولی۔

''سیزر! رخصتی بوسہ نہیں لو گے؟''

ایک لمحے کے لئے میری خود اعتمادی ڈانوا ڈول ہو گئی۔ میں بے اختیار ہو گیا۔ اپنے آپ میں نہ رہا اب تو مجھے بہت ٹھیک سے یاد نہیں ہے کہ میں نے کیا کیا۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر بھینچ لیا اور میں اتنا جانتا ہوں کہ دیوانہ وار اس کے ہونٹ، گال اور گردن چومتا رہا اور تب اسی شیطانی دیوانگی میں مجھے جیسا الہام سا ہوا، بجلی کی سی تیزی سے یہ خیال میرے دماغ میں کوند گیا کہ کتنی گندی چیز ہے یہ جسے میں نے بانہوں میں لے رکھا ہے، کتنی ناپاک ہستی ہے یہ جسے میں چوم رہا ہوں اور میں نے ایک دم سے گھبرا کر اسے یوں چھوڑ دیا کہ اگر وہ کرسی کی پشت نہ پکڑ لیتی تو سنبھل نہ سکتی اور گر جاتی۔

جذبات کی گرمی سے اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں، اس کا چہرہ گرم اور سرخ ہو گیا تھا۔ وہ حیرت زدہ تھی لیکن ناخوش نہ تھی۔ نہیں وہ ناراض نہ تھی۔ لیکن میں تھا غضبناک تھا اور غصہ مجھے اپنے آپ پر تھا کہ میں نے ایسی احمقانہ حرکت کی۔

''م۔ م۔ میں معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''میں بھول گیا تھا۔ میں.....''

اس کے ہونٹوں کے کونوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لرزنے لگی۔

''پوری طرح سے معاف کیا۔'' اس نے بے حد نیچی آواز میں کہا۔ ''تمہیں معافی تو نہ مانگنا چاہئے۔''

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور پھر چاندی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ وہ بے تحاشہ ہنس رہی تھی اور اس کی یہ ہنسی تیز چاقو کی طرح میرے دل کے آر پار ہو گئی۔ یہ وہی ہنسی تھی جو اس رات میرے دل کو چیر گئی تھی۔ جس رات میں نے پہلی دفعہ اسے اپنے ہی باغ میں جیدو سے عشق بازی کرتے دیکھا تھا۔ اس رات جب میں اپنے ''نئے جنم'' میں چھپ کر پہلی دفعہ اپنے گھر کے باغ میں پہنچا تھا۔ اس رات اس ہنسی نے جو گویا میرا مذاق اڑا رہی تھی۔ مجھے پاگل سا کر دیا تھا۔

اس دفعہ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں برداشت نہ کر سکا۔ میں لپک کر..... حملہ کرتے ہوئے درندے کی طرح اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کی ہنسی نے یکا یک دم توڑ دیا اور اب وہ وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''سنو!'' میں نے بے چین، تقریباً غصیلی آواز میں کہا۔ ''اس طرح مت ہنسو۔ ایسی ہنسی میرے اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ صدمہ پہنچاتی ہے۔ مجھے تم پوچھو کہ کیوں..... بتاتا ہوں..... بہت پہلے جب میں جوان تھا..... میں نے ایک عورت سے محبت کی تھی..... وہ تمہارے جیسی نہ تھی..... بالکل بھی نہ تھی..... کیونکہ وہ جھوٹی تھی..... اوپر سے نیچے تک جھوٹی تھی..... اس کی ایک ایک بات جھوٹی تھی..... ''سمجھتی ہو نہ تم میری بات کیسی بات میں وہ تم سی نہ تھی۔ لیکن..... وہ مجھ پر ہنسا کرتی تھی..... مذاق اڑاتی تھی میرا..... اس نے م، یری زندگی کو اپنے پیروں تلے کچل دیا..... برباد کر دیا۔ میرے دل کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ لیکن یہ سب ماضی میں دفن ہے..... اور میں کبھی اس عورت کو یاد نہیں کرتا لیکن تمہاری ہنسی مجھے اس کی یاد دلا دیتی ہے۔ لو۔'' اور یہاں

میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چوم لئے۔ ''میں نے اپنی جوانی کی حماقت کی کہانی تمہیں سنادی..... چنانچہ اب بھول جاؤ اور معاف کردو مجھے۔ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کرنا۔ تم جانتی ہو کہ میں کہاں مقیم ہوں۔ جب ضرورت ہو میری، بلالینا۔ تو۔ خدا حافظ۔ پاک اور بے داغ ضمیر کا سکون تمہارے ساتھ ہو۔''

اور میں نے اپنا جلتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس نے میری اس حرکت کو دعائیہ خیال کیا۔ سوچا کہ یوں میں اسے خاموش دعا دے رہا ہوں۔ اور میں نے سوچا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے کیا سوچا..... اتنا بتادوں کہ اس وقت میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا نہ دی تھی بلکہ اس کے وجود پر لعنت بھیجی تھی۔

اس ہسین فتنے کے قریب رہ کر میں اپنے پر بھروسا نہ کرسکتا تھا۔ چنانچہ میں مزید کچھ کہے بغیر چونکا دینے والی تیزی سے گھر سے باہر آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے ''جوان بوسوں'' سے چونک تو تھی لیکن اس خیال سے خوش اور مطمئن بھی تھی کہ میرے جذبات برانگیختہ کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ لیکن میں نیگ ردن گھما کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ اس کی رخصتی نظر دیکھنے کی میں جرات ہی نہ کرسکا۔

اس وقت میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ مجھے اپنے سے اور نینا سے نفرت سی ہوگئی تھی۔ میں محبت اور نفرت کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ محبت جس کی بنیاد صرف نفسانی خواہش تھی، جو صرف جسمانی تھی اور جس کا علاج تھا۔ یعنی نفسانی خواہش پوری کرلینا۔ اور نفرت مجروح روح سے پیدا ہوئی تھی جس کا مکمل علاج شاید کوئی نہ تھا۔

میں گھر سے باہر آیا اور اپنی بگھی میں سوار ہو کر اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا جیسے جیسے میں ویلا رومانی سے دور ہوتا جارہا تھا نینا کے دیوانہ کردینے والے حسن کا اثر کم ہوتا جارہا تھا، میرے بے قرار دل کو قرار اور دماغ کو سکون ملتا جارہا تھا اور دسمبر کی ہواؤں میں خنکی اور ہلکی ہلکی سردی میرے اعصاب کے ہیجان کو اور خون کی گرمی کو دور کررہی تھی۔

جب میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچا تو دماغی اور جسمانی تھکن سے تقریباً نڈھال تھا۔ چنانچہ میں نے اس دن آرام کرنے اور کسی بھی ملاقاتی سے نہ ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں جب میں ونسانزو کو مناسب احکامات دے رہا تھا تو مجھے ایک خیال آیا۔

میں اس چھوٹی الماری کے قریب پہنچا جو کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کا خفیہ خانہ کھول کر میں نے اس میں سے ایک چرمی خول نکال کر ونسانزو کو دیا۔

''کھولو اسے۔'' میں نے اس سے کہا۔

ونسانزو نے اس پر لپٹے ہوئے فیتے کھولے اور پھر خول کھولا۔ اس میں وہ بے حد عمدہ پستول رکھے ہوئے تھے۔ جن کے دستوں پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ان پستولوں کو دیکھ کر ونسانزو کے منہ سے نہ تو حیرت کے کلمات نکلے اور نہ ہی اس کے بشرے سے حیرت کا اظہار ہوا۔

''کیسے ہیں؟'' میں نے یوہی پوچھا۔

میرے خادم نے ایک ایک پستول کو الٹ پلٹ کر دیکھا بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ ایک ماہر کی طرح باقاعدہ ان کا معائنہ کیا۔

''صاحب! صاف صفائی کی ضرورت ہے۔'' وہ بولا۔

''ٹھیک ہے۔ تو پھر اچھی طرح سے ان کی صاف صفائی کر کے انہیں ٹھیک ٹھاک کردو۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے ان پستولوں کی ضرورت پڑ جائے۔''

خاموش طبع ونسانزو نے کچھ پوچھے بغیر اثبات میں سر ہلایا اور جانے کے لئے پلٹا۔

''ٹھہرو۔'' میں نے کہا۔

وہ میری طرف گھوم گیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''ونسانزو! ہوسکتا ہے کہ ایک دن مجھے تمہاری وفاداری کو آزمانا پڑے۔'' میں نیبولا۔

اور ونسانزو کی آنکھوں میں چنگاریاں سی روشن ہو کر

بجھ گئیں۔

''صاحب! آپ بس حکم کیجئے۔ میں سپاہی رہ چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ فرض کیا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بہتر بھی خدمت کی وجہ ہے۔ احسان مندی۔ میں آپ کا ایک ادنیٰ ملازم ہوں۔ لیکن آپ نے میرے دل کو موہ لیا ہے۔ چنانچہ اگر آپ کو میری زندگی کی بھی ضرورت پڑ گئی تو وہ بھی میں دے ڈالنے سے دریغ نہ کروں گا۔

وہ خاموش ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ یہ کم گو شخص جو بظاہر پتھر کی طرح ٹھس تھا، اپنے جذبات کا یوں اظہار کر دینے پر کچھ شرمندہ سا تھا۔ وہ میرے سامنے جھکا اور ایک بار پھر پلٹ کر چل دیا۔ لیکن میں نے اسے ایک بار پھر واپس بلایا اور جب وہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا تو میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''ہاتھ ملاؤ۔ امیگو!'' میں نے کہا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں نے دیکھا کہ اس کے بشرے سے بیک وقت حیرت اور خوشی عیاں تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا۔ اس نے میرا ہاتھ چوم لیا اور اس دفعہ وہ اپنی مخصوص خودداری اور گھنے پن کو بھول کر ناچتے ہوئے قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں ونسانزو کی اس خلاف توقع حرکت پر حیرت سے غور کرنے لگا۔ ایک بات تو بہرحال صاف تھی۔ یہ غریب مجھے چاہتا تھا۔ خدا جانے کیوں۔ میں نے اس کے لئے بس وہی کیا تھا۔ جو ایک آقا اپنے وفادار اور محنتی اور اچھے ملازم کیلئے کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر میں اس پر جھنجھلایا تھا اور اس کو ڈانٹ بھی دیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے بقولاس کے اس کا ''دل موہ'' لیا تھا۔ ونسانزو مجھے کیوں چاہتا تھا؟ میرا بوڑھا بتلر جیاکومو کیوں اب تک میری ایڈ کو اپنے دل میں بسائے ہوئے تھا؟ اور کیوں میرا کتا اب بھی مجھے پیار کرتا اور میرا فرمانبردار تھا۔ جبکہ میری بیوی اور میرے دوست نے بڑی خوشی سے مجھے بھلا دیا تھا اور مجھے چھوڑ دیا تھا؟ غالباً وفاداری وغیرہ ''پرانی تہذیب'' بن چکی تھی۔ نئی تہذیب اور فیشن کی دنیا میں اس کو کوئی مقام نہ تھا۔ وفا یا تو اب غریبوں اور بے پڑھے لوگوں میں رہ گئی تھی یا پھر جانوروں میں۔

اور میں پتہ نہیں کیوں نڈھال سا ہو کر اس آرام کرسی میں ہیٹ گیا جو کھڑکی کے قریب رکھی ہوئی تھی اور ان کشتیوں کو دیکھنے لگا جو اپنے سفید بادبان کھولے نیلے پانیوں پر آہستہ آہستہ تیر رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

سیکنڈ منٹوں میں، منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہوتے گئے اور شام ہوئی اور سائے لمبے ہو گئے اور پھر معدوم ہونے لگے اور ونسانزو کمرے میں آیا اور اس نے یہ کہتے ہوئے آتشدان میں آگ روشن کر دی کہ سردی بڑھنے لگی ہے، تو میں نے ایک عجیب طرح کا سکون محسوس کیا اور ساتھ ہی ساتھ مسرت بھی۔

اور رات کا کھانا لگانے سے ذرا دیر پہلے اس نے مجھے ایک خط دیتے ہوئے کہا کہ یہ خط کونسٹس رومانی کا کوچوان ابھی ابھی دے گیا ہے۔ لفافے پر میری مہر اور میرے ہی خاندان کی علامت بنی ہوئی تھی۔ میں نے لفافہ چاک کر کے خط کھولا۔ اس پر تاریخیں لکھی ہوئی تھی۔

''لاسانتی سیمالان ون زیادتہ''

اور ط کی عبادت یوں تھی۔

''پیارے!

میں خیریت سے یہاں پہنچ گئی ہوں۔ نینں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور جب تم آؤ گے تو تمہارا بھی تمہارے شایان شان استقبال کیا جائے گا۔

پیارے! میں ہر دم تمہارے متعلق ہی سوچتی رہتی ہوں اور بہت خوش ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مجھے دل و جان سے چاہتے ہو تو پھر اپنی اس وفادار نینا کو ہمیشہ اتنا ہی پسند کیوں نہیں کرتے؟

نینا''

میں نے غصے میں اس خط کو اپنے ہاتھوں میں دبا کر توڑ مروڑ دیا اور پھر آتش دان کے لپکتے ہوئے شعلوں میں پھینک دیا۔ خط میں سے عصر کی بھینی بھینی

خوشبو آرہی تھی جس سے مجھے متلی ہونے لگی تھی۔ کیونکہ یہ خوشبو مجھے اس بو کی طرح لگی جو اس مشک اور بلاؤ کے جسم سے پھوٹتی ہے جو جھاڑیوں کی اوٹ لے کر اپنے شکار کی طرف بڑھ رہا ہو۔

میں ''اپنی اس وفادار'' نینا کے متعلق سوچنا نہ چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک کتاب کھولی اور اس کے مطالعے میں گم ہوگیا۔ یہاں تک کہ رات کے کھانے کے دوران بھی یہ کتاب میز پر کھلی تھی۔ ونسانزو اپنی روایتی خاموشی سے میری خدمت میں موجود رہا۔ میں بہت زیادہ تھکن محسوس کررہا تھا۔ بدن ٹوٹ رہا تھا چنانچہ میں خلاف معمول سویرے ہی سونے چلا گیا۔ وقت تھا کہ کسی طرح گزرتا ہی نہ تھا اور میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا کہ اس ڈرامے کا خاتمہ کیا کبھی نہ ہوگا۔

اپنے ساتھ وہی سست رفتار اور بیزار کن سیکنڈ منٹ اور گھنٹے لے کر دوسرا طلوع ہوا۔ مجھ پر ایک عجیب طرح کا جمود سا طاری تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ شام کے وقت دا کیا ایک تار لے کر آیا جس نے میرا جمود توڑ دیا، میرے جسم کے پٹھوں اور اعصاب کو تان دیا میری سستی اور بیزاری دور کردیا ور مجھے ایک بار پھر راہ عمل پر ڈال دیا۔ تار کا مضمون صاف اور سیدھا اور مختصر تھا۔

''ازطرف جیدو فیراری، روم

کونٹ سیزر اور اولاویہ، نیپلز کی خدمت میں

24 تاریخ کو میں حاضر ہورہا ہوں۔

ریل شام ساڑھے چھ بجے پہنچتی ہے۔

سیدھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گا جیسا کہ آپ کا حکم ہے۔''

☆.....☆.....☆

وہ کرسمس کی شام تھی اور نیپلز کے بازاروں اور گلی کوچوں میں اور ہر موڑ پر چہل پہل اور سجاوٹ تھی۔ وہ تو خیر تھی ہی لیکن میرے ہوٹل میں بھی عجیب مصروفیت اور بھاگ دوڑ تھی۔ ہوٹل کے ہوشیار ملازم ہیڈ بٹلر کی زیر نگرانی ایک زبردست دعوت کے انتظام میں لگے ہوئے تھے اور میزیں سجا رہے تھے اور یہ انتظام میرے حکم سے ہورہا تھا۔ یہ دعوت میں دے رہا تھا۔ کیونکہ آج ''میرا دوست جیدو'' روم سے واپس آرہا تھا۔ چنانچہ یہ دعوت اس کی ''استقبالیہ'' بھی تھی۔ اور.....الوداعی بھی۔''

ٹھیک چھ بجے میں نے اپنی بگھی جیدو کو لینے کے لئے ریلوے اسٹیشن روانہ کردی۔ جیسا کہ پہلے سے طے کرلیا گیا تھا اور پھر ہوٹل کے مالک کی درخواست پر دعوت کا انتظام دیکھنے گیا۔ دعوت کا انتظام اس بڑے کمرے میں کیا گیا تھا۔ جو اس ہوٹل کا سب سے بڑا سب سے عمدہ کمرہ تھا اور شادی، سالگرہ اور ''بڑے لوگوں'' کی پارٹیوں کے لئے مخصوص تھا۔ کمرہ دلہن کی طرح سجایا گیا۔ چھت سے خوب صورتی سے لٹکائے گئے تھے کہ اس کی شکنوں میں ایک ترتیب اور خوشنمائی پیدا ہوگئی تھی اور ان پر مردوں کے درمیان مناسب فاصلوں سے قد آدم آئینے کھڑے کردیئے گئے تھے۔ کمرے کے ایک گوشے میں ایک چھوٹا سا ''پودگھر'' بنایا گیا جس میں مختلف قسمکے خوشبودار پھولوں کے پودے سجے ہوئے تھے جو رنگین قمقموں کی طرح معلوم ہوتے تھے اور ان پودوں کے درمیان سنگ مرمر کا اور کھلے ہوئے کنول کی شکل کا خوب صورت فوارہ تھا۔ اسی جگہ دعوت کے وقت سازندے بیٹھ کر تاروں والے ساز بجانے والے تھے۔ پورے کمرے میں کئی محرابی کھڑکیاں تھیں لیکن ایک.....اور صرف ایک اونچی اور لمبی کھڑکی ایسی تھی جس کو کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ یعنی اس پر پردہ پڑا ہوا نہ تھا اور اس میں سے جاڑے کی چاندنی میں نہایا ہوا خلیج نیپلز کا خوبصورت منظر نظر آتا تھا۔ پندرہ آدمیوں کے لئے کھانے کی میز لگائی گئی تھی جس پر چاندی کی طشتریاں اور پیالے اور بلوریں گلاس اور جام جگمگ کررہے تھے اور ان کے درمیان شیشے کے اور بادامی رنگ کے گلدانوں میں تازہ پھول رکھے ہوئے تھے جن کی خوشبو سے پورا کمرہ مہک رہا تھا۔

انتظام حقیقت میں بے حد شاندار اور حسب دلخواہ تھا۔ چنانچہ میں نے صرف سر ہلا کر اور مسکرا کر اپنے

اطمینان کا اظہار کیا اور ہوٹل کا مالک میرے یوں سر ہلانے اور مسکرانے پر ایسا خوش ہوا جیسے اسے بادشاہ کی طرف سے تمغہ مل گیا ہو۔

اس طرف سے مطمئن ہو کر میں دعوت کا لباس پہننے اپنے کمرے میں پہنچا تو میرا خادم ونسانزو میرے کوٹ کو مزین کر رہا اور اس پر سے آخری ذرہ یا دھاگا جو کچھ بھی چپکا ہوا تھا اسے جھاڑ رہا تھا اور اس نے لباس کے دوسرے کپڑے تہ کر کے ترتیب سے رکھ دیئے تھے۔

میں نے اپنے ڈریسنگ کیس کو کھول کر اس میں سے تین ہیرے کے جڑاؤ بٹن نکالے۔ ہر ایک بٹن کی چمک اور دمک نظر کو خیرہ کئے دیتی تھی۔ میں نے یہ بٹن اپنی قمیض کے گلے میں لگانے کے لئے ونسانزو کو دیئے۔ وہ انہیں اپنی آستین پر رگڑ رگڑ کر چمکا رہا تھا اور میں اسے دیکھ رہا تھا کہ ایک دم سے میں نے کہا۔

''ونسانزو!''

وہ چونکا۔

''حضور؟''

''آج رات تم میری کرسی کے پیچھے کھڑے رہو گے اور شراب پیش کرنے میں مدد کرو گے۔''

''جی حضور۔''

''اور تم۔'' میں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ''سگنور فیراری کا خاص خیال رکھو گے جو میری دائیں طرف بیٹھیں گے۔''

''جی۔''

''اور اس کا دھیان رکھو گے کہ ان کا جام ذرا بھی اور کبھی بھی خالی نہ رہے۔''

''جی اچھا۔''

''اور جو کچھ بھی کہا جائے اور جو کچھ بھی کیا جائے۔'' میں سکون سے کہتا چلا گیا۔ ''اس پر تم ذرا بھی حیرت اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کرو گے۔ ڈنر شروع ہونے سے لے کر جب تک میں نہ کہوں تم اپنی جگہ سے یعنی میری کرسی کے پیچھے سے..... نہ ہٹو گے خیال رہے یہ جگہ میں نے تمہارے لئے مخصوص کی ہے اور میری اجازت کے بغیر تم ایک انچ بھی ادھر ادھر نہ ہٹو گے خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔''

غریب ونسانزو ذرا پریشان نظر آنے لگا۔ تاہم اس نے حسب معمول کہا۔

''جی اچھا۔''

میں نے مسکرا کر اور آگے بڑھ کر اپنا ایک ہاتھ آہستہ سے اس کے شانے پر رکھ دیا۔

اور وہ دونوں پستول، وسانزون؟''

''وہ صاف ہیں اور استعمال کے لئے تیار۔'' اس نے جواب دیا۔

دونوں پستول میں نے آپ کی الماری میں رکھ دیئے ہیں۔''

''شاباش۔ اچھا اب تم جاؤ اور میرے دوستوں کے استقبال کے لئے کمرہ تیار کرو۔''

ونسانزو کے جاتے ہی میں حمام میں جا گھسا۔ ابھی میں نہا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ صحن میں سے بگھی کے پہیوں کی آواز سنائی دی اور میرا خون ایک دم سے گرم ہو کر میرے چہرے کی طرف لپکا، میرا چہرہ تپ گیا، کنپٹیاں سنسنانے لگیں اور دل بری طرح سے دھڑکنے لگے، لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر اور چہرے پر اپنی مخصوص سنجیدگی اور بے پروائی طاری کر کے اپنے ڈریسنگ سے اپنے خاص کمرے میں آیا ہی تھا کہ ایک دم سے اس کا دروازہ کھلا اور ''سگنور فیراری'' کا نام پکارا گیا۔

دوسرے ہی لمحے جیدو کمرے میں داخل ہوا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ہنسی اس کے منہ میں سماتی نہ تھی اور آنکھوں میں خوشگوار توقعات کی چمک تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ قبول صورت معلوم ہو رہا تھا۔

''ایکومی کوآ!'' اس نے میرے دونوں ہاتھ گرمجوشی سے تھام لئے۔ ''میرے عزیز کونتے! آپ کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ کیا عمدہ انسان ہیں آپ۔ الیف لیلہ کے اس بادشاہ جیسے جس کا کام ہی لوگوں میں خوشیاں تقسیم کرنا تھا۔ آپ نے بھی دوسروں کا بھلا کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ طبیعت

کیسی ہے آپ کی؟ ماشاءاللہ تندرست اور چاق و چوبند معلوم ہوتے ہیں۔''

''ور آپ تو پہلے سے بھی زیادہ صحت منداور خوب صورت بن کر لوٹے ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

وہ بے حد خوش دلی سے ہنسا۔ وہ اپنے آپ سے اور پوری دنیا سے خوش اور مطمئن تھا۔ وہ کرسی میں بیٹھ گیا اور اس نے اپنے دستانے اتار کر سفری اور کوٹ کے بوتام کھول دیئے۔

''بات یہ ہے میرے دوست کونتے!'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کہ بہت سی دولت آدمی کو صحت منداور بشاش بنا دیتی ہے۔ لیکن میرے عزیز! آپ نے تو ڈنر کا لباس پہن رکھا ہے لیکن میری حالت تو دیکھئے کہ میں اپ کا ساتھ دینے کے قابل ہوں ہی نہیں۔

آپ کا اصرار تھا کہ میں اسٹیشن سے سیدھا آپ کے پاس آجاؤں۔ لیکن میرا کپڑے تبدیل کرنا ضروری ہے۔ آپ کا ملازم میرا بیگ لے آیا ہے۔ اس میں میرے کپڑے ہیں۔ میں دس منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔''

''پہلے ایک آدھ جام پی لو۔'' میں نے اس کی پسندیدہ شراب جام میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

''کوئی جلدی نہیں ہے۔ کافی وقت ہے ابھی تو۔ یہ دیکھئے۔ ابھی تو سات بھی نہیں بجے اور ہم آٹھ بجے سے پہلے کھاتے نہیں۔''

اس نے میرے ہاتھ سے جام لے لیا اور میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ جواب میں میں بھی مسکرایا۔ اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کا استقبال کرتے ہوئے میں دلی مسرت محسوس کر رہا ہوں، فیراری۔ سچ کہتا ہوں کہ آپ کی واپسی کا میں بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اتنی ہی بے چینی سے جتنی کہ.....''

اس نے اپنے ہونٹوں کے سامنے سے جام ہٹا لیا اور اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوشی کی چمک آ گئی۔

''جتنی بے چینی سے وہ انتظار کر رہی تھی؟'' وہ بولا۔ ''ہائے! اسے دیکھنے کے لئے میں خود کس قدر بے تڑپ رہا ہوں۔ خدا کی قسم امیگو! اگر میں نے اپنے دل کا کہا مانا ہوتا تو اسٹیشن سے سیدھا ویلا رومانی چلا گیا ہوتا۔ لیکن میں نے سیدھے یہاں آنے کا آپ سے وعدہ کیا تھا اور پھر ملاقات کا مزہ رات گئے ہی آتا ہے۔''

اور وہ معنی خیز ہنسی ہنسا۔

میرے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئیں لیکن میں نے بظاہر بشاشت سے کہا۔

''سچ کہا۔ ملاقات کے لئے رات ہی بہتر ہوتی ہے۔ انگریزی کے مشہور شاعر بائرن نے کہا کہ عورتیں بھی تاروں کی طرح رات کو زیادہ خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کو اب وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین اور دل لوٹ لینے والی معلوم ہوگی۔ بلاشبہ یہ اس کی پاک اور صاف روح ہی ہے جس نے اس کے چہرے کو اس قدر خوب صورت اور تابناک بنا دیا ہے۔ اور یہ سن کر آپ کو اطمینان ہو جائے گا کہ آپ کی غیر موجودگی میں اس نے میرے علاوہ کسی سے ملاقات نہیں کی۔ صرف مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت تھی۔''

''شکر ہے بھائی، شکر ہے۔'' جیدو خوشی سے چلایا اور ایک ہی سانس میں جام خالی کر گیا۔ ''اچھا اب یہ بتاؤ کونتے کہ آج رات کی دعوت میں کون کون آ رہے ہیں؟ بہر حال اس وقت تو میں بستر میں پیار کرنے سے زیادہ عمدہ اور لذیذ پکوان کھانے کے موڈ میں ہوں۔''

میں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

''سچ کہا۔ ہر عقلمند آدمی خوبصورت عورتوں پر لذیذ کھانوں کو ترجیح دیتا ہے۔ خیر تو کیا پوچھا تھا آپ نے کہ آج رات کون کون میرے مہمان ہیں؟ غالباً آپ ان سب کو جانتے ہیں۔ سرفہرست تو ہیں ڈیوکا فلیپو مارینا۔''

''خدا کی قسم بے حد شریف اور مہذب آدمی ہیں۔'' جیدو نے اچھل کر کہا۔

''دنیا کے لوگ مل کر بھی ان کی وضعداری کو نہیں توڑ سکتے۔ حیرت ہے کہ وہ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ کونتے! کمال کر دیا آپ نے۔''

''اور پھر ہیں سگنور فرشناقی اور مارسش جیولانی۔''
''جیلوانی تو مچھلی کی طرح پیتا اور مدہوش ہوجاتا ہے۔ سچ کہتا ہوں کونتے ڈنر ختم ہونے سے پہلے وہ سارے ہی ویٹروں کو قتل کردینے کے لئے دوڑے گا۔''
جہاں تک پینے کا سوال ہے آپ کا اور اس کا مقابلہ دلچسپ رہے گا۔'' میں نے کہا۔
''لیکن میں مدہوش نہیں ہوجاتا۔ وہ ہوجاتا ہے۔''
میں نے اسے گھور کر دیکھا اور ایک بار پھر اپنے مہمانوں کی فہرست اسے سنانے لگا اور اور جب میں نے مارکیوس دی ایوان کورٹ اور کپتان یوجین دی ہاسیل کا نام لیا تو جیدو نے حیرت سے کہا۔
''یہ دونوں تو پیرس کی مشہور ڈویل لڑنے والے ہیں کونتے! ان کو بلانے کی آپ کو کیا ضرورت پڑ گئی۔ یہ دونوں تو بات بات میں تلواریں کھینچ لیتے ہیں بلکہ اگر کوئی بھنوئیں بھی اچکائے تو اس سے جھگڑ پڑتے ہیں۔''
''میں نے تو انہیں اس لئے دعوت دی ہے کہ میرا خیال تھا کہ یہ دونوں آپ کے دوست ہیں۔ یاد ہے آپ کو کہ خود آپ ہی نے ان دونوں کا تعارف مجھ سے کروایا تھا؟''
اور میں ایک بار پھر اپنے مہمانوں کے نام گنانے لگا۔
''اور سب سے آخر میں اپنے عزیز دوست اور اپنے زمانے کے ڈان وان سگنور جیدو فیراری جن کے بغیر دعوت نامکمل ہوتی۔'' میں نے آخر میں کہا۔
''چنانچہ آپ کو ملا کر کل پندرہ ہوئے۔'' جیدو نے اپنی انگلیوں پر گنتے ہوئے کہا۔
''اور آپ نے اس دعوت کا انتظام مجھ جیسے حقیر آدمی کی واپسی کی خوشی اور اعزاز میں کیا ہے؟''
''بالکل۔ صرف آپ کی خاطر۔'' میں نے جواب دیا۔
وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کرسی پر سے اٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیئے۔
''کونتے! آپ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''میرے دوست فیراری!'' میں نے کہا۔
''آپ کی شرافت اور بلند اخلاقی کا میں اکیلا ہی قائل نہیں ہوں۔ ہر آدمی آپ کو پسند نہیں کررہا ہے؟ آپ کا ہر دلعزیز نہیں ہیں؟ خود آپ نے مجھ سے نہیں کہا تھا کہ آپ کے مرحوم دوست فابیو رومانی اپنی بیوی کے بعد آپ کو سب سے زیادہ چاہتے تھے؟ میرے دوست! آپ اپنے آپ کو اتنا حقیر کیوں سمجھ رہے ہیں؟''
اس نے میرے شانوں پر سے اپنے ہاتھ ہٹالئے۔ اس کے چہرے سے کرب واضطراب ٹپکنے لگا۔
''پھر وہی فابیو۔ خدا کی قسم یہ آدمی تو مرنے کے بعد مجھے بھوت بن کر ستارہا ہے۔ میں اپ سے کہا چکا ہوں کونتے کہ فابیو بڑا احمق تھا اور شاید یہ بھی اس کی حماقت ہی تھی کہ اس نے مجھے اتنا چاہا۔ جانتے ہو کونتے کہ پچھلے چند دنوں سے میں اسی کے متعلق سوچتا رہا ہوں؟''
''اچھا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا اور بظاہر بے تعلقی سے اپنے کوٹ کے کاج میں پھول لگانے میں مصروف رہا۔ ''بھلا وہ کیوں؟''
جیدو کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی اور اس کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں۔
''میں نے اپنے چچا کو مرتے دیکھا'' اس نے نیچی اور قدرے کانپتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔
''وہ بہت بوڑھے اور کمزور تھے۔ اس کے باوجود موت سے ان کی کشمکش بے حد خوفناک اور دہشت، دہلا دینے والی۔ ان کی صورت اور حالیہ میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ نہیں رہی۔ ان کا زرد چہرہ ان کے اکڑے اور اینٹھے ہوئے اعضاء پنجوں کے سے خشک ہاتھ اور مڑی ہوئی انگلیاں جو خالی ہوا کو نوچ رہی تھیں اور پھر بھیانک مسکراہٹ سے کھنچے ہوئے ہونٹ اور لٹکا ہوا جبڑا اور اور پھٹی ہوئی بے آنکھیں۔ توبہ توبہ یاد کرتا ہوں تو اب بھی میری طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔''
اس کی طرف دیکھے بغیر میں کاج میں پھول لگانے میں مصروف رہا۔ میں اندر ہی اندر سوچ رہا تھا کہ میرے

شکار کے گندے دل میں کون سا نیا جذبہ جنم لے رہا ہے۔

''واقعی سخت اثر انگیز اور لرزہ خیز نظارہ ہوتا ہے۔'' میں بن کہا۔

''لیکن تمہیں تو یقیناً کچھ زیادہ دکھ نہ ہوا ہوگا۔ آپ کے چچا اپنی عمر کو پہنچ کر طبعی موت مرے اور پھوت موت تو ہم سب کو آتی ہے۔ بہت فرسودہ بات ہے لیکن جلد یا بدیر ہم کو بھی مرنا ہے۔''

''معافی چاہتا ہوں۔'' جیدو نے مجھ سے زیادہ اپنے آپ سے کہا۔ ''چچا کے مرنے کے بعد مجھے غم نہیں بلکہ خوشی ہوئی۔ بڑا بدمعاش تھا، وہ بڈھا۔ کوئی ایسی بدمعاشی نہ ہوگی جو اس نے نہ کی..... جی نہیں..... ان کی موت کا مجھے غم نہیں ہے..... لیکن میں نے انہیں سکرات میں تڑپتے، ہر سانس کے لئے جدوجہد کرتے اور موت سے مقابلہ کرتے اور زندہ رہنے کے لئے پورا زور لگاتے دیکھا ہے اور اس وقت میں نہیں جانتا کیوں، مجھے فابیو یاد آیا۔''

جیدو کے اس بیان نے مجھے حیرت زدہ کر دیا لیکن اپنی حیرت کو بے تعلقی کو پردے میں چھپاتے ہوئے میں نے ایک قہقہہ لگایا۔

''معاف کرنے میرے دوست فیراری لیکن معلوم ہوتا ہے کہ روم کی آب و ہوا نے تمہارے دماغ پر الٹا اثر کیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ تمہاری بات میری سمجھ میں آتی نہیں۔''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اس کے بشرے سے سخت اضطراب عیاں تھا۔

''بے شک نہ آئی ہوگی۔ کیونکہ میں خود نہیں سمجھ سکا۔ لیکن اگر ایک عمر رسیدہ آدمی کے لئے زندگی تجنا اس قدر تکلیف دہ تھا تو پھر فابیو کی کیا حالت ہوتی ہوگی؟ طالب علمی کے زمانے میں ہم دونوں ساتھ رہے، ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر گھومتے تھے اور وہ جوان تھا، قوت حیات سے بھرپور اور جسمانی طور پر مجھ سے زیادہ طاقتور تھا۔ موت سے اس نے کیسا سخت مقابلہ کیا ہوگا، زندہ رہنے کے لئے اس نے کتنی جدوجہد کی ہوگی، اپنا سارا زور لگا دیا ہوگا، یہاں تک کہ اس کے اعصاب اور عضلاب ٹوٹنے کی حد تک تن گئے اور کھنچ گئے ہوں گے۔'' وہ سر سے پیر تک کانپ گیا۔

''بڑی خوفناک چیز ہے یہ موت، خدا اسے ہمارے لئے آسان کرے۔''

حقارت آمیز رحم کا جذبہ میرے دل میں ابھرا۔ یہ جیدو غدار ہونے کے علاوہ کیا بزدل بھی تھا؟

''معاف کرنا میرے دوست۔ لیکن آپ کی باتیں اب مجھے بیزار کرنے لگی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ بے حد لذیذ اور عمدہ ڈنر کی تیاری کے لئے ایسی باتیں مناسب بھی نہیں ہیں اور ہاں آپ شاید بھول گئے ہیں کہ ابھی آپ کو لباس بھی تبدیل کرنا اور تیار ہونا ہے۔

میرے لہجے میں جو ہلکا سا طنز تھا۔ اس نے جیدو کو نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھنے اور مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے چہرے پر سے خوف اور گھبراہٹ کے آثار دور ہو گئے اور اس نے اپنے ماتھے پر یوں ہاتھ پھیرا جیسے کسی ناخوشگوار خیال کو جھٹک رہا ہو۔

''میں ذرا پریشان اور خوفزدہ ہو گیا ہوں۔'' وہ بے چین ہنسی ہنسا۔ ''کیونکہ پچھلے چند گھنٹوں سے مجھے عجیب الٹے سیدھے خیالات آ رہے ہیں۔''

''اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''کیونکہ آپ نے اپنے چچا کو جس طرح مرتے دیکھا ہے اس کے بعد اپنے گناہوں کا اور ان کی سزا اور قبر کے عذاب کا خیال آنا لازمی ہے۔ قدرتی بات ہے یہ..... لیکن ہٹاؤ مرنے والے مر گئے۔ ہم کیوں اپنے آپ کو دہلائیں۔ فکر کی گرد جھٹک دو اور جب تک زندگی ہے تب تک مزے اڑاؤ..... مرنے کے بعد جو ہوگا سو دیکھا جائے گا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ مرنے کے ساتھ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کھا لو، پی لو، مزے اڑا لو اس سے پہلے کہ سب کچھ ختم ہو جائے۔''

''بے حد عمدہ مشورہ۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اور اس پر عمل کرنا بھی آسان۔ اب اجازت ہو تو میں

جشن کے لئے تیار ہو جاؤں۔''

میں نے گھنٹی بجائی، ونسانزو فوراً حاضر ہوا، میں نے اسے جیدو کے ساتھ جانے اور اس کی خدمت میں حاضر رہنے کا حکم دیا۔

''اور دیکھو۔ انہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہو فوراً حاضر کر دینا۔'' میں نے اپنے خادم سے کہا۔ ''اور ان کا ہر حکم بجالانا۔۔۔''

''جی اچھا۔'' ونسانزو سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔

جیدو نے میرا شکریہ ادا کیا اور اپنا بے حد بشاش اور ہنستا ہوا چہرہ اور تھرکتے قدم اٹھاتا ہوا ونسانزو کے پیچھے ہی پیچھے کمرے سے چلا گیا۔

میں خاموش کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ آج مجھے اس پر رحم آ رہا تھا۔ اور جب سے میں دوبارہ زندہ ہو کر'' آیا تھا اور جب مجھ پر جیدو کی بیوفائی کا انکشاف ہوا تب سے لے کر اب تک میں نے اس کے خلاف غصے اور نفرت کا جذبہ ہی محسوس کیا تھا۔ آج پہلی دفعہ میں نے اس کے لئے رحم کا جذبہ محسوس کیا تھا۔

اس نے ہماری طالب علمی کے زمانے اور ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر گھومنے کی جو بات کہی تھی وہ خدا جانے کیوں میرے دل کو چھو گئی تھی۔ بے شک اس زمانے میں ہم دونوں خوش تھے۔ بہت خوش۔ دو بے فکرے نوجوان جن کے سامنے پوری دنیا گھڑ دوڑ کے میدان کی طرح کھلی پڑی تھی..... ایسا میدان جس پر اب تک گھوڑے نہ دوڑے ہوں، جس پر ابھی تک کوئی قدم نہ پڑے ہوں..... ہاں اس وقت اس نے ہمارے اعتماد کی جنت کو ناپاک نہ کیا تھا، تب وہ اپنا خوب صورت چہرہ اور شیطانی وجود لئے مجھے پاگل اندھا اور بیوقوف بنانے جیدو کو ایک وفادار اور جاں نثار دوست میں سے تبدیل کر کے ایک عیار اور دھوکے باز شخص میں تبدیل کرنے نہ آئی تھی۔

بے شک سارا قصور اس عورت کا تھا جو مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے، میری بیوی تھی، پالا شا آبت ہوئی تھی وہ ہماری زندگیوں کے لئے۔ زہر بنا دیا تھا۔ اس نے ہماری زندگیوں کو۔ اور سخت سزا کی مستحق تھی اور یہ سزا اسے ضرور ملے گی۔

کاش کہ میری اور جیدو کی اس دعوت سے کبھی ملاقات نہ ہوئی ہوتی۔ کاش ہم نے اسے کبھی دیکھا نہ ہوتا۔ اس کے حسن نے تلوار کی طرح ہماری دوستی کے بندھن کاٹ دیئے تھے اور آپ جانئے دوستی کے بندھن عورت کے پیار سے زیادہ مضبوط اور مقدس ہوتے ہیں۔

لیکن اب یہ سب سوچنا اور اس پر افسوس فضول تھا۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا تھا۔ گناہ کیا جا چکا تھا اور اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے پاس اب سوچنے کے لئے وقت نہ تھا۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ مجھے اس ''خاتمے'' کے زیادہ سے زیادہ قریب لئے جا رہا تھا جو میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا اور جس کا مکمل ترین نقشہ میں نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔

بے شک اب سوچنے کا وقت نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

سوا آٹھ بجے میرے مہمان آنے شروع ہوئے۔ یکے بعد دیگرے سب آ گئے سوائے دو کے یعنی سدونوں رسپیتی بھائی اب تک نہ آئے تھے۔ ہم لوگ ان بھائیوں کا انتظار کر رہے تھے کہ جیدو فیراری کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے شام کا لباس پہن رکھا تھا اور گردن اکڑائے اور سینہ تانے مغرورانہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اسے اپنی خوبصورتی کا احساس تھا اور وہ جانتا تھا کہ آج کی محفل میں اس کا سا حسین اور کوئی نہیں۔ اور میں نے دل ہی دل میں اس کے حسن کا اعتراف کیا۔

میرے مہمانوں نے جن میں سے اکثر اس کے خاص دوست تھے۔ اس کا استقبال کیا اور نیپلز واپس آنے پر اسے مبارکباد دی۔ مہمان اس سے اس کے روم کے سفر اور وہاں کے قیام کے متعلق سوالات پوچھ رہے تھے اور وہ ان کے مناسب اور موزوں جواب دے رہا تھا کہ ملازم میرے لئے ایک رقعہ لے کر آیا جس پر ''اشد ضروری'' لکھا ہوا تھا۔

یہ کارلو رسپتی کا رقعہ تھا جس نے لکھا تھا کہ ایک بے حد ضروری کام آ پڑا ہے جس کی وجہ سے وہ اس کا بھائی میری دعوت میں شریک نہ ہو سکیں گے۔ پھر اس

نے بے حد مہذب اور شائستہ الفاظ میں معافی چاہی تھی۔

چنانچہ اب میں نے گھنٹی بجائی جو اس بات کا اعلان تھا کہ ڈنر میں اب مزید تاخیر نہ کی جائے گی اور پھر میں نے اپنے مہمانوں کو مخاطب کر کے بتایا کہ رسپتی برادران دعوت میں شریک نہ ہو سکیں گے۔

''یہ تو افسوس کی بات ہے کہ فرانسسکو آج کی دعوت میں نہیں آ سکتا۔'' کپتان فریسکا نے اپنی مونچھوں کی نوکیں مروڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''وہ عمدہ شراب اور عمدہ محفل کا رسیا ہے۔''

''کارو کپتانو!'' مارچیز جولدارو بولا۔ ''آپ اور ہم سب بھی جانتے ہیں کہ فرانسسکو اپنے بھائی کارلو کے بغیر کہیں نہیں جاتا اور کبھی نہیں جاتا۔ اب کارلو نہیں آ سکتا تو فرانسسکو بھی ظاہر ہے کہ نہیں آئے گا۔ کاش کہ دنیا کے تمام بھائیوں میں ایسی ہی محبت ہوتی۔''

''اگر ایسا ہوتا تو کم سے کم آدھی دنیا بیکار ہو جاتی۔'' نوزیانو نے کہا۔ ''یعنی جھگڑے نہ ہوتے اور جھگڑے نہ ہوتے تو زندگی میں لطف نہ آتا اور زندگی میں لطف نہ آتا تو دنیا بے رنگ معلوم ہوتی اور دنیا کو پرلطف نہ آتا تو دنیا بے رنگ معلوم ہوتی اور دنیا کو پرلطف اور رنگین بنانے کے لئے ہی تو یہودا نے دو بھائیوں ہابیل اور قابیل میں جھگڑا کر دیا تھا۔''

اس پر دنیا کے اس پہلے جھگڑے پر بحث چل نکلی اور جانے کب تک جاری رہتی کہ ایک دم سے کمرے کا دروازہ کھلا اور ویٹر نے کھانا لگ جانے کا اعلان کیا۔

اور ہم سے باتیں کرتے اور ہنستے ہوئے کمرہ طعام میں پہنچے۔ تو میں میز کے سرے پر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ میرے دائیں طرف جیدو فیراری اور بائیں طرف ڈیوک ڈی مرینا بیٹھے ہوئے تھے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں نے پندرہ آدمیوں کے ڈنر کا انتظام کیا تھا لیکن دونوں بھائی کارلو اور فرانسسکو نہ آئے تھے۔ ان رسپتی برادران کے نہ آنے کی وجہ سے ہم تعداد میں تیرہ رہ گئے تھے اور ہندسوں کی دنیا میں تیرہ کا عدد بے حد منحوس شمار کیا جاتا ہے اور میں نے سوچا کہ خدا جانے میرے مہمانوں میں کوئی توہم پرست ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اس نے شاید اس تباہ کن بدشگونی کو محسوس نہ کیا تھا کہ کھانے کی میز پر ہم تیرہ آدمی تھے۔

اسٹیج پر سے ہلکی ہلکی موسیقی بہنے لگی۔ نظر نہ آنے والے موسیقار دھیمے سروں میں دلکش بجا رہے تھے۔

''خدا کی قسم امیگو۔'' جیدو نے حیرت اور مسرت سے کہا۔ ''اگر یہ شاہانہ دعوت کا انتظام میرے استقبال کی غرض سے کیا گیا ہے تو مجھے کہنے دیجئے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی دعوت ایک بادشاہ اپنے پڑوسی بادشاہ کی آمد پر دیتا ہے۔''

''سگنور فیراری!'' میں نے کہا۔ ''مخلص آدمیوں سے بڑھ کر کوئی بادشاہ ہو سکتا ہے بھلا؟ خدا کرے ہماری یہ پرخلوص دوستی قائم رہے۔''

جیدو نے تشکر اور احسان مندی سے میری طرف دیکھا اور خاموش رہا۔ میز کو ایسے ڈھنگ سے اور نفاست سے سجایا گیا تھا کہ ڈیوک دی مرینا اپنے آپ کو روک نہ سکا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ کونتے کہ آپ نے مشرقی ملک کے سفر کئے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''کیونکہ آپ کی یہ شاندار دعوت مجھے مشرق رومان کی یاد دلا رہی ہے جو میں نے بہت پہلے پڑھا تھا۔ اس رومانی ناول کا نام تھا ''واتھیک۔''

اور پھر مشرقی رومان کی باتیں چل نکلیں اور ڈنر شروع کیا گیا۔ مختلف قسم کے لذیذ کھانے اور عمدہ شراب سے مہمانوں کی خاطر کی جا رہی تھی۔ سب خوش اور مطمئن تھے۔ میرا خادم ونسانزو میری ہدایت کے مطابق میری کرسی کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور اپنی جگہ سے ہلتا تک نہ تھا۔ صرف جیدو کا جام بھرنے کے لئے آگے بڑھ آتا اور اس کا جام لبریز کر کے پھر اپنی جگہ پر سیدھا اور بت کی طرح بے حرکت کھڑا ہو جاتا تھا۔

ہنسی، دل لگی اور لطیفوں اور باتوں اور بحث مباحثوں میں کھانے کا دور جاری تھا اور مختلف قسم کے سالم بھنے ہوئے پرندے پیش کئے جانے والے تھے کہ یکا یک سب پر ایک عجیب طرح کی اور سمجھ میں نہ آنے والی خاموشی طاری ہو گئی۔ ای خوفناک سکوت جیسے کسی

عظیم اور حاکم بستی نے ایک دم سے کمرے میں داخل ہو کر اور ڈانٹ کر کہا ہو۔ ''خاموش۔''

سب کے سب جیسے بت بن گئے تھے۔ کوئی کچھ بولنے اور جنبش کرنے کی جرات نہ کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ کھانے کی قابیں لاتے لے جاتے ہوئے ویٹوں کے قدموں کی چاپ کو بھی فرش پر بچھے ہوئے نرم اور موٹے قالین نے دبا دیا تھا۔ کوئی آواز سنائی نہ دے رہی تھی سوائے اس فوارے کے چلنے اور اس کے گرنے کی آواز کے جو پھولوں کے کنج میں عارضی طور پر لگایا گیا تھا۔ آسمان پر چاند روشن تھا لیکن فضا کہر آلود تھی۔ چنانچہ کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی میں سے زرد چاند کی موٹی لکیریں کمرے میں در آئی تھیں۔ جیسے کسی بھوت نے ملتجی انداز میں اپنا ایک بازو بڑھا دیا ہو، میز پر رکھی ہوئی بہت سی شمعدانوں میں جلتی ہوئی موم بتیوں کے شعلے جیسے دم بخود ہو کر الطف کی طرح سیدھے کھڑے تھے۔

میز پر بیٹھے ہوئے مہمان ایک دوسرے کی طرف کچھ بے چینی اور کچھ خفت سے دیکھ رہے تھے۔ جیدو میکانکی طور پر اپنے جام سے کھیل رہا تھا۔ ڈیوک روٹی کے ٹکڑوں کو اپنی طشتری میں جمانے اور ان سے کوئی ڈیزائن بنانے میں مصروف تھا۔

یہ خاموشی اتنی دیر تک طاری رہی کہ فضا اس سے بوجھل ہوگئی اور دم جیسے گھٹنے لگا۔

دفعتاً ونسانزو نے اپنے عہدے، یعنی چیف بٹلر کی خدمت اور فرض کو یاد کر کے شیمپئن کی بوتل کا کارک آواز کے ساتھ اڑایا۔ ہم سب یوں اچھل پڑے جیسے ہمارے کان کے قریب ہی پستول چلایا گیا ہو۔

مارچیز جیالدرو نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔

''کارپودی باکو!'' وہ بولا۔ ''چلو لوگ آخر کار بیدار تو ہوئے۔ کیا ہو گیا تھا۔ آپ سب کو کہ سب کے سب میز پوش پر نگاہیں جما کر بت بن گئے تھے؟ بجلی گری تھی سب پہ کہ کیا؟ قوت گویائی سلب ہوگئی تھی آپ سب کی؟ جادو کر دیا تھا کسی نے؟ خدا کی قسم لمحے بھر کے لئے تو مجھے گمان ہوا کہ میں دوسری دنیا میں دعوت میں شریک ہوں اور میرے ساتھ میز پر بیٹھے ہوئے سارے لوگ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہیں۔''

''اور غالباً اسی گمان نے آپ کی زبان پر بھی تالا لگا دیا جو اپنے طور پر ایک معجزے سے کم نہیں۔'' لیور پانوسا لوستری نے ہنس کر کہا۔ ''آپ حضرات نے وہ روایت سنی ہے جو اس ذرا خاموشی کے متعلق ہے جو کسی مشن کے عین بیچ میں یکایک طاری ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک فرشتہ ایسے موقع پر جشن میں شریک ہوتا ہے یا قریب سے گزرتا ہے اور گزرتے وقت خیر و برکت کی دعا دیتا جاتا ہے۔''

''اب یہ کہانی تو کلیسا کی تاریخ سے بھی زیادہ قدیم ہے۔'' شیور الیرماہنسی نے کہا اور اب یہ نظریہ تو غلط ثابت ہو چکا ہے۔ کیونکہ اب ہم فرشتوں میں یقین رکھتے ہی نہیں بلکہ انہیں عورتیں کہتے ہیں۔ (عیسائیوں کے اعتقاد کے مطابق فرشتے عورتیں ہی ہیں اور اس کی تصویریں بھی پردار عورتوں کی ہی بناتے ہیں)

''شاباش!'' کپتان دی حامالی نے چیخ کر کہا۔ ''آپ کے اور میرے خیالات ایک سے ہیں البتہ ایک ذرا سا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ آپ کے نزدیک عورتیں فرشتہ ہیں جبکہ میرے نزدیک شیطان ہیں۔ لیکن ہم اس لفظ کے ہیر پھیر پر جھگڑا نہ کریں گے۔'' اور وہ اپنا جام خالی کر گیا۔ اور ماسینی کی طرف دیکھ کر سر ہلایا تو وہ بھی اپنا جام اٹھا کر غٹ غٹا گیا۔

''میں سمجھتا ہوں۔'' کپتان فراسکلیا کی باریک آواز نے کہا۔ ''کہ ہماری فوری خاموشی ایک نحوست یا بدشگونی کی وجہ سے تھی جس کا احساس ہم سب کو لاشعوری طور پر یا چھٹی حس کی فوری بیداری کی وجہ سے ہوا تھا اور میرا خیال ہے کہ ہمارے معزز میزبان نے اس بدشگونی کا ذکر شاید مناسب ہی نہیں سمجھا انہوں نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔''

اور اب ہر شخص کی نگاہیں فراسکیا کی طرف اٹھ گئیں۔ اور اس پر سوالات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

''کیسا مطلب ہے آپ کا؟''

''کیسی نحوست؟''

''کیسی بدشگونی؟''

''صاف صاف بتایئے آخر بات کیا ہے؟''

''سچ مچ کوئی اہم بات نہیں۔'' فراسکیا نے بے پروائی سے کہنا شروع کیا۔ ''ایسے وہموں میں تو جاہل اور گنوار لوگ مبتلا ہوتے ہیں اور قصور وار سپتی برادران ہیں۔ آج رات وہ دعوت میں شریک نہیں ہوئے جس کی وجہ سے لیکن ہٹاؤ دوستو! اس دلچسپ اور خوشگوار دعوت کا مزا کرکرا کرنے سے کیا فائدہ؟ اور پھر میں تو ہم پرست نہیں ہوں..... البتہ ممکن ہے کہ آپ میں سے کوئی صاحب ہو۔''

''میں سمجھ گیا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' سالوستری بولا۔

اور اب تمام نگاہیں اس پر جم گئیں۔ ہر نظر میں سوال تھا۔

''کھانے کی میز پر ہم تیرہ آدمی ہیں۔'' سالوستری نے اعلان کیا۔

اس اعلان پر مہمانوں نے بے چینی سے پہلو بدلا، ایک دوسرے کی طرف دہشت سے دیکھا اور پھر میں نے دیکھا کہ میز پر بیٹھا ہوا ہر شخص آنکھوں سے اور دل ہی دل میں مہمانوں کو شمار کر رہا تھا۔ یہ سب کے سب تعلیم یافتہ مہذب اور جدید دور کے ترقی پسند لوگ تھے لیکن توہم پرستی کا عنصر ان کے خون میں تھا۔ چنانچہ اب جبکہ یہ انکشاف ہوا تھا کہ کھانے کی میز پر ہم کل تیرہ آدمی تھے تو، میں نے دیکھا کہ فراسکیا اور ایک ہدتک مارکیوس دی بون کورٹ کے علاوہ وہ سب کے سب بے چین تھے۔

لیکن جیدو پر اس کا عجیب اثر ہوا۔ وہ نمایاں طور پر چونکا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''وائی آ ڈیلو!'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

اور اس نے اپنا جام، جو کبھی خالی نہ رہا تھا، اٹھایا اور ایک سانس میں خالی کر گیا اور اپنے کانپتے ہاتھ سے پلیٹ دھکیل دی، لیکن میں نے ان سب باتوں کو جیسے نہ دیکھتے ہوئے بشاشت سے کہا۔

''صاحبو! ہمارے معزز مہمان سالوستری نے بالکل سچ کہا ہے خود مجھے ایک دفعہ اس منحوس ہندسے کا تجربہ ہو چکا ہے۔ لیکن خیر ہٹایئے ہم خواہ مخواہ اپنی اس دلچسپ دعوت کو غیر دلچسپ بنا رہے ہیں۔''

''ہاں بھائی!'' مارچیز جیالدرو نے کہا۔ ''ہم کوئی بوڑھی عورتیں تو ہیں نہیں کہ ایسی باتوں سے شگون لے کر خوف سے کانپنے لگیں۔ صاحبو! اپنے اپنے گلاس لبریز کر لیجئے۔ بٹلر! سب کے گلاس بھر دو۔ ارے لوگو! ایسی شاندار دعوتیں بار بار نہیں دی جاتیں چنانچہ کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ جانے پھر کب مل بیٹھنا نصیب ہو۔ آیئے۔ اپنے میزبان کونتے سیزر اولادیہ کی خوش اور صحت کا جام پیا جائے۔''

اور اس نے اپنا جام اٹھایا۔ سب نے اس کی تقلید کی اور خوشی کے نعروں کے ساتھ میری خوش اور صحت کا جام پیا گیا اور ایک بار پھر دنیا جہاں کی باتیں ہونے لگیں اور ہنسی کی آواز گونجنے لگیں اور بظاہر میرے مہمان اس منحوس ہندسے کو اور اس کی بدشگونی کو بھول گئے۔

کھانا ختم ہوا اور مٹھائی اور پھل پیش کئے گئے اور ساتھ ہی وہ بہترین قیمتی اور کم یاب شرابیں بھی جو میں نے خاص اس موقع کے لئے منگوائی تھیں اور سخت تاکید کر دی تھی کہ انہیں نفل کے ساتھ یعنی آخر میں پیش کیا جائے۔

اور میرے مہمان ان شرابوں پر صحیح معنوں میں ٹوٹ پڑے اور اس کا دور ایسا چلا کہ معلوم ہوتا تھا رات بھر جاری رہے گا اور ہر شخص اپنی کرسی پر سے اٹھنے کے قابل نہ رہے گا اور جہاں بیٹھا ہے وہیں لڑھک جائے گا۔

اور اب سب کی زبانیں کھل گئی تھیں۔ سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے، ہاتھ ہلا رہے تھے، سر جھٹک رہے تھے اور شراب نوشی سے ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔

میں نے یہ سب دیکھ اور اطمینان کا لمبا سانس لیا اندازہ لگایا کہ زیادہ سے زیادہ دو تین منٹ بعد ہی میں اپنا آخری اور ترپ کا پتہ پھینک سکوں گا جو میں اس شام سے بڑے صبر سکون سے اپنے ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔

میں جیدو کی ایک ایک حرکت کا غور سے مطالعہ

کررہا تھا۔ اس نے اپنی کرسی میری کرسی سے ذرا دور کھسکالی تھی اور خود قدرے آگے کی طرف جھکا، پڑوسی کپتان دی حامالی سے بڑے رازدارانہ انداز میں باتیں کررہا تھا۔ اس کی آواز نیچی اور بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود میں سن رہا تھا کہ وہ کسی عورت کا ظاہری حسن، چاتیوں اور دوسرے اعضاء کی تعریف نہایت ہی فحش لفظوں میں کررہا تھا۔ کون سی عورت کی یہ تعریف کی جارہی تھی۔ یہ میں نے سوچنا ضروری نہ سمجھا۔ البتہ یہ خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے دماغ میں کوند گیا کہ جیدو اس شخص دی حامالی کے اسمنے میری بیوی کے حسن و جسم کی تفصیلات بیان کررہا تھا۔ جیدو کے نزدیک اس دنیا میں اور آسمانوں میں کوئی چیز بھی مقدس اور قابل احترام نہ تھی۔ یہ شخص حامالی اول درجہ کا بے دین اور اوباش تھا۔

اور میری رگوں میں خون سنسنانے لگا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ اس وقت کھولتا ہوا خون کسی شدت سے میری کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا اور میرے ہاتھ اور پاؤں برف کی طرف ٹھنڈے ہورہے تھے۔ میں اپنی کرسی میں سیدھا ہو بیٹھا اور میز پر چمچہ بجا کر لوگوں کو خاموش کرنے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن آوازوں کا شور، اور زبانوں کے چٹاخ لینے کی آوازیں ایسی تھیں کہ میں اپنے مقصد میں کامایب نہ ہوا۔ ڈیوک نے اس کوشش میں میرا ساتھ دیا۔ لیکن اس غریب کو بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

آخر کار جیدو چونکا، وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر گھوم گیا۔

اور نقل کا بڑا چمچہ اٹھا کر میز پر اور خود اپنی پلیٹ پر اتنی آواز کے ساتھ اور یوں مسلسل بجایا کہ قہقہے اور بولنے کی آوازیں یک لخت تھم گئیں۔

وہ گھڑی آ گئی تھی۔

میں نے اپنا سر اٹھایا، کالا چشمہ ٹھیک سے اپنی ناک کی ڈنڈی پر کھسکا کر آنکھوں پر جمایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے اور صاف اور ذرا بلند آواز میں بولنا شروع کیا۔ لیکن پہلے کنکھیوں سے جیدو کی طرف دیکھا اور وہ اپنی کرسی میں پھیل کر اور پشت سے تیک لگا کر کاہلی سے بیٹھ گیا تھا اور سگریٹ سلگا رہا تھا۔

''دوستو!'' میں نے کہنا شروع کیا اور ان تمام سوالیہ اور متجسس نگاہوں کے جواب میں مسکرایا جو مجھ پر مرکوز تھیں۔ ''میں نے آپ کی ہنسی دل لگی میں مخل ہونے کی جرات کی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ آپ حضرات کو اس سے محروم کردوں بلکہ اس لئے کہ اسے دوبالا کردوں جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ آپ حضرات کو آج رات میں نے یہاں اس لئے مدعو کیا ہے کہ میری عزت افزائی ہو اور ساتھ ہی ہم سب مل کر ہمارے دوست سگنور جیدو فیراری کا ان کی شایان شان استقبال کریں۔''

اور یہاں لوگوں نے ''واہ! واہ!'' کے نعرے لگائے اور زور زور سے تالیاں بجائیں اور خود جیدو نے سگریٹ کے دو کشوں کے درمیان بڑبڑا کر غالباً شکریے کے الفاظ کہے۔

''ہمارا نوجوان اور شریف اور باکمال دوست، جو ہمارے حلقے میں ہردلعزیز ہے۔'' میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''چند در چند گھریلو وجوہات کی بنا پر چند ہفتوں کت ہمارے شہر سے باہر رہے۔ چنانچہ ہمارے حلقے سے غائب رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ خود ہمارے دوست کو بھی پتہ ہوگا کہ ہم لوگ ان کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے رہے۔ بہرحال مجھے خوشی ہے اور بلاشبہ آپ کے لئے بھی یہ خوشی کی بات ہوگی کہ سگنور جیدو فیراری خاصے امیر بن کر لوٹے ہیں۔ یہ دولت انہیں بجا طور پر ملی ہے اور بے حد مناسب وقت پر ملی ہے اور اس بے پناہ دولت کے مالک بن کر اب ہمارے نوجوان دوست وہ انعام طلب کرنے یہاں آئے ہیں جس کے یہ مستحق ہیں۔''

یہاں پہلے سے بھی زیادہ زور سے زیادہ دیر تک تالیاں بجائی گئیں اور خوشی کے کلمات کہے گئے اور ان لوگوں نے، جو جیدو کے قریب بیٹھے ہوئے تھے، اس کی صحت کے جام پیئے اور اسے مبارکباد دی۔ لوگوں کے خوشی کے کلمات اور مبارکبادوں کا جواب جیدو نے بے

حد خود اطمینانی اور بے پروائی اور تکبر سے ہلا کر دیا۔

میں نے ایک بار پھر کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ کس قدر پرسکون اور مطمئن تھا وہ...... آرام سے اپنی کرسی کی سرخ اور نرم گدی میں دھنسا ہوا تھا، اس کا چہرہ ذرا اوپر اٹھا ہوا تھا، حالانکہ اس کی خواب ناک آنکھیں اس کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف تھیں جس میں سے خلیج نیپلز دکھائی دے رہا تھا جس کے پانیوں پر چاندنی لہریں لے رہی تھیں۔

میں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''صاحبو! آج رات میں نے آپ کو اس لئے مدعو کیا ہے کہ سگنور جیدو فیراری کی واپسی پر انہیں مبارکباد دی جائے اور اس کی شایان شان ان کا استقبال کیا جائے جیسا کہ آپ سب نے کیا...... چنانچہ ہمارے اس جشن کی ایک وجہ تو یہ تھی۔ یلکن اس کی ایک دوسری وجہ بھی ہے جو میں آپ کو بتانے جارہا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ اس دعوت کی اور آپ سب کو یہاں جمع کرنے کی اہم اور خاص وجہ یہ ہے کہ آپ کو اپنی خوشیوں میں شریک کرسکوں اور ایک بات کا اعلان کرکے جس کا تعلق تنہا میری ذات اور مستقبل سے ہے، آپ حضرات کی دعائیں اور نیک تمنائیں شامل حال کرسکوں۔''

اور اب ہر شخص خاموش تھا اور نہایت غور اور توجہ سے میرا ایک ایک لفظ سن رہا تھا اور نگاہیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''میں جو کہنے جارہا ہوں وہ شاید آپ کو حیرت میں ڈال دے گا۔ آپ لوگ مجھے ایک کم گو، خاموش طبع اور ایک بد دماغ اور منہ پھٹ آدمی کے طور پر جانتے ہیں اور......''

''نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔'' بہت سی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ اور پھر چاروں طرف سے مجھے اپنی تعریف میں بڑے شاعرانہ قسم کے جملے اور الفاظ سنائی دیئے۔ لوگ جب میری مداح سرائی کرکے خاموش ہوئے تو میں نے کہا۔

''...... یہ تو آپ حضرات کی ذرہ نوازی ہے تاہم آپ نے بلاشبہ مجھے عاشق مزاج تو کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا اور نہ ہی آپ کے وہم وگمان میں یہ بات ہوگی کہ میں کبھی کسی حسینہ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوسکتا ہوں۔''

اور میں نے دیکھا کہ میرے مہمان حیرت اور بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جیدو نے اپنے ہونٹوں کے درمیان سے سگریٹ نکال لیت ھی اور اب وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''میں بوڑھا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میری نظر اتنی کمزور ہے کہ میں نصف اندھا ہوں اور کوئی بدصورت سے بدصورت عورت بھی مجھ پر نگاہ غلط انداز ڈالنے سے زیادہ اور کچھ نہ کرے گی۔ لیکن میری ملاقات ایک ایسی خاتون سے ہوئی جو صورت اور سیرت میں فرشتہ ہے، جس کو میں ناپسند و ناگوار نہیں معلوم ہوا بلکہ اس کو میں اچھا معلوم ہوا، اس نے مجھے پسند کیا اور اب میں اس خاتون سے شادی کرنے جارہا ہوں۔''

کمرے میں حیرت ناک سناٹا طاری ہوگیا، جیدو جو آرام سے اور پھیل کر بیٹھا ہوا تھا، سیدھا ہو بیٹھا، اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن پھر اپنا ارادہ بدل کر خاموش ہورہا اور...... میں نے دیکھا اس کے چہرے کا رنگ ذرا اڑ گیا تھا۔

میرے میزبانوں پر جو بے یقینی اور حیرت طاری ہوگئی تھی۔ وہ ایک لہر کی طرح آئی اور گزر گئی اور کمرہ ''مبارک۔ مبارک۔'' کی آوازوں اور خوش مذاقیوں لطیفوں اور ہنسی کی کھنکھناہٹ سے گونج اٹھا۔

لیکن جیدو خاموش تھا۔

''تو اب رنگ رلیاں اور عیش ونشاط کی محفلیں ختم ہوئیں، الوداع کہو انہیں میرے دوست کونتے۔'' شیوالیر ماسینی نے چیخ کر کہا۔ ''ایک دفعہ عورت کے لباس کی ریشمی سرسراہٹوں سے مسحور ہوگئے۔ میرے دوستت و پھر کبھی ایسی دلچسپاور خوش باش محفلیں نہ ہوں

گی جیسی کہ آج رات اور اس وقت ہو رہی ہے۔'' اور اس نے اداسی سے سر ہلایا۔

''خدا کی قسم۔'' جیالسدرو نے کہا۔ ''تمہارے انکشاف نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم دنیا کے وہ آخری آدمی ہو گے۔ جو کسی عورت کی قربان گاہ پر اپنی آزادی بھینٹ چڑھا دے گا اور وہ بھی صرف ایک عورت کی خاطر! کیا احمقانہ فیصلہ کیا ہے میرے دوست کونتے۔ ارے میاں! آزاد رہو تمہیں دس عورتیں ملیں گی..... ہر دن ایک نئی اور ہر رات ایک نئی عورت...''

''ہائے۔'' سالوستری نے بے حد جذباتی لہجے اور نرم آواز میں کہا۔ ''لیکن ایک تراشیدہ ہیرا..... ایک خوبصورت اور بے داغ موتی۔''

''چہ۔ سالوستری تم نشے میں ہو۔'' جیالدرو بولا۔

''یہ تم نہیں بلکہ شراب بول رہی ہے۔ تمہیں بوتل نے فتح کر لیا ہے۔ امیگو۔ حیرت ہے کہ تم ایک عورت کا بن کر رہنے کی بات کر رہے ہو۔ حالانکہ تم ٹیپلز کی تمام بیاہتا اور بن بیاہی عورتوں کے دلبر ہو بڑے شرم کی بات ہے سالو میں اب بھی اپنے دونوں ہاتھ میز پر ٹیکے اور ذرا آگے کی طرف جھکا کھڑا تھا۔

''ہمارے دوست جیالدرو نے سچ ہی کہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''جنس لطیف سے میری نفرت مثال بن چکی ہے اور اس معاملہ میں بہت زیادہ مشہور بلکہ یوں کہئے کہ بدنام ہوں۔ لیکن جب دنیا کی حسین ترین عورتیں مجھے لبھانے کے لئے نہ صرف باہر نکل آئی بلکہ اپنی روش اور اصول بھی بدل دیتی ہے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے جب وہ خود ہی اپنی ساحرانہ اور بے پناہ عشوہ طرازیوں کو بروئے کار لے آتی ہے۔ جب اپنی خاص الخاص مہربانیاں مجھ پر نچھاور کر دیتی ہے اور مجھے کھلم کھلا حرکتوں اور دوٹوک باتوں سے یہ احساس دلا رہی ہو کہ میں نرا احمق، ٹھس اور پتھر ہوں کہ اس شادی کی درخواست نہیں کر رہا تو پھر دوستو! میں سوائے اس کے اور کیا کر سکتا ہوں کہ اپنی اس خوش بختی کو قبول کر لوں جو خود خدا نے میری راہ میں ڈالی ہے۔؟ خدا کی عنایت کردہ اس رحمت کو اگر میں قبول نہ کرتا تو دنیا کا سب سے زیادہ ناشکرا انسان اور سب سے مغرور اور باغی بندہ ہوتا اور مجھے اعتراف ہے کہ میں اس عطیے کو قبول نہ کرنے کی جرات نہ کر سکا۔ جو میرے نزدیک میری زندگی کی مسرتوں کو مکمل کر دینے والا ہے اور جو مجھے یقین ہے کہ میرے مستقبل کو درخشاں کر دے گا۔ چنانچہ دوستو! میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنے جام بھر لیں تاکہ میری ہونے والی دلہن کی صحت اور مسرتوں کا جام پیا جائے۔''

اور سب سے پہلے جیالدرو اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنا چھلکتا ہوا جام اوپر اٹھایا۔ دوسرے مہمانوں نے اس کی تقلید کی۔ جیدو اٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ قدرے ڈول رہا تھا اور اس کا وہ ہاتھ کانپ رہا تھا جس میں اس نے شامپین کا لبریز جام پکڑ رکھا تھا۔

ڈیوک دی مارینا نے کمر میں سے جھک کر اور بڑے احترام کے ساتھ مجھے مخاطب کیا۔

''کونتے! اب آپ اس حور اور پری کا نام بتائیں گے جس کی صحت اور خوشیوں کا جام ہم پینے جا رہے ہیں۔''

''میں خود بھی پوچھنے والا تھا۔'' جیدو نے کہا۔ اس کی آواز موٹی تھی اور زبان ذرا لڑکھڑا رہی تھی۔ ''غالباً ہم لوگ اس خوش نصیب حسینہ سے واقف نہیں ہیں۔''

''اس کے برخلاف۔'' میں نے جیدو کو بے حد سرد نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس خاتون سے بخوبی واقف ہیں۔'' اور اب میری آواز بلند ہو کر کمرے میں گونجنے لگی۔ ''دوستو! یہ جام ہے میری منگیتر اور ہونے والی بیوی کونتس رومانی کے نام۔''

''جھوٹا'' جیدو چیخا۔

(جاری ہے)

پرچھائیاں

شیخ معین اختر - چنیوٹ

رات کافی ہوچکی تھی لیکن سنسان سڑک پر گاڑی چلاتے ہوئے اسے آسانی ہورہی تھی اچانک نوجوان کی نظر بیک مرر پر پڑی تو دیکھا کہ ایک ٹرک گاڑی کے قریب آرہا تھا کہ اچانک.....

ایک ایسی حقیقت جسے دل و دماغ کسی صورت قبول نہیں کرتا تھا، مگر یہ حقیقی واقعہ ہے

"بچاؤ..... بچاؤ..... امی..... امی مجھے اس آدمی سے بچاؤ۔" وہ کوئی آٹھ سال کا بچہ تھا جو جھاڑیوں میں اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا۔ وہ ایک پھٹی ہوئی بنیان اور نیکر میں ملبوس تھا۔ ننگے پاؤں وہ رات کے اندھیرے میں اندھا دُھند بھاگے جارہا تھا۔ اپنی ماں کی تلاش میں وہ مسلسل جدو جہد میں لگا ہوا تھا۔

"امی..... ا.....م.....ی.....امی ی ی....."

سارنگ ایک جھٹکے سے نیند سے بیدار ہوگیا۔

"کیا ہوا بیٹا.....؟ سارنگ کی ماں اسے گود میں سمیٹ کر سارنگ کے پاس بیٹھ گئی۔ زاہدہ بیگم پوری رات سارنگ کے پاس ہی بیٹھی تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ آج کل سارنگ سوتے ہوئے ڈر جاتا ہے۔

"ماما..... وہ بچہ کیوں آتا ہے میرے خواب میں، میں کیا لگتا ہوں اس کا۔" 24 سالہ سارنگ بچوں کی طرح

زبیدہ بیگم کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ اور زبیدہ بیگم پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

''وہی جنگل وہی بچہ چیختا چلاتا، اِدھر اُدھر دوڑتا۔ اپنی ماں کو ڈھونڈتا امی..... امی اور وہ بچہ..... پھر اچانک کوئی آدمی تلوار لیے آتا ہے اور اس بچے کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے وہ ننھا سا وجود خون میں لت پت مرجھائے ہوئے پھول کی طرح زمین پر گر جاتا ہے۔ وہ آدمی ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہے اور تلوار لہراتے ہوئے واپس چلے جاتا ہے۔

''پانچ سال..... بہت بڑا عرصہ ہوتا ہے مما..... مما میں پانچ سال سے بس یہ ہی خواب دیکھ رہا ہوں میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا سوائے اس ایک خواب کے۔''

سارنگ چھت کو گھورتے ہوئے بولا۔

''بیٹا جانی یہ آپ کا وہم ہے۔ یاد ہے بچپن میں ایک بار میں آپ کے ڈیڈی اور آپ کینیڈا گئے تھے۔ واپسی پر آپ ائیر پورٹ پر گم ہو گئے تھے۔ آپ کے ڈیڈی کو پولیس والوں نے اطلاع دی کہ انہیں پارک سے کسی بچے کی لاش ملی ہے آپ کے ڈیڈی پریشانی میں نکلے اور راستے میں ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ ہمیں چھوڑ کر اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ اسی دن تم بھی مل گئے..... آہ..... بس اسی واقعے کا اثر آپ کے دماغ پر ہو گیا ہے۔'' زبیدہ بیگم نے ایک سرد آہ بھری۔

''لیکن مما..... میں تو بہت چھوٹا تھا اس وقت شاید مجھے چلنا بھی نہیں آتا تھا اور سائنس کہتی ہے کہ بچے اپنی یادداشت زیادہ دیر برقرار نہیں رکھ سکتے اتنی عمر میں۔'' اب سارنگ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''اور سائنس یہ بھی کہتی ہے کہ ہمارا دماغ جو کچھ بھی سنتا ہے وہی خواب بنتا ہے۔ ویسے بھی خواب میں تین چیزیں آتی ہیں۔

ڈر، خواہش، اور دن بھر کی مصروفیات۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں آتا خواب میں اور بیٹا تم کسی سے ان باتوں کا ذکر مت کرنا کیونکہ لوگ بڑی آسانی سے پاگل کا لقب دے کر چلتے بنتے ہیں یہ تک نہیں سوچتے کہ اگلے پر کیا بیتے گی۔ تم یہ پانی پیو۔ اور آرام سے لیٹ جاؤ۔ فجر کا وقت ہونے والا ہے نماز پڑھ کر سونا۔ بلکہ پارک میں واک کے لئے چلے جانا۔ فریش ہو جاؤ گے۔'' زبیدہ بیگم نے پانی کا گلاس سارنگ کو پکڑایا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ زبیدہ بیگم کمرے میں آ گئیں اور دروازہ لاک کر کے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ سائیڈ دراز کھولا اور اپنے شوہر جمشید کی تصویر نکالی۔

''میں تھک گئی ہوں جمشید۔ بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ آپ اتنی جلدی کیوں چلے گئے۔ آپ کا بزنس سنبھالا یہ سوچ کر کہ سارنگ بڑا ہو کر میرا سہارا بنے گا اور آپ کا بزنس سنبھالے گا پر یہ کیسے خواب ہیں جو میرے سارنگ کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کا وہم اس کو کھا رہا ہے وہ ذہنی مریض بن جائے گا۔ جمشید میں کیا کروں۔'' زبیدہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

☆.....☆.....☆

کانوں میں ہیڈ فون لگائے اس نے اپنی گولڈن پونی ٹیل کو ٹائٹ کیا۔ جوگرز کے تسمے اچھی طرح باندھنے کے بعد وہ ایک کھلی جگہ پر آ گئی۔ پنک سن گلاسز ٹراؤزر کی جیب میں رکھتے ہی اس نے Tabata Work Out اسٹارٹ کیا۔

''Can I Join You?'' وائٹ ٹراؤزر میں ملبوس وائٹ ٹی شرٹ کو ٹھیک کرتے ہوئے سارنگ بولا۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' مترنم سی آواز میں وہ لڑکی بولی۔

''ایکچولی آپ کے گلاسز.....!''

''جی مجھے پتہ ہے میرے گلاسز بہت خوبصورت ہیں میرے بھائی نے تحفہ دیا ہے۔ خوبصورت تو ہوں گے۔'' وہ لڑکی تیزی سے سارنگ کی بات کاٹ کر بولی۔

''نہیں میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ آپ کے گلاسز مجھے.....''

''نہیں جناب میں اپنے گلاسز نہیں دے سکتی یہ علی بھائی نے مجھے دیئے ہیں اور ویسے بھی یہ لیڈیز ہے یار.....'' وہ محترمہ پھر سارنگ کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''اچھا..... اچھا!! تو آپ کو میرے گلاسز اپنی گرل

فرینڈ کے لئے چاہیئے یا پھر آپ نے اپنی بہن کو دینے ہیں دیکھئے جناب اگر تو.....!"

"محترمہ آپ کی عینک نیچے گری ہوئی ہے۔" اس بار سارنگ نے بات کاٹی۔ جس پر وہ جلدی سے نیچے سے اپنا عینک اٹھانے لگی اور ہنس پڑی۔

"ویسے کتنا ٹائم ہو گیا ہے آپ کو ٹباٹا کرتے ہوئے؟" سارنگ وارم اپ کرتے ہوئے بولا۔

"میں اور میری کزن مائرہ ہم دونوں جم جاتے تھے۔ وہاں سے اور کچھ Internet سے مدد لی۔ پھر مائرہ واپس راولپنڈی چلی گئی اور میں اکیلی بور ہونے لگی میں نے جم چھوڑ دیا۔" وہ لڑکی اب تولیے سے اپنا پسینہ صاف کرنے لگی۔

"جناب میں تو گھر جانے لگی ہوں پاپا اور ممانا شتے پر میرا ویٹ کر رہے ہوں گے۔"

"اچھا جی..... جیسے آپ کو ٹھیک لگے۔" سارنگ نے رومال سے پسینہ صاف کیا۔

"ارے محترمہ اپنا نام تو بتاتی جائیں۔" سارنگ اونچی آواز میں بولا۔

"سحر....." وہ لڑکی مسکراتے ہوئے بولی اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ "سحر....." سارنگ زیر لب مسکرایا اور وہ بھی گھر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

"ناشتہ تیار ہے مما؟ بہت بھوک لگی ہے۔" سارنگ فریش ہو کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔

"جی بیٹا....." زبیدہ بیگم بھی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئیں۔

"شمیم سارنگ کے لئے چیز سینڈوچ لے کر آؤ۔" زبیدہ بیگم نے فرائیڈ ایگ سارنگ کی طرف بڑھائے اور زبیدہ بیگم کا حکم سنتے ہی شمیم سر جھکائے کچن میں چلی گئی۔

"سارنگ آج تم نے میرے ساتھ آفس جانا ہے۔ اور میں نے کاظمی صاحب سے کہا ہے کہ وہ تمہیں کام سمجھا دیں گے۔" زبیدہ بیگم نے بریڈ پر مکھن لگایا۔ جس کے جواب میں سارنگ نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆

"ارے یہ ریڈ والی دکھاؤ۔" سارنگ نے جانی پہچانی آواز سنی تو کھڑکی سے جھانکا۔ جہاں سگنل پر سحر کسی چوڑیوں والی کے پاس بیٹھی تھی۔

"پاں..... پاں....." سگنل آن ہوتے ہی سارنگ کے پیچھے والی گاڑی نے ہارن دیا۔ سارنگ نے اپنی گاڑی ذرا آگے جا کر سائیڈ پر لگائی۔

"سحر آپ..... کیا کر رہی ہو؟" سارنگ نے بلیک گلاسز لگاتے ہوئے کہا۔

"یار آپ تو پارک والے ہو نا....." سحر نے سارنگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں پارک والا نہیں ہوں۔ میرا نام سارنگ ہے۔" سارنگ نے ہنستے ہوئے کہا۔ جس کے جواب میں سحر بھی ہنس پڑی۔ سارنگ وہیں اسٹاپ پر پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور سحر کے گورے ہاتھوں میں لال چوڑیاں دیکھنے لگا۔

"یہ..... یہ چوڑی....." سارنگ نے نیلے رنگ کی چوڑی اٹھائی۔

"بابو یہ راجھستانی چوڑیاں ہیں۔ پرانے وقتوں میں ہندو مہارانیاں بہت شوق سے یہ چوڑیاں پہنتی تھیں۔ پھر وقت گزرتا گیا اور وقت کے ساتھ ان کی قدر و قیمت بھی کم ہو گئی۔" چوڑیوں والی نے نیلے رنگ کی چوڑیاں اپنی تھال سے اٹھا کر سارنگ کو دکھائیں۔

"امی..... امی بچاؤ..... بچاؤ....."

سارنگ کا دماغ گھوم گیا اسے وہ خواب پھر سے یاد آنے لگا۔ وہ چوڑی اس نے خواب میں دیکھی تھی۔ وہ ہکا بکا ہوا چوڑیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ بجلی کی تیزی سے اٹھا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سحر بھی اس کی غیر معمولی حالت دیکھ کر اس کی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا....." سحر نے اپنے ہینڈ بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر سارنگ کی طرف بڑھائی ایسا کیوں ہے یہ سب میں..... میں نہیں جانتا۔" سارنگ بوکھلا گیا۔ تھوڑی دیر میں سارنگ سیٹ ہو گیا۔ لیکن وہ خاموش تھا۔

''مسٹر سارنگ میری یونی ورسٹی کا ٹائم تو نکل چکا ہے ایسا کریں کہ ہم کسی کافی شاپ پر چلتے ہیں، وہاں سے فریش ہوکر لانگ ڈرائیو پر چلیں گے۔'' سحر نے سارنگ کی خاموشی توڑنا چاہی پورا دن سحر کے ساتھ گزارنے کا سوچ کر سارنگ آفس کو بھول گیا۔ پھر قریب ہی کافی شاپ پر گاڑی روکی اور کافی پینے لگے۔

''آپ مجھے اپنا دوست مانتے ہیں۔'' سحر نے کہا۔

''جی بالکل.....'' سارنگ نے جواب دیا۔

''ہاہاہا.....نہیں آپ مجھے اپنا دوست نہیں مانتے۔'' سحر نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

''سحر کچھ چیزیں بہت پرسنل ہوتی ہیں۔'' سارنگ نے سحر کا ارادہ بھانپتے ہوئے کہا۔

''اور ویسے بھی میں تو خود الجھن کا شکار ہوں آپ سے کیا کہوں۔''

''Am going.....Ok'' سحر نے بیگ اٹھایا اور اٹھنے لگی۔

''یہ کیا بات ہوئی۔'' سارنگ ناسمجھی میں بولا۔

''یہی بات ہے۔ آپ کی پرسنل لائف ہے بھلا میرا کیا کام۔'' سحر ناراضگی کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔ سحر کے ناک سکڑنے پر سارنگ زور سے ہنسا۔ سارنگ نے سحر کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور سلو میوزک لگا دیا۔

''تو بتائیں'' سحر نے سارنگ سے پوچھا۔

اور سارنگ نے الف سے ے تک اپنی ساری کہانی سحر کو سنا دی۔ پورا دن سحر کے ساتھ گزارنے کے بعد شام کو سحر نے سارنگ سے اجازت چاہی۔ سحر کو جاتا دیکھ کر سارنگ اداس ہو گیا سحر بھی سارنگ کی اداسی بھانپ گئی۔ اس لیئے سحر نے سارنگ سے اس کا نمبر لیا اور واپس جانے لگی۔ سارنگ مسکراتا رہا سارنگ نے گاڑی اسٹارٹ کی سحر کا گھر سارنگ کے گھر سے کافی دور تھا۔

رات بھی کافی ہو چکی تھی۔ لیکن سنسان سڑک پر گاڑی چلاتے ہوئے اسے آسانی ہو رہی تھی۔ اچانک سارنگ کی نظر بیک پر پڑی۔ پیچھے سے ایک بدمست ٹرک سارنگ کی گاڑی کی طرف آ رہا تھا۔ سارنگ نے گھبرا کر بیک لائٹس آن کی لیکن وہ ٹرک بدستور گاڑی کے پیچھے تھا۔ سارنگ نے گیئر کو خم دینے کی کوشش کی لیکن گیئر جیم ہو چکا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ گاڑی جس طرف مڑتی ٹرک بھی اسی طرف مڑتا۔ اب گاڑی اور ٹرک میں فاصلہ انتہائی کم رہ گیا تھا۔ سارنگ کو اپنی موت یقینی دکھنے لگی۔ پھر وہ ٹرک سارنگ کی گاڑی سے ٹکرا گیا۔ زوردار جھٹکے کے ساتھ ہی سارنگ کی گاڑی اڑتی ہوئی ہوا میں قلابازیاں کھانے لگی۔

سارنگ کا دماغ گھومنے لگا۔ اچانک سارنگ کو اپنے اردگرد دھواں محسوس ہوا وہ دھواں ایک ہیولے کی شکل اختیار کر گیا۔ وہ ہیولہ سارنگ سے قریب آیا اور سارنگ کو گاڑی سے نکال کر اڑتا ہوا زمین پر آ گیا۔ اس ہیولے نے سارنگ کو بجلی کے کھمبے کے سہارے بٹھایا۔ ہیولے کے نزدیک آتے ہی ساری لائٹ بجھ گئیں۔ اور پوری سڑک اندھیرے میں ڈوب گئی۔ سارنگ کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ ہوش میں تھا اسے اپنے وجود پر ہوا کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر اچانک سارنگ کو لگا کہ کوئی اسے چھو رہا ہے کسی کی گرم سانسوں کا احساس اسے بے چین کر رہا تھا۔ سارنگ آنکھیں بند کیئے محسوس کرتا رہا۔ کوئی اس کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھے تو سارنگ نے جھٹ سے آنکھیں کھول دی۔

''تم.....؟'' سحر کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھ کر سارنگ حیرت سے بولا اور شرمندگی سے سحر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

'' سارنگ بیٹا.....'' زبیدہ بیگم روتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں۔

''مما میں ٹھیک ہوں.....'' سارنگ ماں کو دیکھ کر بولا۔ ''میں اسپتال کیسے آیا مما؟'' سارنگ نے پوچھا۔

وہ جو تمہاری دوست ہے نہ سحر اس کو کسی کا فون آیا تھا۔ سحر جب پہنچی تو تم سڑک کے کنارے بے ہوش پڑے تھے وہ ٹرک اور تمہاری گاڑی آگ میں جل رہی تھی۔ پھر سحر تمہیں ہسپتال لے آئی۔'' مما نے تفصیل بتائی۔

''لیکن ایکسیڈنٹ تو بہت شدید تھا پھر مجھے کچھ ہوا

کیوں نہیں۔'' سارنگ نے اپنا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''خدا کا شکر کرو بیٹا۔'' ممانے سارنگ کے سر پر پیسے وارتے ہوئے کہا۔

''مما سحر کہاں ہے.....؟'' سحر کو نہ پا کر سارنگ نے پوچھا۔

''وہ تو اپنے گھر چلی گئی۔'' شمیم نے سارنگ کو جوس دیتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

''وہاں سے واپس کیوں آ گئی تھی؟'' سارنگ سحر کی آنکھوں میں جھانکا۔

''وہ مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا۔'' سحر نے جواب دیا.....سارنگ نے مسکراتے ہوئے کار کو سائیڈ پر کھڑا کیا اور شیشے بند کیے۔ گاڑی میں A.C آن کرنے کے بعد وہ سحر کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم کیا کر رہی تھی اس دن.....'' سارنگ مسکراتا ہوا بولا۔

''وہ تم سردی سے کانپ رہے تھے نا تو میں.....'' سحر نیچے دیکھنے لگی گئی۔

''میڈم پاکستان میں اگست کے مہینے میں گرمی ہوتی ہے۔'' سارنگ کچھ دیر سحر کو دیکھتا رہا اور پھر آہستہ سے اس کا ہاتھ تھاما۔ سحر کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سارنگ بے اختیار۔

سحر کی گھبراہٹ دیکھ کر ہنس پڑا۔ تم تو ایسے ڈر رہی ہو جیسے میں تمہیں کھا جاؤں گا۔'' سارنگ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں ڈر تو نہیں رہی۔'' سحر نے سارنگ سے نظریں چرائیں۔

''تو پھر کھا جاؤ.....؟'' سارنگ مسکراتے ہوئے بولا جس پر سحر شرما گئی۔ سارنگ نے سحر کو اپنی طرف کھینچا۔

''امی.....امی بچاؤ۔'' سارنگ کے کانوں میں کسی بچے کی آواز ٹکرائی۔ سارنگ نے سحر کو پیچھے کیا اور چاروں طرف دیکھا۔ لیکن ہر طرف محض سنسانی تھی۔ اچانک گاڑی خود بخود اسٹارٹ ہوئی اور تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔ ''سارنگ یہ کیا ہو رہا ہے۔'' سحر نے شیشے کھولنے کی کوشش کی لیکن شیشے جم چکے تھے گاڑی اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ سارنگ گاڑی میں موجود بٹن کو چھیڑنے لگا لیکن سب کے سب بند ہو چکے تھے۔ گاڑی موڑ کاٹتے ہوئے مسلسل چلی جا رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی ماہر ڈرائیور جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔ گاڑی تقریباً آدھے گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد ایک گھر کے سامنے رک گئی۔ رات کے اندھیرے کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ سارنگ نے گاڑی کے دروازے کھولے اور سحر کو لے کر باہر آیا۔

''سارنگ یہ کیا ہے.....'' سحر نے ڈرتے ڈرتے چاروں طرف دیکھا۔

''تم ڈرو نہیں.....میں ہوں نا۔'' سارنگ نے سحر کو حوصلہ دیا اور دونوں دھیرے دھیرے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ گھر کی حالت بہت خستہ تھی۔ وہ کوئی چار منزلہ گھر تھا۔ مین دروازے پر بہت ہی خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھی۔ لکڑی کا بھاری بھرکم دروازہ سحر اور سارنگ کے لیے کھل گیا۔ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ہی بہت سی چمگادڑیں باہر کو آئیں۔ سارنگ اور سحر گھر میں داخل ہوئے۔ دروازے کے ساتھ ہی سیڑھیاں تھیں ہر سیڑھی کے اوپر دیئے رکھے ہوئے تھے۔ جیسے کسی کو پتہ تھا کہ یہاں کوئی آنے والا ہے۔ سارنگ اور سحر سیڑھیوں سے اوپر کی منزل تک پہنچے۔ بڑا سا صحن جس میں بہت سے پلو بنے ہوئے تھے۔ لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں صحن کے عین وسط میں نصب تھیں جس سے نیچے کی منزل میں جھانکا جا سکتا تھا۔

''سارنگ چلو یہاں سے۔'' سحر نے سارنگ کا بازو کھینچا۔

''ہاں ہاں چلو۔'' سارنگ اور سحر واپس سیڑھیوں کی طرف مڑے سارنگ اور سحر نے جیسے ہی واپسی کے لیے سیڑھی پر قدم رکھا اس کے ساتھ ہی گھر کا سارا منظر بدل گیا۔ وہ جالے زدہ گھر یک دم صاف ستھرا ہو گیا۔ سارا گھر اچھی طرح سج گیا رنگ برنگے پردے اور خوبصورت فانوس سے گھر بہت ہی خوبصورت لگ رہا

تھا۔ ہر طرف نقلی پھولوں کی لڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی جشن ہو رہا ہو سحر اور سارنگ ابھی غوطہ اچنبھے میں مبتلا ہی تھے کہ دو سائے نمودار ہوئے وہ دولہا دلہن تھے پھر ان دونوں سایوں کے سامنے بہت سے سائے نمودار ہوئے وہ سائے دولہا اور دلہن کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ سائے رنگین ہونا شروع ہوئے سحر ڈرے ڈرے چاروطرف دیکھ رہی تھی جب کہ سارنگ وہ تو منہ کھولے دلہا اور دلہن کو تکے جا رہا تھا۔ کیونکہ وہ دلہن زبیدہ بیگم اور دلہا جمشید علی تھا۔ سامنے سارنگ کے دادا اور دادی کھڑی تھیں۔ جن کی تصویر اس نے البم میں دیکھی تھیں۔ سب لوگ بہت خوش تھے۔

اچانک بہت تیز ہوا چلی اور سب کچھ بدل گیا۔ اب زبیدہ بیگم گود میں کسی چھوٹے سے بچے کو لے کر بیٹھی تھیں اور جمشید اور اس کے دادا دادی بھی اس کے پاس بیٹھے مٹھائی کھا رہے تھے۔ اور پھر دوبارہ تیز ہوا چلی۔ اس دفعہ سب رو رہے تھے۔ صحن کے عین وسط میں جمسید کی میت پڑی تھی۔ جب میت اٹھنے لگی تو ایک قہرام برپا ہو گیا۔ سارنگ کے دادا بے ہوش ہو گئے۔

جمشید کی میت دفنا کر واپس آئے تو دوسری میت تیار تھی جو کہ سارنگ کے دادا کی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر سارنگ اور سحر کے آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اور پھر تیز ہوا چلی اور سارنگ 18 سال کا ہو چکا تھا۔ اس حویلی نما گھر میں زبیدہ بیگم اپنے اٹھارہ سالہ سارنگ کے ساتھ رہائش پذیر نظر آ رہی تھیں۔ وہ چار منزلہ گھر اب پورا گر چکا تھا۔ اب وہ نئے انداز میں اسٹائلش سی کوٹھی تھی جو آدھی بن چکی تھی اور آدھی بن رہی تھی۔ سارنگ کو اپنا ہم شکل سا وجود نظر آیا۔ وہ سارنگ ہی تھا لیکن 6 سال پہلے کا وہ مزدوروں کے پاس کھڑا تھا گرمی دھوپ اور کام کی وجہ سے وہ کافی تھکا تھکا لگ رہا تھا۔

''صاحب جی یہاں کچھ ہے۔'' ایک مزدور نے بیلچا دیوار میں مارتے ہوئے کہا۔

''کہاں.....؟'' سارنگ کی آواز میں بے زاری تھی۔

''یہاں.....'' مزدور نے پھر سے بیلچا دیوار میں مارا۔

''اوہ یار تم لوگوں کو تو بہانہ چاہئے آرام کا..... پرانے زمانے کا گھر ہے ہندوؤں نے بنایا تھا پھر جب جنگ ہوئی تو وہ اپنا سارا ساز و سامان چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے۔ بس تم ایسا کرو جو بھی ہے ایسے ہی رہنے دو۔ اور کام پورا کرو۔ جلدی کرو۔'' سارنگ کی لاپرواہی دیکھ کر وہ بھی جلدی کام نمٹانے لگ گیا اور اس کے بعد ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا۔ ہوا کی گرد سے سحر اور سارنگ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ہوا بہت تیز تھی۔ جب طوفان تھما تو دونوں نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ سارنگ کے گھر کے بالکل سامنے کھڑے تھے۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ گھر میرا ہی تھا اور مجھے وہ سب کیوں دکھایا گیا۔'' سارنگ خیالوں میں کھویا کھویا بولا۔

''معاف کرنا سارنگ..... یہ تمہاری ذاتی زندگی ہے لیکن میں تمہیں مشورہ دیتی ہوں کہ تم یہ سارا معاملہ اپنی مما سے ڈسکس کرو۔ وہ سب دوسری مخلوق تھیں۔ اور میں نے سنا ہے کہ یہ مخلوق صرف اور صرف مجبوری میں ہی انسانوں کے سامنے آتی ہیں۔ لگتا ہے اب بھی کوئی مجبوری ہے..... تم سمجھ رہے ہو نا۔''

سحر نے سارنگ کی طرف دیکھا۔ اور سارنگ نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

''تم..... تم گھر.....'' سارنگ بولتے بولتے رک گیا۔

''میں چلی جاؤں گی۔ تم آرام کرنا او جلد از جلد یہ سب ٹھیک کرنے کا سوچو۔'' سحر مسکراتے ہوئے بولی اور آئن لائن ٹیکسی منگوا کر اپنے گھر چلی گئی۔ سارنگ نے ہمت کی اور آہستہ آہستہ گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ سارنگ کو اب ایک ایک چیز سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ چلتا ہوا زبیدہ بیگم کے کمرے میں داخل ہوا۔

''شمیم مما کہاں ہیں؟'' زبیدہ بیگم کو کمرے میں نہ پا کر سارنگ نے نوکرانی سے پوچھا۔

''صاحب جی وہ تو دفتر سے ابھی تک نہیں آئیں۔''

شمیم نے سر جھکا کر جواب دیا اور کچن میں چلی گئی سارنگ ماں کے کمرے میں ہی بیٹھ گیا۔ نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ خوابوں کی وادی میں اتر گیا۔

"امی..... امی..... بچاؤ..... امی....." وہ بچہ اپنی ماں کو پکارتا، کھیتوں میں ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا۔ لیکن اس کی ماں اسے نہیں مل رہی تھی۔

"امی..... امی..... امی ی ی....." اچانک جھاڑیوں سے کوئی آدمی تلوار گھماتا ہوا آیا اور اس بچے کو دبوچ لیا۔ اس آدمی نے ایک ہی لمحے میں بچے کا سر گردن سے جدا کر دیا۔ اور پھر وہ خوشی سے نہال واپس چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سارنگ کی آنکھ کھل گئی۔ اب سارنگ ڈر سے زیادہ حیرت میں مبتلا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور نیچے پہنچا۔

"شمیم مما کہاں ہیں..... شمیم۔" سارنگ نے غصے سے شمیم کو بلایا۔

"صاحب جی وہ آپ کے کمرے میں ہیں۔" شمیم بھاگتی ہوئی آئی۔ سارنگ بجلی کی تیزی سے کمرے کی طرف گیا۔

"مما..... مما وہ پاپا..... پاپا نے اس بچے کو مار دیا۔ مما آج میں نے خواب میں اس تلوار والے آدمی کا چہرہ دیکھا۔ وہ پاپا تھے مما۔" سارنگ بھاگتا ہوا زبیدہ بیگم کے پاس آیا جو البم دیکھنے میں مگن تھیں۔

"بیٹا آپ کل ڈاکٹر کے پاس جانا کیا یہ خواب کم تھے جو تم نے اپنے پاگل پن کا ثبوت دینے کے لئے اپنے مرے ہوئے باپ پر الزام بھی لگانے شروع کر دیئے۔" زبیدہ بیگم کے لہجے میں سختی آ گئی تھی۔

"الزام نہیں ہے..... حقیقت ہے۔ میری کیفیت کو کیوں نہیں سمجھ رہی آپ، مما میں کھڑے کھڑے ماضی میں پہنچ جاتا ہوں آپ کے..... پاپا کے ماضی میں مما میں پاگل نہیں ہوں۔ وہ تلوار والا شخص میرا باپ ہی تھا اور اس حقیقت کا پتا اب میں لگا کر رہوں گا۔" سارنگ نے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور باہر نکل گیا اور زبیدہ بیگم سر پکڑے روتی رہیں۔

"سحر مجھے تمہاری مدد چاہئے۔" سارنگ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سحر کو فون ملایا۔

☆.....☆.....☆

سارنگ تمام تر مزدوروں کو لے کر اوپر والی منزل میں آ گیا۔ یہ زبیدہ بیگم کا کمرہ تھا جس میں سے تمام تر ساز وسامان ہٹا کر کمرے کو بالکل خالی کر دیا گیا تھا۔ اب مزدور توڑ پھوڑ شروع کر رہے تھے۔ کمرے کی چاروں دیواریں گرانے کے بعد اب فرش کی باری تھی۔ ساری ٹائلز اکھاڑنے پر سیمنٹ کی تہہ اتاری گئی۔ پھر فرش کی توڑ پھوڑ شروع ہو گئی۔ سارا فرش اتر گیا لیکن اس چیز کا سراغ نہ مل سکا۔ پھر سارنگ کے کمرے کی باری آئی اس کمرے کو بھی خالی کر کے کھدائی شروع ہوئی اور آخر سارنگ کے کمرے سے کامیابی حاصل ہو ہی گئی۔

"مل گیا صاحب۔" مزدور کی آواز سنتے ہی سارنگ دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ دو مزدوروں نے مل کر مٹی کے اندر سے چھوٹا سا صندوق نکالا۔ سارنگ نے احتیاط سے صندوق اٹھایا اور نیچے کی منزل میں آ گیا۔ جہاں ایک مولوی زبیدہ بیگم اور سحر کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مولوی صاحب نے صندوق اپنے سامنے رکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا۔ اس کے بعد صندوق کا ڈھکن آرام آرام سے کھولا۔ صندوق سے تیز روشنی نکلی۔ روشنی سے چاروں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ صندوق ہیرے وا جواہرات سے بھرا پڑا تھا۔ سارنگ حیرت سے صندوق دیکھنے لگا۔

"یہ سب....." سارنگ نے مولوی کی طرف دیکھا۔

"رکو..... سحر نے سارنگ سے کہا۔

"سارنگ دیکھو یہ ہندوستانی اٹیک ہے۔ پرانے وقتوں میں راجہ مہاراجہ اس طرح کے صندوق استعمال کرتے تھے۔ میں نے کل ریسرچ کی تھی وہ لوگ صندوق کو دو حصوں میں استعمال کرتے تھے۔ مطلب وہ صندوق کی دو منزل کرواتے تھے۔ دیکھو کہیں کوئی بٹن وغیرہ ہو گا۔" سارنگ نے صندوق ٹٹولا۔

"ہاں یہ رہا....." سارنگ خوشی سے بولا۔

"لیکن یہ تو لاک ہے۔ اس کا پاسورڈ چاہیے ہو گا۔"

سحر مایوسی سے بولی۔

"کیا کریں......" سارنگ اور سحر سوچنے لگے۔

"6666" زبیدہ بیگم جو کافی دیر سے خاموش تھیں اچانک بولیں۔ سارنگ اور سحر منہ کھولے زبیدہ بیگم کو دیکھنے لگے۔ مولوی صاحب نے کورڈ لگایا اور چرچراہٹ کی آواز سے صندوق بڑا ہو گیا۔ اب صندوق کے ہیروں والا حصہ اوپر کو اٹھنے لگا۔ آہستہ آہستہ اوپر والا حصہ بالکل سیدھا ہو کر رک گیا۔ نیچے ایک کپڑا تھا۔ مولوی صاحب نے اونچی آواز میں تلاوت کرتے ہوئے وہ کپڑا اٹھایا کپڑا بہت بوسیدہ ہو چکا تھا۔ کپڑے میں کسی بچے کی ہڈیاں تھیں۔

"سارنگ صاحب...... یہ بھی ملی ہے اسی فرش سے۔" ایک مزدور بھاگتا ہوا آیا اور سارنگ کو کچھ پکڑایا سارنگ نے ہاتھ پر دیکھا تو وہ نیلے رنگ کی چوڑی کا ٹکڑا تھا۔

"یہ سنگیتا کی چوڑی ہے۔" زبیدہ بیگم چوڑی دیکھتے ہوئے بولیں۔ "سچ سامنے آ ہی جاتا ہے۔ دیکھو ذرا...... آج 26 سال بعد سچ سامنے آ گیا۔ حالانکہ ہم نے پوری کوشش کی تھی۔ سچ واقعی بہت طاقتور ہوتا ہے۔" زبیدہ بیگم رونے لگیں۔

"میں جانتا تھا مما...... آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔ اب تو بول دیں۔" سارنگ التجائی نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔

"آج سے 25 سال پہلے جمشید اور میں بہت ہی معمولی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہم جس گاؤں میں رہتے تھے اس گاؤں میں ایک بیوہ مہارانی رہتی تھی۔ جمشید نے اور میں نے پلاننگ کر کے جمشید کی شادی سنگیتا سے کر دی۔ وہ بہت اچھی خاتون تھی اس نے اسلام قبول کیا، اس کا پہلے سے ایک بیٹا تھا جو اس کی جائیداد کا اکیلا وارث تھا۔

ایک دن جمشید نے سیر کا بہانہ کر کے سنگیتا کے بچے کو باہر لے گیا اور اس کو تلوار سے قتل کر دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہندو مسلم تنازعے میں بچے کا قتل نظر انداز ہو جائے گا۔ لیکن سنگیتا کو اس کی بھنک پڑ گئی اور اس نے جمشید سے جھگڑا کیا۔ جمشید نے غصے میں سنگیتا کو چھری مار دی۔ اب ہم گھبرا گئے اور ہم نے جھاڑیوں سے بچے کی لاش نکال کر صندوق میں چھپا دی اور سنگیتا کی لاش پانی میں بہا دی...... ہم سنگیتا کی حویلی میں رہنے لگے۔

ایک سال بعد جب سب ٹھیک ہو گیا تو میں نے اور جمشید نے شادی کر لی لیکن سنگیتا کے بچے کی روح سارنگ کے پیچھے پڑ گئی۔

سارنگ کو جب پہلی بار خواب آیا تو میں سمجھ گئی کہ اب سنگیتا کا بچہ اپنا حساب مانگ رہا ہے۔" زبیدہ بیگم جیسے ہی چپ ہوئیں وہ ہڈیاں حرکت میں آ گئیں۔ وہ ہڈیاں ہوا میں معلق ہوئیں اور کسی بچے کے رونے کی آوازیں آئیں۔ اور پھر ایک دھواں نمودار ہوا اور وہ ہیولے کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ وہی ہیولہ تھا جس نے ایکسیڈنٹ کے وقت سارنگ کو کار سے باہر نکالا تھا۔ وہ ہیولہ زبیدہ بیگم کے سامنے آیا۔

"میں نے اپنا بچہ کھو دیا لیکن تمہارے بچے کی پل پل حفاظت کی کیوں کہ میں اولاد کی جدائی کی تڑپ سے واقف ہوں۔ بس اب مجھے تمہارے بیٹے سے قربانی چاہئے...... تمہاری قربانی...... اور میرے بچے کی روح کی آزادی بھی۔" وہ ہیولہ گول گول گھومنے لگا۔ ایک طوفان برپا ہوا اور زبیدہ بیگم اس ہیولے کے بگولے میں چلی گئیں۔ پھر سب سکون میں آ گیا۔

مولوی صاحب نے بچے کی تدفین کا انتظام کیا اور سارنگ مولوی کے ساتھ فاتحہ پڑھتے قبرستان گیا۔ واپس پر سارنگ درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب وہ آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔

اچانک کسی بچے کے کھیلنے کی آواز آئی۔ کوئی بچہ ہنس رہا تھا شاید وہ اپنی ماں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

پھر مولوی صاحب نے سارنگ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو سارنگ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر مولوی صاحب کے اشارہ پر سارنگ مولوی صاحب کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دنوں بعد سارنگ نے سحر کو اپنا شریک زندگی بنا کر ہنسی خوشی رہنے لگا۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

بے بس اتنے ہیں تیرے عشق
ترس سے جاتے ہیں گفتگو کے لئے
(مہربان خان.....کراچی)

یہ میرا فرض بنتا ہے کہ اس کے ہاتھ دھلواؤں
سنا ہے اس نے میری ذات پر کیچڑ اچھالا ہے
(ماہم ملک.....راولپنڈی)

کہیں تو وہ لکھتا ہوگا اپنے دل کی چھپی باتیں
کہیں تو بے شمار لفظوں میں میرا نام بھی ہوگا
(عامر شہزاد.....ننکانہ صاحب)

صدے جھیلوں جان پر کھیلوں اس سے مجھے انکار نہیں
لیکن تیرے پاس وفا کا کوئی بھی معیار نہیں
(انتخاب: ایس حبیب خان.....کراچی)

ہری ہے شاخ تمنا ابھی جلی تو نہیں
دبی ہے آگ جگر کی مگر بجھی تو نہیں
جفا کی تیغ سے گردن وفا شعاروں کی
کٹی ہیں برسرِ مقتل مگر جھکی تو نہیں
(محمد اسحار بن ناصر.....کراچی)

اشک آنکھوں سے رواں اور جگر جلتا ہے
کیا قیامت ہے کہ برسات میں گھر جلتا ہے
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈو الہ یار)

میری خاموش نگاہوں کو چشم نم سے نہ دیکھ
میں رو پڑا تو دلوں کے طبق ہلادوں گا
یونہی اداس رہا میں تو دیکھنا ایک دن
تمام شہر میں تنہائیاں بچھادوں گا
(زین العابدین.....سرگودھا)

یہ فسانہ محبت، یہ وفا کی داستانیں
کوئی اور ذکر چھیڑو، میرا دل لہو لہو ہے
(جہانزیب خان.....پشاور)

کون جیتا ہے تیری دنیا میں تماشہ بن کر
بس ایک یاد محبوب ہی تو باقی ہے ابھی
(آصف باجوہ.....تلونڈی قصور)

مت کہو اے لوگو زخم ہر مرہم رکھنے کے لئے
یہ زخم تو میرے محبوب کے عطا کردہ ہیں
(ڈاکٹر ندیم.....شاہ پور چاکر)

تم جاگتی آنکھوں میں آجاؤ کسی دن
خوابوں میں ملاقات ہوا کرتی ہے اکثر
(عارف منکا.....نواب شاہ)

پھر ملو گے کبھی اس بات کا وعدہ کرلو
ہم سے اک اور ملاقات کا وعدہ کرلو
(کائنات عزیز.....فیصل آباد)

زمانے کی ہر ایک منزل پہ میں تم کو کیا دوں گا
تمہارے پیار کا سایہ رہے گا ہم سفر جب تک
(محمد علی.....ساہیوال)

مدت کے بعد آج اسے دیکھ کر آصف
ایک بار تو دل دھڑکا مگر پھر سنبھل گیا
(چوہدری افتخار علی.....بھلیر یاں)

کیا خوب کہا تھا یہ کبھی میر نے راجا
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو
(انتخاب: ذکا اللہ بھٹی.....کراچی)

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو
(ماریہ سبحان.....میرپور ماتھیلو)

کبھی پھول سے ابھر کر کبھی چاندنی میں ڈھل
تیرا حسن چھیڑتا ہے مجھے رُخ بدل بدل کر
(سہیل خان.....کوئٹہ)

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں
(امانت علی.....خضدار)

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
(فرمان علی.....راولپنڈی)

☆

دنیا کو مانگ نہ جنت کا طلبگار بن
بننا ہے تو اس خدا کا طلبگار بن
یہ جنت یہ دوزخ یہ کون و مکاں ہیں جسکے
یہ چاند یہ سورج، یہ دونوں جہاں ہیں جس کے
یہ پھول کلیاں، یہ سب سیارے، یہ سماں وزماں ہیں جسکے
یہ اونچے پہاڑ، یہ چٹیل میدان، یہ تارے و کہکشاں ہیں جسکے
بننا ہے تو اس پروردگار کا طلبگار بن
دنیا کو مانگ نہ جنت کا طلبگار بن
بننا ہے تو اس پروردگار کا طلبگار بن
یہ جن و انس، یہ دھوپ چھاؤں، ہوا مٹی اور یہ پانی
جو غور سے سنے، اس کو سنائیں یہ خود اپنی زبانی
خدا کا رحم، کرشمے سازیاں، اس کی بادشاہی کی کہانی
وہ مالک باقی سب مخلوق، وہ سب پر فیض کا بانی
بننا ہے تو اس سب سے اعلیٰ وجدا کا طلبگار بن
دنیا کو مانگ نہ جنت کا طلبگار بن
بننا ہے تو اس پروردگار کا طلبگار بن
(امانت علی شاہد.....لاہور)

ان پے پھر ''خود شناسی'' کی عینک لگا!
دیکھ تو سامنے ہی ذرا دوری پر
منتظر ہے کھڑی کامیابی تیری!
''خود یقینی'' کی لاٹھی سے ''ڈر'' کو بھگا
تو بھی کرسکتا ہے، سب کو اب دے بتا
اپنی سوچوں کو اب اک نیا موڑ دے
''لوگ کیا سوچیں گے؟'' سوچنا چھوڑ دے
جو بھی آئے ترے من میں اب کرتا جا!
دیکھ تو سامنے ہی ذرا دوری پر
منتظر ہے کھڑی، کامیابی تری
ہمت و حوصلے سے فقط کام لے
جوش و جذبے کا بھی ساتھ میں جام لے
استقامت کے دامن کو پھر تھام لے
بس •تو اب اک قدم آگے کو تو بڑھا
دیکھ تو سامنے ہی ذرا دوری پر
منتظر ہے کھڑی کامیابی تری!
(محمد اویس بلوچ.....میرپور ماتھیلو)

سب لبوں پر گنگناتی آج یہ گفتار ہے
خون کی گرمی فقط انسان کا کردار ہے
آنکھ اپنے حسن کے جلوے سے بے پیکر تہی
اس جہاں میں اپنا ملنا ہی بہت دشوار ہے
فاصلے روحوں کے تو سانسوں نے حوالانی کیے
آپ سے ملنا ہے آساں، زندگی دیوار ہے
پتھروں کے شہر میں کیسے جبیں اہل قلم
شاعروں کے واسطے اک سانس بھی اک وار ہے
نفس کا عرفان ابھی حاصل کہاں انسان کو
ذہین انسان ابھی پورا کہاں بیدار ہے
درد ہے نہ حسن ہے قمر ان اشعار میں
آج کی شاعری الفاظ کا پندار ہے
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

کچھ درد ہونٹوں پر لائے نہیں جاتے
قصے اپنی رسوائی کے سنائے نہیں جاتے
تکتے رہتے ہیں گلی میں راہ اک شخص کا
اور وہ ہی کہ بھولے سے ادھر نہیں آتے
مجھے عشق کی زنجیر نے ایسا ہے باندھا
کہ اب تو ہاتھ اپنے چھڑائے نہیں جاتے
گھر گئے ہیں درد کے شعلوں میں اتنے
اب آگ کے یہ دریا بجھائے نہیں جاتے
چھوتا ہے جب کوئی سسکی نکل جاتی ہے
ضبط اتنا ہے کہ درد بتائے نہیں جاتے
راج کچھ ایسا کرو کہ وہ ہمارے ہوجائیں
حال دل اب کسی اور کو سنانے نہیں جاتے
(سید عبادت راج کاظمی.....ڈیرہ اسماعیل خان)

''کاش'' کے لفظ کو زندگی سے مٹا
''پٹی'' مایوسی کی آنکھوں سے تو ہٹا
چلو اس شہر میں چلتے ہیں
چلو تقدیر کو پھر سے آزماتے ہیں

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

داؤں پر لکھی سرگوشیوں کو آج سنتے ہیں
اعت ان چھوٹی سی آہٹوں کی زد میں ہے شاید
بھی تو دھڑکنیں چپ ہیں
بھی تو ساعتیں چپ ہیں
بلو اس شہر میں چلتے ہیں
ہاں پر وصل کو زنجیر سے باندھا نہیں جاتا
عافی کو جہاں تحریر سے باندھا نہیں جاتا
ہاں دل کو کسی جاگیر سے باندھا نہیں جاتا
جہاں پر چاند تاروں سے مزین رات ہوتی ہے
جہاں پر چاہتوں کی ہر برسات ہوتی ہے
جہاں دل کے سارے دشمنوں کی مات ہوتی ہے
چلو اس شہر میں چلتے ہیں
(انتخاب: قاسم رحمان..... ہری پور)

کیا دو گے مجھے میری وفاؤں کا صلہ تم
ممکن ہو تو کرتے ہی رہو مجھ پہ جفا تم
کب جیتا ہے دنیا میں کوئی قلب شکستہ
للہ نہ یوں دو مجھے جینے کی دعا تم
کس منہ کریں تم سے جفاؤں کی شکایت
جب ہوتے ہو اظہار تمنا پہ خفا تم
تم ظلم بھی ڈھاتے ہو تو ہم کچھ نہیں کہتے
ہم پیار بھی کرتے ہیں تو ہوتے ہو خفا تم
دنیا میں ہوا کون شریک غم دنیا
غم تم نے دیا ہے تو کرو اس کی دوا تم
شعلہ ہو کہ بجلی ہو آندھی ہو کہ طوفان تم
بھولی ہوئی یادوں کی ہو بھولی سی صدا تم
جوہر وہ یہ سن کر کہیں مغرور ہوجائے
اس دل کے صنم خانے کی مالک ہو سدا تم
(کاشف عبید کاوش..... بلگرام)

آج پھر نئے سال کی خوشیاں آگئیں
باتیں سبز رتوں کی طرح
شگوفوں، کونپلوں اور برگ نمو کی صورت
سر ابھار رہی ہے
میں سوچنے لگا
پھر نیا سال آ گیا
میرے ملک بھر میں، اغوا، دھماکے، ٹارگٹ کلنگ
اور دہشت گردی نے کتنے گھروں کی
خوشیاں اجاڑ دی ہیں
مائیں اپنے لخت جگر
اور بہنیں اپنے بھائیوں کی
راہ تک رہی ہیں
میں نے سوچا اس بار
نئے سال کی آمد پر قبرستان جاؤں گا
تو کس کس کی قبر پر فاتحہ پڑھوں گا
پھر کس کس کے گھر تعزیت کرنی ہے
ایک آنسو بے کل سا ہو کر
آنکھ کی پتلی سے پھسل کر میرے
گالوں پر آ گیا
سب کو نیا سال مبارک ہو
(ساحل ابڑو- ڈیرہ اللہ یار بلوچستان)

دیکھنے کی تجھ کو چاہت کم نہیں ہوتی
کیوں تو ہر لمحہ میری صنم نہیں ہوتی
چہرے پہ تیرے جو نور کی چمک ہے
چھولوں جتنا پھر بھی مدھم نہیں ہوتی
آنکھیں جو میرے پیار کا سمندر ہیں
جتنا بھی ڈوبوں گہرائی کم نہیں ہوتی
تیری محبت نے زندہ مجھ کو رکھا ایسے
ملے جتنا بھی درد یہ آنکھ نم نہیں ہوتی
خوش رہنے کی ادا بخشی ہے ایسے کہ
کوئی بھی گھڑی اب تو غم نہیں ہوتی
بہتے آبشار بھگا دیتے خوشی کے
پیشانی کی سلوٹ اب صنم نہیں ہوتی
بے پناہ محبت ہے مجھے تجھ سے نینا
تیری چاہت میں ملاوٹ صنم نہیں ہوتی
(ایڈووکیٹ نینا خان..... کراچی)

☆☆

تین پتی

ثنا اے شیخ - لاہور

کسی خانہ بدوش فنکارہ کا ہیلو وین کی رات کھیلے جانے والے تاش کے پتوں کا ایک پراسرار کھیل اس کے آنے سے تیز ہوائیں چلنے لگتی تھیں اور پھر.....

ایک پراسرار لوک گیت جس سے آسمان لال اور آندھی طوفان کی صورت اختیار کر لیتی تھی

مجھے ایک بار کام سمجھا کے تو دیکھو میں بہت جلد سیکھ جاؤں گا۔ جب تک میرا کام پسند نہ آئے، مجھے پیسے بھی مت دینا، وہ اپنی باریک سی نسوانی آواز میں بولا تو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے دو لڑکے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنسنے لگے۔ اوئے تجھے کام پہ رکھ لیا تو لڑکیوں کو تر سے ہوئے اپنے اس اسٹاف سے ہی مجھے تیری عزت بچانی مشکل ہو جائے گی تو بھلا ہر آنے جانے والے کی چھیڑ چھاڑ سے تجھے کیسے بچاؤں گا؟ برگرز اور سینڈوچز کی دکان کے مالک نے اس کے مضبوط اور اونچے لمبے سراپے پہ بھرپور نظر ڈالتے ہوئے طنز کیا تو پیچھے کھڑا ایک لڑکا بولا، رکھ لو استاد جی! ہمارا بھی دل لگا رہے گا اور کسٹمرز کا بھی، دوسرا لڑکا بولا۔ اور بور ہوئے تو اس کا ناچ بھی دیکھ لیا کریں گے۔ کیوں رات کی رانی؟ منظور ہے؟ میرا نام رات کی رانی نہیں ہے، وہ لڑکیوں کے سے انداز میں بولا۔ اچھا چلو خالی رانی ہی سہی، وہ لڑکا ہنستے ہوئے بولا۔ میرا نام رانی بھی نہیں ہے، اس نے ناراضگی سے جواب دیا۔ کل تو تم نے یہی بتایا تھا، لڑکے نے کہا۔ میں نے راجا بتایا تھا اپنا نام، وہ کسی قدر چڑتے ہوئے بولا۔ اچھا چلو راجا ہی سہی، پر ہے تو رانی ہی نہ؟ لڑکا کمینگی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ نہیں! میں نے کہا نہ میرا نام راجا ہے، اس نے اپنی نسوانی آواز کو مردانہ انداز میں ڈھالنے کی ناکام کوشش کی۔ اچھا؟ چل اپنا شناختی کارڈ دکھا! اس پہ کیا لکھا ہے؟ لڑکوں کو سستی تفریح مل چکی تھی۔ اس پہ اس کا نام لکھا ہوگا راجا رانی۔۔۔ دوسرے لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا۔۔۔ مگر اس نے ان کے چھچھورے پن کا کوئی جواب نہ دیا۔

پہلا لڑکا پھر بولا، اچھا چل یہ بتا کہ تیری شناختی علامت میں کیا لکھا ہے؟ نینوں میں کجرے کی دھار؟ نہیں ہونٹوں پہ تل کا نشان، دوسرے لڑکے نے بھی لقمہ دیا۔ نہیں! لکھا ہوگا، میں تو خود بے نشان ہوں، اور یہ کہہ کر وہ دونوں لڑکے اونچا اونچا ہنسنے لگے۔۔۔ وہ اب بالکل خاموش تھا کہ ان کی بدتمیزیوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا مگر وہ پھر بھی وہاں سے ٹلا نہیں تھا۔ اوئے بکواس بند کرو تم دونوں اور تو! تجھے میں نے کل بھی کہا تھا کہ یہاں مت آنا، تجھے یہاں کام نہیں مل سکتا لیکن تو بھی بڑا ڈھیٹ ہے، آج پھر مونہہ اٹھا کے چلا آیا ہے، دکان کا مالک بولا۔ بات کو سمجھ! بنا کتھے چونے کا پان خالی پتہ ہوتا ہے، اسے کوئی نہیں کھاتا، دکاندار نے اسے مثال دے کے سمجھایا؟ یعنی جب تک تو میک اپ کر کے عورتوں کے کپڑے نہیں پہنے گا، تو کما نہیں سکتا، ایک

لڑکے نے مزید وضاحت کی۔ چپ کر! دکان کے مالک نے اپنے ملازم کو جھاڑا۔ دیکھ رہا ہے ان کو؟ دو دن میں کام چھوڑ کے بھاگ کھڑا ہوگا تو یہاں سے، دکان کے مالک نے اس سمجھایا۔ میں کہیں نہیں بھاگوں گا، میں عادی ہوں ایسی باتوں کا، بس آپ مجھے کام پہ رکھ لیں، وہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ استاد جی! یہ بھی مزے لیتا ہے ایسی باتوں کے ورنہ یہاں سے چلا نہ گیا ہوتا؟ وہ لڑکا پھر سے بولا۔ میں اس چھیڑ چھاڑ کے مزے لیتا تو باقیوں کی طرح بن سنور کے، رنگین کپڑے پہن کے سڑک کنارے کھڑا ہوتا یا کسی شادی میں ناچ رہا ہوتا، وہ پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ دیکھ بلبل! اب بہت ہو گیا، کیوں کل سے دماغ کھا رہا ہے میرا؟ ایک بار کہی ہوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تجھے؟ میں باہر آ کر تجھے بہت ماروں گا، بھاگ جا یہاں سے۔۔۔ دکان کا مالک چنگھاڑا تو وہ اس کے غصے سے سہم گیا۔ جا چلی جا رانی! کسی مرد کے ہاتھ کی مار پڑ گئی تو پھر پولیس کو بتاتی پھرے گی کہ میرے اندر کی عورت پہ بہت ظلم ہوا ہے، ملازم لڑکا ابھی بھی باز نہیں آیا تھا۔ وہ خاموشی سے پلٹ گیا۔ اچھا رانی! اپنا شناختی کارڈ تو دکھاتی جا! چل شناختی علامت ہی بتا دے۔۔۔ ان دونوں چھچھوروں کی آوازیں اور قہقہے اس کا تعاقب کر رہے تھے اور وہ آنسو بھری آنکھوں اور سپاٹ چہرے کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔

جوں جوں شام بڑھتی جا رہی تھی اس پوش علاقے کی اس مختصر سی فوڈ مارکیٹ پہ رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ اس علاقے میں طرح طرح کے ریسٹورانٹس کی زیادتی کی وجہ سے اس چھوٹی سی فوڈ مارکیٹ میں کھانے پینے کے اکا دکا سٹالز ہی تھے جہاں خاص کر سردیوں کے موسم میں رات ڈھلے نوجوان، چائے، کافی یا آئس کریم سے لطف اندوز ہونے چلے آتے تھے جن میں زیادہ تعداد امیر زادوں کی ہوتی تھی جو شغل میلے کے طور پہ اس طرف آ نکلتے تھے۔ سوسائٹی کے گنجان علاقے سے قدرے ہٹ کے یہ پرائیویٹ سی جگہ ایک طرح سے دوستوں یاروں کا میٹنگ پوائنٹ ہوتی تھی۔ ان اکا دکا دکانوں کے باہر کافی بڑی اور کھلی جگہ بیٹھنے کے لیے مختص کی گئی تھی جہاں پتھر کے فرش پر کچھ کرسیاں اور میزیں لگائی گئیں تھیں، وہاں علاقے کے نوجوان تھوڑا بہت کھانے کے علاوہ سگریٹ سے شغف فرماتے تھے اور ان کی اس لت کو بڑھاوا دینے میں ایک پان والے کی کھوکھا نما دکان کا کافی ہاتھ تھا۔ جس کے پان کی بجائے سگریٹ کے خریدار زیادہ ہوا کرتے تھے۔ جو بھی تھا یہاں باقی علاقے کی بڑے سڑکوں کی طرح رش اور ٹریفک کا شور بالکل نہیں ہوتا تھا۔

بالوں میں جیل، ہاتھ میں سونے کی گھڑی، پیروں میں قیمتی جوتے اور جدید کپڑوں میں ملبوس وہ نوجوان اپنے گھر کے عالی شان ڈرائنگ روم میں اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو نا گواری سے دیکھ رہا تھا۔ تم واقعی نازو ہو یا میرے ساتھ کوئی گھٹیا مذاق چل رہا ہے؟ اور وہ جو کانوں میں سنہرے رنگ کے چھوٹے چھوٹے جھمکے، پیلے رنگ کی شلوار قمیض اور آتشی گلابی رنگ کے دوپٹے میں درمیانے قد اور بھاری جسم کی لڑکی اپنے گولڈن اسٹریکس شدہ بالوں کو اپنے کندھوں پہ ڈالے اور اپنے کاجل سے لدی ہوئی آنکھیں بنا جھپکائے سامنے بیٹھے اس امیر زادے کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔۔۔ اس نے نارنجی رنگ کی لپ اسٹک لگے لب کھولے۔۔۔ بیش! یہ میں ہی ہوں نازو! کیا تم میری آواز بھی نہیں پہچانتے؟ یہ تم ہو؟ جس سے میں پچھلے چھ مہینوں سے فیس بک پہ چیٹنگ اور فون پہ بات کر رہا تھا؟ تم نے تو اچھا خاصا بیوقوف بنایا ہے مجھے۔۔۔ تم تو اپنی تصویروں سے بالکل الگ ہو۔ میں نے کب کہا کہ وہ تصویریں میری تھیں؟ وہ تو ایک انڈین ماڈل کی ہیں، مجھے بہت پسند ہے تو لگا لیتی تھی، وہ بولی تو وہ جھلا اٹھا۔ مجھے کیا پتہ کسی انڈین ماڈل کا؟ تم! تم نکلو یہاں سے۔۔۔ تم ہی تو ملنا چاہتے تھے مجھ سے۔۔۔ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔۔۔ تم سے نہیں، ان تصویروں والی لڑکی سے۔۔۔ آواز سے تو لگتا تھا کوئی سولہ سترہ سال کی خوبصورت سی لڑکی ہے لیکن تم تو۔۔۔

ہ وہ اس کی مایوسی کو غصے میں بدلتا دیکھ رہی تھی۔ بیش تم نے کبھی مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ وہ مری تصویریں ہیں بھی یا نہیں؟ اگر پوچھتے تو میں سچ ہی بتاتی، وہ یقین سے بولی۔۔۔ دفع ہو جا یہاں سے اور آئندہ مجھ سے ملنے کی یا رابطہ کرنے کی کوشش مت کرنا، اس نے دل کی بات کہہ دی تو وہ آنکھوں میں آنسو لیے پلٹی پھر کچھ سوچ کے اس کی جانب مڑی۔۔۔ تمہیں میری کیا بات پسند نہیں آئی؟ میں خود کو تمہارے لیے بدل لوں گی جیسا تم چاہو گے ویسی ہو جاؤں گی اور شادی کے بعد تو تمہیں کوئی شکایت۔۔۔ ایک منٹ ایک منٹ کیا کہا؟ شادی اور تم سے؟ چھ مہینے ہمیں بات کرتے نہیں ہوئے، آج پہلی بار ہم ملے ہیں اور تم مجھ سے شادی کے خواب بھی دیکھنے لگی؟ تم نے خود کو دیکھا بھی ہے کبھی آئینے میں؟ تم جیسی کو تو میں اپنے گھر میں نوکرانی نہ رکھوں اور تم؟ ہاہاہا۔۔۔ وہ اب اس پہ ہنس رہا تھا اور وہ اپنی بہتی آنکھوں سے اس کا دھندلایا ہوا مکروہ چہرہ دیکھ رہی تھی۔

یہ خواب تم ہی نے تو مجھے دکھائے ہیں بیش! تم نے ہی تو کہا تھا کہ جب سے تم نے میری آواز سنی ہے میں تمہارے خوابوں میں دلہن کے روپ میں نظر آتی ہوں؟ اور تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو، تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے، تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو تو میں چلی آئی۔۔۔ وہ اسے اس کی کہی باتیں یاد کروانے لگی مگر وہ تو پل میں اسے بھلا بیٹھا تھا۔ جیسے تمہاری آواز سن کے تم سے محبت ہوئی تھی ویسے ہی تمہیں دیکھ کر ختم بھی ہو گئی، چلو بہت ہوا، نکلو یہاں سے۔۔۔ وہ بے حسی سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔۔۔ وہ جانے کے لیے مڑی۔۔ پتہ نہیں کون سے گاؤں سے اٹھ کے چلی آئی ہے؟ دیہاتن، گنوار، پینڈو! اس کے کانوں میں پڑتے ان آخری الفاظ کے ساتھ آنکھوں میں آنسو لیے وہ باہر نکل گئی۔۔۔

شام ڈھل چکی تھی۔ رات کا سناٹا شروع ہو چکا تھا جب نہ جانے کتنی دیر تک پارک کے باہر لگے بینچ پہ بیٹھے رہنے کے بعد گھر واپسی کے لیے مڑتی ہوئی نازو کو دیکھتے ہوئے وہ اس کے پاس [illegible] تک بیش کے ذلت آمیز سلوک کے زیرِ اثر تھی، بے حال سی اس کے پاس سے گزر گئی۔ اور وہ جو آنکھوں کے گرد سرمے کی گہری لکیریں کھینچے، ہونٹوں پہ لال رنگ کی لپ سٹک لگائے اور ہری شلوار قمیض پر شوخ نارنجی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے لہک لہک کے چلتا آ رہا تھا، ایک پریشان حال لڑکی کو یوں اداس جاتا دیکھ ایک پل کو اس کی طرف مڑا ضرور تھا۔۔۔ استاد! ایک ملازم لڑکے نے دکان کے مالک کی توجہ اس کی جانب مبذول کروائی۔ وہ بڑے اعتماد سے چلتا ہوا پہلے کاؤنٹر کے پاس گیا اور وہاں کھڑے ان دونوں ملازموں اور اس دکاندار کو خاص ادا کے ساتھ تکتے ہوئے مسکرا کے دیکھا اور پھر دکان کے سامنے لگی میز اور کرسیوں پہ بیٹھے کچھ لڑکوں کی جانب بڑھ گیا۔۔۔ وہ تینوں دکاندار اس کی اس خوداعتمادی پہ حیران تھے جو اسے اس حلیے میں ملی تھی جبکہ دو دن سے وہ اسے جس مردانہ حلیے میں دیکھ رہے تھے، اس میں بات کرتے ہوئے تو وہ کسی کی آنکھوں کی طرف بھی نہیں دیکھ پاتا تھا۔ عورت کی طرح شرماتے ہوئے بات کرتا تھا لیکن اب اس عورت کے حلیے میں وہ ایک مرد کی طرح بے باک انداز لیے ہوئے تھا۔ عجیب کومبینیشن تھا۔

ابھی وہ میز کے پاس جا کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ اس کے قدم وہیں جم گئے اور زبان جیسے ساتھ دینا بھول گئی۔۔۔ بادشاہ! میرے بھائی! میرے بچے!۔۔۔ اس نے وہاں بیٹھے ایک امیر زادے کو مخاطب کیا تو وہ نوجوان اور اس کی میز پہ موجود باقی لڑکے بھی اسے حیرت سے تکنے لگے۔ میں! تمہارا بڑا بھائی راجا۔۔۔ اس نے پیار سے اس لڑکے کو دیکھا۔ اوئے ہیجڑے! دماغ ٹھیک ہے تیرا؟ چل نکل یہاں سے۔۔۔ مگر اس کے قدم وہیں جم سے گئے تھے۔ اس کے دل میں اپنے چھوٹے بھائی کے لیے بے پناہ محبت امڈ رہی تھی۔ وہ مونہہ سے کچھ بول نہ پا رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں کی نمی بتا رہی تھی کہ وہ اسے دیکھ کے بیک وقت

کتنا خوش اور کتنا اداس ہو رہا تھا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ اسے آگے بڑھ کر گلے سے لگا لے۔۔۔ اس نے جیسے ہی جھک کر اس نوجوان کے گرد اپنے بازو حائل کیے، وہ لڑکا طیش میں اٹھ کھڑا ہوا اور اسے ایک زوردار دھکے کے ساتھ پیچھے کی طرف پھینک دیا۔ وہ بہت زور سے زمین پہ گرا۔۔۔ اس کی آنکھوں کی نمی آنسوں میں تبدیل ہوگئی جو نہ جانے جسم کی چوٹ پہ بہہ نکلے تھے یا دل کی چوٹ پہ۔۔۔ جدید فیشن ایبل لباس اور مہنگے جوتے اور گھڑی پہنے وہ بنا سنورا نوجوان طیش میں آ کے اسے گالیاں بکنے لگا تھا۔ یہ کس گھٹیا جگہ لے آئے ہو تم لوگ مجھے؟ پہلے ہی شام کو اس لڑکی نے موڈ خراب کر دیا اور اب رات کو اس ہیجڑے نے۔۔۔ کہا تھا کہ کسی اچھی جگہ چل کر بیٹھتے ہیں لیکن تم لوگوں کو بھی یہیں مرنا تھا۔۔ وہ غصے میں بولا۔ بیش! پہلے بھی تو ہم یہاں آتے ہیں اور دیکھ یار اب تو چائے بھی آ گئی۔۔۔ اور تم چلو، جا یہاں سے۔۔۔ اس کے ایک دوست نے زمین پہ گرے ہوئے اس خواجہ سرا کو دیکھ کے کہا۔ میز پر چائے کے کپ رکھ کے واپس پلٹنے والے ملازم نے اسے زمین سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ جا چلا جا! کیوں کسٹمر خراب کرنے پہ تلا ہوا ہے؟ اس سے پہلے کے استاد خود آ کے تجھے دھکے دے، چلا جا یہاں سے۔۔۔ شام تک اسے چھیڑنے والا ملازم اس وقت نہایت سنجیدگی سے اسے زمین سے اٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس نے اپنے کپڑے درست کیے اور وہاں سے چلا گیا۔۔۔ نوجوان اپنی کرسی پہ واپس آن بیٹھا تھا۔ صاحب آپ آرام سے بیٹھیں! اب وہ نہیں آئے گا۔۔۔ پتہ نہیں کل سے نہ جانے کہاں سے یہاں آیا ہوا ہے۔ سب کو تنگ کر رکھا ہے اس نے۔۔۔ کچھ اور چاہیے؟ وہ ملازم لڑکا نہایت مؤدبانہ انداز میں اس نوجوان سے مخاطب تھا۔ ہاں سگریٹ کا ایک پیک لا دو! وہ بھی بولا۔۔ جو حکم صاحب! کون سا؟ اس نے پوچھا۔ نوجوان نے برینڈ کا نام بتایا تو وہ بھاگم بھاگ پاس والی دکان سے اس کی مطلوبہ شے لے آیا۔ اور وہ چائے کے ساتھ ساتھ سگریٹ بھی نوش کرنے لگا۔۔۔ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

راجافٹ پاتھ پہ درختوں کی اوٹ میں چلا جا رہا تھا۔ اس نے شکر کیا کہ دیر رات کا اندھیرا ابھی ہے اور یہاں عام شہر جیسا رش بھی نہیں، اسے ذلیل ہوتے، دھکے کھاتے زیادہ لوگوں نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جس فٹ پاتھ سے گزر کے گیا تھا اس کی دیوار کے دوسری طرف درختوں کے جھنڈ سے اس نے چھلانگ لگائی۔۔۔ اس کے پیروں کی دھم دھم اور پائل کی چھم چھم دونوں نے مل کے اس کے کودنے کی آواز کو اس خاموشی میں اجاگر تو کیا۔۔۔ مگر وہ اپنی ہی اداسیوں پہ غمگین روتا ہوا چلتا رہا۔۔۔ اس کے ذہن میں تو بس اس نوجوان کے جملے گردش کر رہے تھے اسی لیے اس نے چھلانگ لگانے والی کی دھم چھم کی آواز کو سن کے بھی ان سنا کر دیا۔۔۔ اسے کیا لینا دینا تھا کسی سے؟ جس سے تھا، وہ اسے دھتکار چکا تھا۔ کالے لہنگے پہ کالی قمیض اور سر پہ لال رنگ کے دوپٹے کا گھونگھٹ آنکھوں پہ گرائے کودنے والی نے آگے جاتے اس بیخبر کو ایک نظر دیکھا پھر اپنے چاندی کے موٹے موٹے کڑوں والے ایک ہاتھ سے اپنی چاندی کی چھوٹی سی گڑوی سنبھالی اور دوسرے ہاتھ سے چاندی کی موٹی سی نتھ پہنی ہوئی ناک پہ آتا اپنے دوپٹے کا گھونگھٹ تھوڑا اوپر کیا اور دوسری طرف بیٹھے ہوئے ان نوجوانوں کو دیکھا۔۔۔ چھم چھم کرتی وہ ان کے پاس جا کر وہیں فٹ پاتھ کے ایک سرے پہ بیٹھ گئی۔ میز پہ بیٹھے ان چاروں دوستوں کی نظر اس کی جانب خود بخود مبذول ہوگئی، اس کا حلیہ ہی ایسا تھا۔۔۔ شیشوں اور کڑھائی سے مزین کالا لہنگا، لال چنا ہوا دوپٹہ اور سڈول ہاتھوں اور پیروں میں چھم چھم کرتے چاندی کے زیور۔۔۔ اس کے نہایت خوبصورت ہاتھوں پیروں کے ناخن بھی لال رنگ کے نیل پینٹ سے مزین تھے۔

گہرے سرخ رنگ کے ہونٹوں تک آتے لال گھونگھٹ اور ہاتھوں پیروں سے جھلکتی دودھیا گوری رنگت نے اس نوجوان کو اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ کمینگی

مسکراتا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ باریک دوپٹے گھونگھٹ کے اندر سے ہی وہ اس شخص کے تاثرات ھتے ہوئے اس کے جانب رخ کر کے بیٹھ گئی اور ندی کی گڑوی کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ چل! کچھ ایسا کہ رات بھی ایسی ہی حسین نظر آئے جیسی کہ تو ے۔۔۔ نوجوان نے جیب سے سو روپے کا نوٹ لتے ہوئے اس کی طرف کیا۔۔۔ لیکن وہ اسی طرح موش بیٹھی رہی۔۔ اب نوجوان نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف اچھال دیا۔۔ چل اب ا نخرہ ختم کر! اس نے اپنے خوبصورت پیروں کے۔ امنے پڑے اس پانچ سو کے نوٹ پہ ایک نظر ڈالی س پہ قائداعظم کی تصویر تھی، اس نے احترام سے وہ ٹ اٹھا کے اس پہ سے مٹی جھاڑی، اسے تہہ کیا اور پنے دوپٹے کے ایک پلو میں لپیٹ کر گرہ لگا لی۔۔۔ ر پھر اس نے گڑوی بجانا شروع کی۔۔۔

گانا گاتے ہوئے ایک عجیب سا سماں تاری ہو گیا۔ بادشاہ اس کی قدرے بھاری لیکن سراور لے میں گندھی ہوئی آواز میں کھوسا گیا۔۔۔ کالے آسمان پہ نہ جانے کہاں سے مٹیالے رنگ کے بادل جمع ہونے لگے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کی رفتار میں کافی تیزی آ گئی تھی۔ مگر وہ اپنی اونچی کھلی ہوئی آواز اور مخصوص منفرد لہجے میں گاتی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تیز ہوا نے آندھی کا رخ دھار لیا تھا۔ لال رنگ کی فضا میں اڑتی مٹی نے وہاں بیٹھے سبھی لوگوں کو وہاں سے اٹھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ کوئی جلدی جلدی اپنا بل چکتا کرنے لگا تو کوئی اپنا دیا آرڈر کینسل کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کے گانے کے دوران ہی سب تتر بتر ہو گیا۔۔۔ ملازم لڑکے جلدی جلدی پلاسٹک کی میز اور کرسیاں سمیٹ کے دوکان کے اندر لیجا رہے تھے مگر بادشاہ تھا کہ وہاں سے ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا یہاں تک کہ اس کے دوست اسے زبردستی کھینچ کر گاڑی تک لیجانے لگے مگر اس کی نظریں اب بھی گھونگھٹ نکالے، گڑوی بجاتے، منفرد آواز اور لے میں عجیب سے گیت کے آخری بول گاتی اسی عورت پہ ہی گڑیں تھیں۔ یہاں تلک کہ بادشاہ کے دوست اسے گاڑی میں بٹھا کے دروازہ بند کر کے گاڑی سٹارٹ کر چکے تھے۔

اس کا گیت ختم ہو چکا تھا۔ سبھی کسٹمرز مٹی کے اس طوفان سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگ چکے تھے۔ دکان والے اپنا سامان سمیٹ کے شٹر نیچے کر چکے تھے لیکن کھلے مٹیالے آسمان تلے اسی لال آندھی میں اٹے طوفان سے ہوتی تباہی میں وہ وہیں بیٹھی رہی۔۔۔ جیسے اسے اس بگڑتے موسم کی اچانک افتاد سے کوئی فرق ہی نہ پڑتا ہو۔ جہاں یہ طوفان میز اور کرسیوں تک کو ادھر ادھر پٹخ چکا تھا، تو کہیں کسی درخت کو گرا چکا تھا تو وہیں کھڑی موٹر سائیکل کو بھی زمین پہ پھینک چکا تھا مگر ایسے خطرناک طوفان نے بھی اس پہ کوئی اثر نہ کیا بلکہ وہ وہیں ٹانگیں پسارے مزید اطمینان سے بیٹھ گئی جیسے وہ کسی پہاڑ جتنی وزنی ہو کہ جسے یہ طوفان ہلا بھی نہیں پائے گا۔ بھلے اس کا لباس آندھی کے تھپیڑوں سے جھولتا رہا لیکن اس کا گھونگھٹ اب بھی اس کے آدھے چہرے پہ جوں کا توں قائم تھا۔

راجا ایک بنا کھڑکی دروازوں کے ایک پلستر شدہ زیرِتعمیر گھر کے کمرے میں ایک چارپائی پہ ڈالے گئے بستر میں اب بھی مونہہ چھپائے رو رہا تھا۔ باہر آئے طوفان اور اس کی مچائی تباہی بھی اسے اس کے غم سے نہ نکال پائی تھی۔ زیرِتعمیر گھر کے اطراف اور اوپر کی منزل پہ پڑے سامان کی اٹھک پٹھک کی زوردار آوازیں بھی اسے اپنی تکلیف کے اثر سے باہر لانے میں ناکام رہیں یہاں تک کہ اس طوفان نے موسلا دھار دھار بارش کی شکل لے لی۔۔۔ اور بس یہی ایک شور تھا جو اسے اپنی تنہائی کے شور سے ہم آہنگ لگا۔۔۔ اس نے پھیلے ہوئے سرمے سے لدی آنکھوں پر سے اپنا ہاتھ اٹھا کے باہر دیکھا۔۔۔ کچھ دیر خاموشی سے موسلا دھار دھار بارش کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ آنگن کی دہلیز پہ آ کر بڑھ گیا۔۔۔ گرج چمک کے ساتھ مچے اس طوفان نے ماحول پہ بہت ہیبت طاری کر رکھی تھی۔۔۔ ٹانگیں اور پیر

بارش میں ہونے کی وجہ سے وہ بھی بھیگنے لگا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں پھیلا سرما پانی کے قطروں کے ساتھ بہتے ہوئے اس کے باقی کے چہرے پر بھی پھیل رہا تھا۔ مگر یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ قطرے بارش کے ہیں یا اس کے آنسوں کے؟۔۔۔ کچھ دیر یونہی موسم کی ستم ظریفی جھیلنے کے بعد اس نے تھک کر اپنے گھٹنوں میں مونہہ چھپالیا۔۔۔

طوفان کا زور ٹوٹ چکا تھا مگر بارش اب بھی نہیں تھمی تھی بس ذرا رفتار اور گرج چمک کی آوازوں میں کمی آئی تھی اور پھر اس نے ایک آواز سنی۔۔۔ چھن چھن۔۔۔ چھن چھن۔۔۔ وہ آواز اس کے بالکل قریب آ کر رک گئی تو اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کے دیکھا تو اس کے بائیں جانب وہ گھونگھٹ نکالے، ہاتھ میں گڑوی تھامے اس کی بالکل ساتھ، اسی کی جانب رخ کیے بیٹھی تھی۔ تم اس طوفان میں کیوں پھر رہی ہو؟ راجا نے اپنی مردانہ آواز اور نسوانی لہجے میں اس نووارد سے پوچھا۔ تم بھی تو اس طوفان میں بیٹھے ہو۔۔۔ وہ بولی تو اس کی آواز میں ایک گونج تھی جیسے وہ کہیں بہت دور کسی بند خالی بڑے سے ہال میں بیٹھی بول رہی ہے۔ راجا نے اس گونج کو واضح طور پہ محسوس کیا مگر نظر انداز کرتے ہوئے افسردہ لہجے میں بولا، میرے لیے یہ طوفان نہیں۔۔۔ میرے لیے بھی نہیں، اس نے بھی اپنی گونجتی آواز میں ویسا ہی جواب دیا۔

یہاں کی نہیں لگتی، کہاں کی ہو؟ اس نے اس کے شیشوں سے چمکتے مخصوص لباس، اس کے زیور اور لال رنگ سے سجے ہونٹوں اور ناخنوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ جھٹ سے بولی۔۔۔ کہیں کی نہیں۔۔۔ اور تم؟ اس نے بھی پوچھنے والے کے پھیلے اور مٹتے ہوئے میک اپ زدہ چہرے کو اپنے گھونگھٹ کی اوٹ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔۔۔ میں بھی کہیں کا نہیں ہوں۔۔۔ مایوسی سے اس نے بھی اس بار اس کے جیسا جواب ہی دیا۔۔۔ ایک عورت ہوتے ہوئے رات کے اس پہر اس سنسان علاقے کی اس طوفانی رات میں اکیلے گھومتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟ راجا نے جواب دینے کے کے ساتھ ساتھ ایک اور سوال پوچھ لیا۔ ڈر تو تمہیں بھی نہیں لگتا۔۔۔ اس خوفناک رات میں، اس سنسان علاقے کے اس غیر آباد، ویران اور ادھورے گھر کے آنگن کی دہلیز پہ اکیلے بیٹھے ہوئے۔۔۔ سوال کے جواب میں سوال جاری تھے۔۔۔ راجا افسردگی سے بولا، میں تو ہمیشہ سے اکیلا ہی ہوں، یہی اکیلا پن میرا ساتھی ہے، میں کیا ڈروں؟ کس سے ڈروں؟ میری شکل، میری جنس سے تو لوگ ڈر کے دور بھاگ جاتے ہیں، جیسے میں انسان نہیں کوئی اور ہی شے ہوں۔۔۔ تم میرے پاس آ کر کیوں بیٹھی ہو؟ کیا تمہیں مجھ سے گھن نہیں آ رہی؟ راجا نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔۔۔ نہیں! میری کہانی بھی تمہارے جیسی ہے، لوگ مجھ سے بھی ایسے ہی بھاگتے ہیں جیسے میں بھی انسان نہیں کوئی اور شے ہوں۔۔۔ وہ اپنی گونجتی آواز میں جواب دے رہی تھی لیکن راجا اپنے پیروں کے پاس موجود پانی میں انگلیاں گھماتے اپنے ہی جواب کے پس منظر میں کھویا ہوا کہیں دور نکل چکا تھا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ اس کے ساتھ بیٹھی وہ گھونگھٹ والی اپنا جواب دے کے کب کی غائب بھی ہو چکی تھی۔ وہ کچھ دیر اسی ٹھنڈ میں بیٹھا بارش کے پانی سے کھیلتا رہا اور پھر کھوئے کھوئے سے انداز میں گھر کے اندر اپنے بستر کی طرف چلا آیا۔۔۔

اس طوفانی رات میں ساری رات بادشاہ اپنے محل نما گھر کے پر آسائش بیڈروم کے بستر پہ پڑا عجیب وغریب خواب دیکھتا رہا۔۔۔ کبھی اسے خواب میں وہ گڑوی والی خوفناک طوفان میں بیٹھی وہی خوفناک گیت گاتے دکھائی دیتی، کبھی اس کا بڑا بھائی راجا میک اپ زدہ چہرے سمیت اس سے آ کے لپٹنے کی کوشش کرتا تو کبھی وہ ناز و اپنے دیہاتی حلیے میں اس کے سامنے کھانا پیش کرتے ہوئے اسے سرتاج کہتے نظر آتی۔۔۔ اور پھر اس کی شکل بدل کر راجا کی بن جاتی تو کبھی راجا کا حلیہ اس گڑوی بجاتی عورت میں تبدیل ہو جاتا۔۔۔ ان خوابوں سے ڈر کے کئی بار اس کی آنکھ کھلی اور جب آنکھ

لگتی تو پھر سے یہی تینوں خواب میں اسے اپنے گھر کے لان میں ناچتے گاتے نظر آتے۔۔۔ صبح تک وہ بہت پریشان ہو چکا تھا۔۔۔ رات کا طوفان ختم ہو چکا تھا اور خواب بھی۔۔۔ اب نہ تو کل اس سے ملنے آئی نازو یہاں تھی، نہ اس فوڈ پوائنٹ پہ ملا اس کا بھائی اور نہ ہی گڑوی بجاتی وہ گھونگھٹ والی عورت۔۔۔ اس نے سکون کا سانس لیا اور اٹھ کے باتھ روم کی جانب چل پڑا۔۔۔

اگلے دن راجا بخار میں تپ رہا تھا۔ رات کی طوفانی بارش نے اسے بیمار کیا تھا یا اپنے چھوٹے بھائی کی بے رخی نے؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ بستر سے اٹھنے کی ہمت تھی نہ ہی چاہ کہ نہ تو اس کے پاس کھانا کھانے کے لیے پیسے تھے نہ دوا خریدنے کے لیے۔۔۔ بیماری، بھوک اور بے بسی نے اسے بہت نڈھال کر دیا تھا۔ وہ سارا دن یونہی بستر پہ پڑا رہا، یہاں تک کہ صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام اور شام سے پھر رات ہوگئی اور تب نیم بیہوشی کی حالت میں اسے اپنے کمرے سے باہر آنگن میں چھن چھن کی آواز سنائی دی۔۔۔ تو اسے پچھلی رات اس گھر کے آنگن کی دہلیز پر ہوئی وہ ملاقات یاد آ گئی۔۔۔ وہ آج بھی آئی ہے مگر کمرے سے باہر نکلنے کی اس میں ہمت نہ تھی سو نہ وہ باہر گیا نہ ہی وہ اندر آئی۔۔۔ اور کچھ دیر کی نیم بیہوشی کے بعد وہ مکمل طور پہ بیہوش ہو گیا۔

اسی طوفانی رات نازو اپنے چوکیدار باپ کو نہ جانے کب سے اپنے سرہانے بیٹھے تسلیاں دیتا سن رہی تھی۔ شام کو جب سے وہ بادشاہ سے مل کر آئی تھی بہت دل برداشتہ تھی۔۔۔ کیا بات ہے؟ دیکھ اٹھ کے بیٹھ جا، کھانا کھالے، مجھے ڈیوٹی پہ جانا ہے۔۔۔ وہ جو ایم بلاک کی پارک والی گلی ہے نہ؟ وہاں نئی نئی ڈیوٹی ہے میری۔۔۔ تو گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لینا میں اب صبح ہی آؤں گا۔ ویسے تو ایک نئے گھر کی چوکیداری مجھے ملی تھی لیکن وہ ابھی مکمل نہیں ہوا، اس میں ابھی کھڑکیاں دروازے نہیں لگے۔۔۔ سننے میں آیا ہے کہ اس کے مالک کے ساتھ ٹھیکیدار نے کوئی دھوکہ کیا ہے، کوئی پیسوں کی ہیرا پھیری کا معاملہ ہے اور وہ ٹھیکیدار بھی فرار ہوگیا ہے تو ابھی اس گھر کی تعمیر رک گئی ہے۔۔۔ ورنہ ہم وہیں جا ٹھہرتے لیکن اب میں تجھے کسی بنا کھڑکی دروازے والے گھر میں تو لیجا نہیں سکتا تو وہاں میں نے کسی دوسرے کو اپنی جگہ ٹھہرا دیا ہے۔ دو دن پہلے ایک ہیجڑا آیا تھا میرے پاس، رہنے کو جگہ اور کرنے کو کوئی کام ڈھونڈ رہا تھا۔ میں اسے اپنی نئی نویلی نوکری تو نہیں دے سکتا تھا تو رہنے کے لیے جگہ دے دی کہ وہ میری جگہ اس گھر میں رہ لے جب تک اس کا کوئی دوسرا بندوبست نہیں ہو جاتا، نازو کا باپ بنا رکے بولتا رہا تو وہ وقتی طور پر اپنی پریشانی بھول گئی، یعنی اس گھر کی رکھوالی وہ کرے اور اس کے حصے کی کمائی تم کھا؟ ابا! یہ تو مالک کے ساتھ دھوکہ ہے اور اس غریب کے ساتھ بھی ناانصافی۔۔۔ تنخواہ تم لے رہے ہو لیکن تمہاری جگہ چوکیداری کوئی اور کر رہا ہے؟ تو کیا کرتا؟ تیری شادی کے لیے پیسے کیسے جوڑوں؟ اور تو مجھے یہ زیادہ اچھائی کے سبق نہ دیا کر!

شادی؟ ایک ٹوٹا ہوا سا خواب اس کی آنکھوں میں چبھنے لگا۔۔۔ وہ روتے ہوئے بولی، کون سی شادی؟ عمر ہے میری شادی کی؟ دیکھ مجھے! تیرے جیسے بال سفید ہونے لگے ہیں میرے۔۔۔ وہ تو میری سہیلی سکینہ جس نے پارلر کا کام سیکھا ہے میرے بالوں کو تجربے کے طور پہ مفت میں رنگ گئی۔۔۔ تو کچھ پردہ رہ گیا میری عمر کا لیکن کب تک؟؟؟ وہ رونے لگی اس کے یہ آنسو بڑھتی عمر کے دکھ سے نہیں بادشاہ کے ٹھکرائے جانے پر نکل رہے تھے کہ اس سے پہلے کبھی کسی نے اسے اس کی عمر کا احساس کروا کے اس کی تذلیل نہیں کی تھی۔ دیکھ نازو! شادی تیری بڑھتی عمر کی وجہ سے نہیں، تیری تعلیم کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ تو نے ضد کر کر کے ایف اے کر لیا اور برادری میں کوئی میٹرک پاس بھی نہیں اور پھر۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات پوری کرتا وہ روہانسی ہو کے بولنے لگی۔۔۔ اور پھر یہ کہ میری ماں کے مرنے کے بعد تم نے گاؤں میں دوسری عورت سے شادی کر لی جسے تم

ہر مہینے سارے کے سارے پیسے بھیج دیتے ہو یا اپنے سگرٹ اور نشے پہ لگا دیتے ہو تو بھلا میرے جہیز یا شادی کے لیے کیسے کچھ جڑ پاتا؟ اس نے اپنے باپ کے لیے اپنے دل میں بھرا کئی سالوں کا غصہ ایک پل میں نکال دیا تو وہ اسے حیرت اور غصے سے تکنے لگا۔۔۔ ہاں! تو مر جاتی نہ اپنی ماں کے ساتھ؟ ایک ہی اولاد وہ بھی بیٹی وہ بھی بوجھ۔۔۔ تجھے کل ہی چھوڑ کر آتا ہوں گاؤں اور وہاں اس پانچ بچوں کے باپ کلونائی کے ساتھ بیاہ کے وہیں دفن کر کے تیری دوسری ماں کو یہاں لے کر آؤں گا۔۔۔ بلکہ یہ کام پچھلے سال ہی کر دینا چاہیے تھا۔ وہ تو کب سے رشتہ مانگے بیٹھا تھا پر اب دیکھ کیا کرتا ہوں میں تیرے ساتھ۔۔۔ وہ غصے میں چنگھاڑتا باہر نکل گیا۔۔ اور وہ اپنے بھاری سے وجود میں اپنا نازک سا دل تھامے وہیں بیٹھی رہ گئی۔۔۔ اور پھر اس نے ایک آخری بار بادشاہ کی منت کرنے کی ٹھانی اور ساری رات اس طوفانی رات میں بادشاہ کو فون کرتی رہی اور پھر اس نے ایک آخری میسج اس کے فون پہ چھوڑا۔۔ بیوی ہی نہیں تو اپنے گھر کی نوکرانی ہی بنا لو۔۔۔ میں وعدہ کرتی ہوں تم سے اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگو گی۔۔۔ بھول جاؤں گی کہ تم نے کبھی مجھ سے محبت کے بہت دعوے کیے تھے اور ملنے کی بہت ضد اور پھر مجھے ٹھکرا دیا۔۔۔ لیکن میں تم سے کی اپنی محبت کو نہیں بھلا سکتی، بس اس وقت مجھے اپنے گھر میں پناہ دے دو ورنہ میرا باپ مجھے کسی اور سے بیاہ دے گا۔ وہ شخص پانچ جوان بچوں کا باپ اور پہلے سے تین بیویوں کا شوہر ہے اور گاؤں میں بہت بدنام بھی۔۔۔ مجھے اس وقت تمہاری مدد کی بہت ضرورت ہے میں نے تم سے پہلے یا تمہارے علاوہ کبھی کسی کو نہیں چاہا۔۔۔ یقین نہ آئے تو تم مجھ آزما کے دیکھ لو تم جو کہو گے میں وہ کر گزروں گی ایک بار کہہ کے دیکھو! طوفانی رات ختم ہونے سے ذرا پہلے جب بادشاہ کی خوفناک خواب سے ڈر کر پھر سے آنکھ کھلی تو فون کی سکرین پہ پھیلتی روشنی نے اسے فون دیکھنے پہ مجبور کیا اور پھر اس نے جلدی میں کچھ ٹائپ کر کے فون بستر پہ ہی ایک طرف پھینک دیا۔

دو دن بعد اسی علاقے کے ایک بہت بڑے پارک میں کوئی فیسٹیول تھا جہاں لوگ اپنی فیملیز اور دوستوں کے ساتھ کھانے پینے اور لائیو میوزک سے لطف اندوز ہونے آ رہے تھے۔ وہیں بادشاہ بھی اپنے دوستوں کے ساتھ اس جگہ موجود لائیو پرفارمنس دیکھتے ہوئے بولا، سیریسلی؟ اس سے زیادہ اچھا تو ہمارے علاقے کے کتے گا لیتے ہیں تو پھر ان انٹرنیشنل سنگرز کو یہاں بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ بیش! فار گارڈ سیک! اتنی انسلٹ تو نہ کرو ہماری۔۔۔ پچھلے تین مہینے سے ہم سب یہ فیسٹیول آرگنائز کرنے کی تیاری کر رہے ہیں اور تم نے ایک منٹ میں اپنے سب دوستوں کی محنت مٹی میں ملا دی؟؟؟ اس کے دوستوں میں سے ایک لڑکی ٹینا بولی جو آرگنائزنگ کمیٹی کا حصہ تھی۔ ارے تم لوگوں کو تھوڑی کچھ کہا ہے میں تو اس بے سرے سنگر کو کہہ رہا ہوں اور کوئی نہیں ملا تم لوگوں کو؟ اس نے پھر سے تذلیل کی۔ اچھا! تو کسے بلاتے؟ تیری اس رات کی گڑوی والی کو؟ وہ بھیانک آواز میں بھیانک گیت گانے کے لیے؟ تاکہ سب بھاگ جاتے؟ ایک دوست نے کہا تو دوسرا بولا، نہیں اس فیس بک والی نازو کو جو دیکھنے میں بھلا جیسی بھی تھی لیکن آواز تو اچھی ہی تھی اس آنٹی کی، ہمیں فون پہ کئی بار لاؤڈ سپیکر آن کر کے بیش نے سنوائی تھی اور اسے سن کے ہمیں بھی یہی لگا تھا کہ کوئی کمسن سی حور پری ہوگی۔ ارے نہیں! اس فوڈ پوائنٹ پہ اس کے گلے لگنے والے ہیجڑے کو بلا لیتے جو اسے اپنا بھائی سمجھ رہا تھا، تیسرے دوست نے بھی بیش کا تمسخر اڑایا۔ اوہ شٹ اپ یو آل! ایک فیسٹیول تو ڈھنگ سے آرگنائز ہوتا نہیں تم لوگوں سے، اور میرا مذاق اڑانے چلے ہو؟ مجھے اس دن ملے ان سب نمونوں کو یاد کروا کے دل خراب کرنا چاہتے ہو میرا؟ غلطی کی تم لوگوں کو اپنے خواب میں ان تینوں کو آ کے مجھے ڈرانے کا بتا کے۔۔۔ لیکن وہ بس ایک خواب تھا کیونکہ وہ تینوں ایک ہی دن ٹکرے تھے مجھے۔۔۔ لیکن میں ان سے ڈرتا نہیں بلکہ

اگر مجھے وہ تینوں دوبارہ نظر آ گئے تو انہیں جان سے مار دوں گا۔۔۔ نمونے کہیں کے۔۔۔ اور یہ تم لوگوں کا بچوں والا فضول فیسٹیول تم لوگوں کو ہی مبارک ہو۔۔۔ آئے ایم گوئنگ سم ویئر ایلس۔۔۔ وہ غصے سے اپنی نشست سے اٹھ کے جانے لگا تو ٹینا بھی اس کے پیچھے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔

ارے جانے دو اس بگڑے امیر زادے کو! اسے کیا پتہ عزت، دولت اور رشتے کیسے کمائے جاتے ہیں؟ سب کچھ ہمیشہ پلیٹ میں پڑا ملا ہے اسے، اس لیے کسی کو کچھ نہیں سمجھتا، ہم دوستوں کو بھی نہیں، ایک لڑکے نے ٹینا کو بادشاہ کے پیچھے جانے سے روکتے ہوئے کہا۔ تو تم لوگوں کو بھی کیا ضرورت تھی اسے وہ سب یاد کروانے کی؟ دیکھو! وہ ہم پہ بہت پیسہ خرچ کرتا ہے۔ ہماری آدھی سے زیادہ پارٹیز وہی سپانسر کرتا ہے۔ ہمارے ٹرپس وہی ارینج کرتا ہے۔ ہم اسے اس طرح ناراض نہیں کر سکتے، اس میں ہم سب کا ہی نقصان ہے۔ ٹینا نے تو جیہہ پیش کی تو ایک اور لڑکا بولا، ہاں یار! ویسے بات تو ٹھیک ہے اس کی۔۔۔ بیش کو ناراض کر کے ہم اپنا ہی نقصان کریں گے۔ بادشاہ کے خود غرض اور مطلبی دوست بھی اس کے ساتھ اپنی غرض کے لیے تھے۔ ٹھیک ہے! لیکن ہم میں سے ابھی کوئی نہیں جائے گا۔ تم اس کے ساتھ جانا چاہتی ہو تو جا، اس کا موڈ بہتر ہوا تو ہم بعد میں مل لیں گے اس سے۔۔۔ ایک اور لڑکے نے ٹینا کو بادشاہ کے پیچھے جانے کی منظوری دے دی اور وہ تیزی سے کانسرٹ ائیریا سے نکل کے بادشاہ کو ادھر ادھر ڈھونڈنے لگی جو اسے کچھ دیر میں ایک طرف کھڑا سیگرٹ جلاتا نظر آ گیا۔

بیش! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔۔۔ یہ بالکل بچوں کے میلے جیسا ہے۔ اب کیا کریں بھئی جتنا پیسہ تھا اتنا ارینج کر دیا، اب ہم تمہارے جتنے امیر تو ہیں نہیں۔۔۔ اگلی بار تم زیادہ پیسے دے کر اپنی مرضی کے سنگرز کو بلوا لینا او کے؟؟؟ وہ اس کے پاس آتے ہی بہت چاپلوسی سے بولی۔ ٹھیک ہے! میں ایک ہیلو وین پارٹی میں جا رہا ہوں، تم چلو گی؟ بادشاہ نے پوچھا تو وہ جلدی سے بولی، ہاں! وائے ناٹ؟ لیکن پہلے تمہیں میرے ساتھ ایک ایسے سٹال پہ جانا ہو گا جو میں نے خاص طور پہ تمہارے لیے ڈیزائن کروایا ہے۔ اوہ نو پلیز! یہاں میری پسند کا کچھ بھی نہیں! وہ بولا تو وہ اس کے سامنے آتے ہوئے التجایا لہجے میں بولی، بیش پلیز! میری خاطر؟ نہیں تو اپنی کسی پرانی خواہش کی ہی خاطر؟ وہ نہ جانے کیا بولے جا رہی تھی؟ بادشاہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا! کیا مطلب؟ بس تم چلو میرے ساتھ! اور وہ اس کا ہاتھ پکڑے اسے اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے بولی، تم نے ایک بار مجھے بتایا تھا نہ کہ تم اپنے ہاتھ پہ ٹیٹو بنوانا چاہتے ہو؟ تو میری ایک چیسی دوست رومانیہ سے یہاں اپنی ٹیم کے ساتھ پاکستان آئی ہوئی ہے اس لیے میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کے، اس سے بہت ریکوئسٹ کر کے یہاں اس کا ایک سٹال بنوایا ہے۔ میں تمہیں اس سے ملوانا چاہتی ہوں۔ اچھا؟ اب خانہ بدوشوں سے ملنا رہا گیا ہے میرا؟ تم لوگ بھی کیا دو دو ٹکے کے لوگوں کو دوست بناتے پھرتے ہو؟ کوئی سٹینڈرڈ نہیں تم لوگوں کا؟ وہ ایک پل کے لیے بھی اپنی امیری کے زعم سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ ارے کوئی دو ٹکے کی نہیں ہے، بلکہ بہت کمال کی شخصیت ہے، ووڈو، وچ کرافٹ، ٹیرو ریڈنگ، چیسی میجک سب سے واقف ہے اور بڑے کمال کی آرٹسٹ بھی ہے۔ اس کے چیسی ہونے پہ مت جا! کچھ خانہ بدوش بھلے بنجاروں کی سے زندگی گزارتے ہوں لیکن ان کا یہی بنجارہ پن انہیں دنیا کو ہم سے زیادہ دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیتا ہے، ٹینا نے جانے انجانے میں بڑے پتے کی بات کر دی تھی لیکن بادشاہ کو نہ تو اپنے آگے کسی کی تعریف سننا پسند تھا اور نہ ہی کسی اور کی بڑائی دیکھنا۔۔۔ وہ بولا۔۔۔ دنیا تو میں نے بھی ساری گھومی ہے۔ کون سا ملک ہے جہاں میں نہیں گیا؟ ساتوں کانٹینینٹس گھوم چکا ہوں۔ ارے تم تو سیاحت کی غرض سے گھومتے ہو لیکن یہ مشاہدے، علم اور تجربوں کے لیے دنیا گھومتی ہے، ٹینا اب بھی اپنے موقف پہ قائم

تھی۔ ہاں تو پیشہ بھی تو یہی ہوتا ہے ان خانہ بدوشوں کا۔۔۔ پہلے غلے اور گندم بیچا کرتے تھے۔ اب دنیا جہان کی چیزیں لیے ایک ملک سے دوسرے ملک پھرتے ہیں۔۔۔ فقیر کہیں کے۔۔۔ اور مجھے علم کا کیا کرنا ہے؟ میرے پاس میرے مرحوم ماں باپ کا کافی پیسہ ہے جو ساری زندگی بھی خرچ کرتا رہوں تو ختم نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنے تکبر سے باز آنے کو تیار نہ تھا۔ تو اس کا یہ پیشہ فقیری تو نہیں تجارت ہوئی بیش! ٹینا نے جواب دیتے ہوئے اپنے قدم ایک جگہ روک دیے کہ وہ دونوں ایک کینوپی کے باہر پہنچ چکے تھے جہاں قدرے اندھیرا ہونے کی وجہ سے رش کم تھا۔ یہ خیمہ باقی اسٹالز سے قدرے ہٹ کے تھا تبھی یہاں باقی جگہ کی نسبت رونق بھی کم تھی اور روشنی بھی۔۔۔ اور یہ باقی کے سٹالز کی نسبت مکمل طور پہ ڈھکا ہوا تھا جس کے داخلی راستے پہ ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ خیمے کے داخلی راستے کے اوپر ایک بینر پہ بڑا بڑا ویلکم ٹو دا جپسی ورلڈ لکھا دیکھ کے بادشاہ سر جھٹک کے ٹینا کے پیچھے اندر داخل ہوگیا۔

باہر سے ہی نہیں یہ کینوپی اندر سے بھی باقی تمام اسٹالز سے الگ تھی۔ جہاں بیرونی جانب رنگ برنگے ڈیزائنوں سے مزین خوبصورت بینر کے اردگرد گولڈن رنگ کی مصنوعی فیری لائٹس لگی تھیں وہیں اندر سے یہ جا بجا طرح طرح کی موم بتیوں اور دنیا جہان کے نوادرات سے مزین تھا۔ اس نے آج سے پہلے کسی پاکستانی میلے میں کسی بھی سٹال کی ایسی خوبصورت سجاوٹ نہیں دیکھی تھی۔ یہاں کا ماحول ہی الگ تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ دنیا ہی الگ ہے۔ یہاں کوئی برقی روشنی نہیں تھی لیکن بے تحاشہ موم بتیوں، کیروسن لیمپس اور زمین پہ کئی جگہ جلتے مشعل دانوں سے نکلتی آگ نے اسے کسی قدیم زمانے کے ماحول میں تبدیل کردیا تھا۔ وہ ایک بہت بڑا خیمہ تھا باہر سے جتنا نظر آتا تھا اندر اس سے کہیں زیادہ کشادہ تھا۔ وہاں دائیں بائیں دو عدد لمبے گھنگھریالے بالوں اور عجیب سے حلیے والے آدمی دو الگ الگ میزوں پر بیٹھے تھے اور ان کے پاس اسکن پینٹنگز کا سامان موجود تھا جن میں سے ایک آدمی کسی سرنج نما مشین سے ایک لڑکے کے بائیں ٹخنے پہ کوئی ڈیزائن بنانے میں مصروف تھا۔ کسی جرمن موسیقی کی دھن نے ماحول کو پراسرار بنا رکھا تھا۔ وہ سب اس کی توقع سے بڑھ کر تھا۔۔۔ کافی متاثر لگ رہے ہو۔۔۔ کیوں پھر؟ ٹینا نے ابرو چڑھا کے دادا چاہی لیکن وہ اپنے تاثرات کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا بولا۔۔۔ آئی رومانیہ سے ہے اور میوزک جرمن چلا رکھا ہے؟؟؟

اس کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ وہ اپنے پرکشش سراپے کے ساتھ ایک باریک سے جالی کے سفید پردے کے پیچھے سے جلوہ گر ہوئی۔۔۔ رومانیہ میں صرف رومانی زبان ہی نہیں ہنگرین، یوکرائنین، رشین، ٹرکش، ٹاٹر، سربین، سلوویک، بلگیرین، کروشین اور جرمن زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ جیسے آپ کے ملک میں اردو، پنجابی پشتو، سندھی، سرائیکی، بلوچی، کشمیری، ہندکو، بلتی، دھاتی، مارواری، وخی، کھووار، شنیا، بروشسکی، براھوئی اور ہریانوی بھی بول جاتی ہے۔۔۔ اب آپ یہ کہیں گے کہ ہریانہ تو انڈیا میں ہے تو یہاں ہریانوی کیوں بولی جاتی ہے؟ اب یہاں بھی تو انگلش میوزک چلتا ہے جب کہ آپ انگلینڈ سے تو نہیں آئے؟ آپ تو پاکستانی ہیں۔ نہایت پرکشش اور باوقار سی اس عورت کو اتنی صاف اردو میں اتنا علم جھاڑتے دیکھ اس کی تو جیسے بولتی ہی بند ہوچکی تھی۔۔۔ اس کے پاس کہنے کو ایک لفظ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کھڑی ٹینا بمشکل اپنی ہنسی کنٹرول کر پا رہی تھی۔ ٹینا کی مصنوعی کھانسی نے بادشاہ کو اسے گھورنے پہ مجبور کردیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی لاعلمی کے اس مظاہرے پہ ہوئی بیعزتی پہ غصے میں آتا، ٹینا جھٹ سے بولی۔۔۔ ہی از بادشاہ! بٹ وی فرینڈز کال ہیم بیش۔۔۔ اینڈ بیش! یہ ہے میری دوست صوفیہ۔۔۔

آپ واقعی رومانیہ سے آئی ہیں یا پاکستان کے ہی کسی شہر سے؟ اپنی زبان سے تو آپ جپسی کم اور دیسی زیادہ لگتی ہیں، بادشاہ نے اپنی طرف سے اس کی پہچان کو

جھٹلانے کی کوشش کی۔۔۔ہم خانہ بدوشوں کا تعلق حقیقتاً شمالی انڈیا کے پنجابی خطے سے ہی تھا یعنی برصغیر سے۔۔۔جب پاکستان اور ہندوستان ایک ہوا کرتے تھے اور ہماری قوم بنجاروں کی قوم کہلاتی تھی اور پھر ہماری قوم نے آٹھویں اور دسویں صدی کے بیچ یورپ کی طرف سفر شروع کر دیا۔اور پھر جب ہماری قوم اپنے براعظم سے دوسرے براعظم میں گئی تو یورپ نے ہمیں جپسی کا نام دے دیا کیونکہ انہیں یہ غلط فہمی ہو چلی تھی کہ ہم ایجپٹ یعنی مصر سے آئے ہیں۔ہماری قوم چونکہ ایک واضح اقلیت تھی تو ہم جدھر جاتے وہاں کے کبھی نہیں کہلائے جا سکے۔۔۔آج ہماری قوم پوری دنیا کے سبھی براعظموں کے تقریباً ہر ملک میں موجود ہے لیکن آج بھی ہم خانہ بدوش ہی کہلاتے ہیں لیکن مصری۔۔۔یعنی جپسیز۔۔۔تو ضروری نہیں کہ دنیا آپ کو جو ٹیگ دیتی ہے یا جو سمجھتی ہے آپ کی حقیقت بھی وہی ہو۔۔۔تو یہ اردو، پنجابی، راجھستانی تو ہمارے خون میں ہے۔۔۔ہم بھلے آج پوری دنیا کی زبانیں اور کلچرز سے واقف ہیں لیکن اپنی جڑوں سے جدا نہیں۔۔۔صوفیہ نے ایک بار پھر بادشاہ کو خاموش کروا دیا تھا۔

وا! یہ سب تو میں بھی نہیں جانتی تھی جپسیز کے بارے میں۔۔۔تھینک یو صوفیہ اس انفارمیشن کے لیے۔۔۔تم لوگ تو بہت انڈر ریٹڈ قوم ہو یار! ٹینا حیرت زدہ تھی۔اس نے بادشاہ کی طرف دیکھ کر داد لینا چاہی مگر حسد اور کوفت اس کے چہرے پہ پہلے سے بھی کئی گنا بڑھ چکی تھی جسے صوفیہ نے واضح طور پہ محسوس کر لیا تھا۔اقلیتیں اکثر انڈر ریٹیڈ ہی ہوتی ہیں چاہے کتنی ہی باعلم اور باشعور کیوں نہ ہوں اور اکثریت اوور ریٹڈ چاہے کتنی ہی نکمی اور لاعلم ہی کیوں نہ ہو۔۔۔یہی دنیا کا دستور ہے۔صوفیہ نے بڑے تحمل سے ٹینا کو جواب دیا لیکن اس کی نظریں بادشاہ کے مغرور چہرے کا جائزہ لیتی رہیں۔اچھا تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ اندر آ نا۔۔۔اور وہ بادشاہ کے چہرے پہ بڑھتی اوازاری کو دیکھتے ہوئے اپنی بات کو ختم کر کے انہیں لے کے پردے کے دوسری طرف چل پڑی۔۔۔

خیمے میں سفید جالی کے پردے سے تقسیم شدہ ایک الگ حصے میں ٹینا اور بادشاہ میز کے دوسری طرف صوفیہ کے سامنے بیٹھے تھے۔میز پہ جا بجا نوورات کے ساتھ ساتھ مختلف عنواع کے تاش کے پتوں جیسے کئی سیٹس پڑے تھے اور ایک طرف ایک اور میز پر مجسمے اور کتابیں موجود تھیں۔تو بتائیں مسٹر بادشاہ! کس سروس سے مستفید ہونا چاہیں گے آپ؟ ٹیرو کارڈز؟ اوریکل کارڈز؟ ڈیویل کارڈز آف ڈیک یا؟؟؟ ابھی صوفیہ کی بات ادھوری تھی کہ بادشاہ تمسخرانہ انداز میں درمیانی میز پہ پڑے فٹبال کے سائز جتنے بڑے ایک سفید بلب جیسے سفید گلوب نما شیشے کے گیند کو دیکھ کے بنا رکے ہنسنے لگا۔۔۔جیسے بس اسے کسی ایسے ہی موقع کی تلاش تھی صوفیہ کو نیچا دکھا کے بدلہ لینے کے لیے۔۔۔یہ بچوں کی فلموں والا گلوب یہاں کیا کر رہا ہے؟ ویسے اچھا طریقہ ہے لوگوں کو بیوقوف بنانے کا۔۔۔یہاں تو ویسے بھی بے وقوف بھرے پڑے ہیں۔۔۔ویسے اس میں فیوچر نظر آتا ہے یا پاسٹ؟ وہ ہنستے ہوئے مذاق اڑا رہا تھا۔۔۔تو وہ مسکراتے ہوئے بولی جو آپ دیکھنا چاہیں۔۔۔صوفیہ کا اطمینان قابل دید تھا۔مجھے کچھ نہیں دیکھنا، میں سب جانتا ہوں، میرے ماضی اور حال کی طرح میرا مستقبل بھی شاندار ہے، وہ بیفکری سے بولا۔پہلے پاسٹ سے شروع کرتے ہیں، ٹینا نے دلچسپی سے کہا تو صوفیہ نے آنکھیں بند کر کے گلوب پہ ہاتھ لہرائے اور پھر آنکھیں کھولیں اور اس کے چہرے پہ غصے اور افسوس کے ملے جلے تاثرات ابھرنے لگے، اس نے ایک نظر انٹیریئر ڈیکوریشن کا معائنہ کرتے ہوئے لاپرواہ سے بادشاہ پہ ڈالی اور ٹینا سے پوچھا، پریزنٹ بتاں؟ کچھ ایسا جو اس کی نظروں سے اوجھل ہو؟ ہاہ! اپنے ماضی کا مالک میں خود تھا، اپنے حال کے بارے میں سب جانتا ہوں اور اپنے مستقبل کا مالک بھی میں خود ہی ہوں گا، کوئی اور مجھے کیا بتائے گا؟ بادشاہ مغرورانہ انداز میں بولا۔

تمہارے مذہبی عقائد کے مطابق تو ہر چیز کا مالک تو خدا ہوتا ہے نا؟ صوفیہ نے بیش سے سوال کیا۔۔۔ میرے مذہب کو چھوڑو تم اپنے مذہب کی بات کرو، بادشاہ نے خفگی سے کہا۔ میرا تو کوئی مذہب ہے ہی نہیں، میں تو بے دین ہوں! دنیا میں جہاں جہاں جاتی ہوں، وہاں کے مذاہب سے اپنے مطلب کی چیز اپنا لیتی ہوں لیکن کسی دین کی پیروکار نہیں ہیں! میں آزاد ہوں ہر چیز سے۔۔۔ تم جیسے نام نہاد مہذبوں کو ان سے جڑی خوشخبریوں اور بری خبروں کو پہنچاتی ہوں، ان کی آزمائشوں سے انہیں خبردار کرتی ہوں، ماضی میں جو گناہ وہ کر چکے ہوتے ہیں ان کے انجام سے آگاہ کر کے بچنے کی ترکیب بتاتی ہوں، حال میں جس خطرے سے وہ دوچار ہوتے ہیں ان کی تدبیر کرتی ہوں اور مستقبل میں جو آنے والا ہو اس سے خبردار کرتی ہوں۔ خدا کی گنہگار کہو یا شیطان کی ہمراز۔۔۔ یہی میری اصلیت ہے۔۔۔ صوفیہ نے اپنی شخصیت کا خلاصہ کیا۔

دیکھو! بیش کا حال تو میں ہوں، زرا دیکھ کے بتا کہ اس کے فیوچر میں بھی میں ہوں یا نہیں؟ ٹینا نے صوفیہ کو آنکھ مارتے ہوئے کہا تو بیش ٹینا کی بات پہ ہاتھ جھٹک کے اٹھ کھڑا ہوا اور وہاں لگے ایک بورڈ پہ ٹیٹوز کے ڈیزائنز دیکھنے لگا اور صوفیہ اپنے چہرے کے غصیلے تاثرات بدل کر مسکراتے ہوئے پھر سے اس شیشے کے گیند کو چھوئے بنا اس کے اوپر اپنے ہاتھ لہرانے لگی۔۔۔ اور پھر حیرت اور پریشانی سے اس کی آنکھیں پھیلتی گئیں۔۔۔ اس نے بادشاہ کی طرف فکرمندی سے دیکھا۔۔۔ کیا ہوا؟ ٹینا نے صوفیہ کے تاثرات دیکھتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔۔۔ کیا جو میں دیکھ رہی ہوں وہ بتا دوں؟ ٹینا نے اپنی نشست سے اٹھ کے گلوب میں دیکھنا چاہا لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔۔۔ بادشاہ نے بھی کھڑے کھڑے ایک نظر اس گلوب پہ ڈالی جہاں کچھ نہیں تھا۔ وہ پھر سے تمسخرانہ انداز میں ہنسا۔۔۔ کچھ ہوگا تو نظر آئے گا نہ؟ مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا۔ حد ہے دھوکے بازی کی، میرا خیال ہے ہم ٹیٹو بنوا لیتے ہیں۔ یہ سب کہہ کر وہ باہر نکل گیا جبکہ ٹینا صوفیہ کے پاس آ کر کھڑی ہوئی۔۔۔ صوفیہ مائینڈ مت کرنا لیکن کیا یہ واقعی مذاق ہے؟ بیش کو بھی کچھ نظر نہیں آیا۔ جس شخص کو اپنے سامنے ایک سیدھی ڈائمینشن میں موجود انسان نظر نہیں آتے اسے کسی دوسرے ڈائمینشن میں موجود دوسری دنیا کی حقیقت بھلا کیا نظر آئے گی۔۔۔ صوفیہ نے ٹینا کو اس کی سمجھ سے بالاتر جواب دیا۔۔۔ اور اپنے ہاتھ گلوب پر سے ہٹا لیے۔۔۔ اور مجھے کچھ نظر کیوں نہیں آیا؟ ٹینا نے سوال کیا۔ کیونکہ تم بھی بنیادی طول وعرض سے زیادہ کسی اور طول وعرض میں نہیں دیکھ سکتی۔۔۔ صوفیہ نے جواب دیا۔۔۔ اور تم کیونکر دیکھ سکتی ہو؟ ٹینا نے سوال کیا۔ کیونکہ میری تیسری آنکھ کھلی ہے۔۔۔ صوفیہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔۔۔ ہیں؟ اب یہ تیسری آنکھ کیا ہوتی ہے؟ ٹینا نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔۔۔ پھر کبھی بتاں گی۔۔۔ ابھی اپنے دوست کا کام کروا دو ورنہ اس کی یہ آخری خواہش بھی رہ جائے گی۔۔۔ صوفیہ نے پردے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔۔۔ آخری خواہش مطلب؟ صبح پھانسی ہے کیا اسے؟ ٹینا نے ہنستے ہوئے مذاقاً کہا اور صوفیہ جو اسے جواب دیے بنا پہلے ہی باہر نکل چکی تھی، ٹینا بھی اس کے پیچھے پردے سے باہر آ گئی۔

کہاں بنوانا ہے؟ ٹیٹو آرٹسٹ نے سپینش لہجے میں انگلش بولنے کی کوشش کی تو بادشاہ نے اپنی گردن پہ انگلی رکھی۔ کون سا ڈیزائن سیلیکٹ کیا ہے؟ ٹینا نے باہر آتے ہی بادشاہ سے پوچھا۔۔۔ بادشاہ ہوں بادشاہ ہی چنوں گا۔ اور اس نے بورڈ پہ لگے ایک ڈیزائن کی طرف اشارہ کیا جس پہ ایک کھوپڑی کے سر پہ تاج رکھا تھا اور اس نے ایک شاہی لباس پہنا ہوا تھا جس پہ کچھ نہ سمجھ میں آنے والے نشان بنے ہوئے تھے۔ اس ڈیزائن کے اوپر بائیں جانب اور نیچے دائیں کونے پہ کے یعنی کنگ لکھا ہوا تھا جیسا تاش کے پتے پہ لکھا ہوتا ہے۔ دیز ٹیٹوز آر ایکسکلیوسولی اینڈ اوریجنلی ڈیزائنڈ بائے صوفیہ! یو کینٹ فائنڈ دیم اینی وئیر ایلس ان دا ورلڈ! سپینش

آرٹسٹ نے انگلش زبان اور سپینش لہجے میں بادشاہ اور ٹینا کو بتایا۔ واؤ! انٹرسٹنگ۔۔۔ ٹینا نے خوش ہوتے ہوئے بادشاہ کو داد دی۔۔۔ لیکن صوفیہ نے اس ٹیٹو آرٹسٹ کے ہاتھ سے وہ کاغذ لیتے ہوئے بادشاہ کو کہا۔۔۔ اگر میں کہوں کے یہ ڈیزائن تمہارے لیے ٹھیک نہیں، تم کچھ اور بنوالو تو کیا تم میری بات مانو گے؟ وٹ نانسنز از دس؟ سیدھی طرح کہو کے تم لوگوں نے بس ہم لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لیے یہ مشکل مشکل ڈیزائنز لگا رکھے ہیں بورڈ پہ لیکن آتا جاتا کچھ نہیں۔۔۔ ٹینا! یہ لوگ کوئی آرٹسٹ وارٹسٹ نہیں ہیں۔۔۔ فراڈز ہیں۔ یہ دو آدمی بھی یہیں پاکستان سے ہی کہیں سے پکڑ کے لائی ہے۔ وہ میز کے سامنے سے اٹھنے لگا تو صوفیہ بولی، ایک منٹ! اور اندر اپنے حصے کی طرف چلی گئی۔

جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک اور کاغذ تھا جس پہ بالکل ویسا ہی ڈیزائن تھا لیکن کچھ فرق کے ساتھ۔۔۔ صوفیہ کے لائے کاغذ میں اس کھوپڑی والے بادشاہ نے جو شاہی لباس پہنا ہوا تھا اس پہ مزید باریک باریک کچھ علامات بنی ہوئی تھیں۔ عجیب و غریب شکلیں اور نہ سمجھ میں آنے والے نشانات نے پورے ٹیٹو کو اپنے گھیرے میں لیتے ہوئے مزید مشکل اور دلچسپ بنا ڈالا تھا۔ صوفیہ نے وہ کاغذ آرٹسٹ کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ یہ لو لوئس! اور بتا دو انہیں کہ ہم کتنے مشکل اور باریک ترین ڈیزائن بنا سکتے ہیں۔۔۔ لوئس نے ایک نظر صوفیہ کے لائے کاغذ پہ ڈالی اور پریشانی سے صوفیہ کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں ابھرتے خوف کو صوفیہ نے پڑھ لیا تھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کام شروع کرنے کا اشارہ دیا۔۔۔ بادشاہ نے بھی صوفیہ کے لائے کاغذ اور پہلے کاغذ پہ بنے ڈیزائن کا موازنہ کیا تو بولا یہ تو ایک جیسے ہی ہیں لیکن ایسا کہتے ہوئے اس کی نظر صوفیہ کے لائے ڈیزائن کے فرق پہ پڑی تو کھوپڑی کے شاہی لباس پہ اور اردگرد بنے بے تحاشہ علامات اور باریک ترین ڈیزائن کا فرق واضح ہونے لگا۔۔۔ اور وہ اس ٹیٹو کے بہتر ورژن کو پا کر مطمئن ہو گیا اور خاموشی سے صوفیہ کا لایا ڈیزائن لوئس کے آگے کر دیا۔۔۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھا کہ صوفیہ کا پیش کردہ ڈیزائن بورڈ پہ لگے ڈیزائن سے کہیں زیادہ بھرا بھرا اور مشکل ہے۔

لیکن بیش! ہمیں تو اگلی پارٹی میں جانا ہے اور اس میں تو مزید دیر لگ جائے گی۔ ٹینا بادشاہ کو یہاں اسے خوش کرنے کے لیے لے تو آئی تھی لیکن اس کے ساتھ اس کی اگلی پارٹی میں جانے کے لیے بھی بیچینی تھی تاکہ وہ باقی دوستوں کے بنا بادشاہ کے ساتھ مزید کچھ وقت گزار سکے۔ لوئس دنیا کے تیز ترین ٹیٹو آرٹسٹس میں سے ایک ہے اور تیز ترین ٹیٹو بنانے کے کئی مقابلے بھی جیت چکا ہے۔ اس سے بہتر اور جلدی یہ کام کوئی اور نہیں کر سکتا۔ میری ٹیم دنیا کی بہترین ٹیم ہے۔ لوئس! گیٹ اٹ ڈن ایز کوئیکلی ایز پوسیبل۔۔۔ وقت بہت کم ہے، صوفیہ نے ٹینا کو تسلی دینے کے بعد آخری جملہ لوئس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت پراسرار انداز میں کہا جسے صرف لوئس ہی سمجھ سکتا تھا۔ اس نے ہاں میں سر ہلایا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

بادشاہ جو ٹیٹو بنوانے کا شوقین تھا لیکن ابھی تک کسی نہ کسی وجہ سے بنوا نہ پایا تھا، اب اس موقع کو وہ بھی ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتا تھا سو وہ بھی مصنوعی ناراضگی کے ساتھ راضی ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اطمینان سے لیٹا اپنی گردن پہ ڈیزائن بنوانے لگا۔۔۔ آرٹسٹ نے اپنا کام شروع کیا اور نوے منٹ کی مسلسل محنت سے ہو بہو وہی ڈیزائن بادشاہ کی گردن کے اگلے حصے پہ کندہ ہو گیا جو اس کے سامنے موجود ایک کاغذ پر بنا ہوا تھا۔ بادشاہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ باجی؟ بادشاہ نے اپنا والٹ جیب سے نکالتے ہوئے پوچھا اور تبھی اس کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔۔۔ تھنگ! لوئس کی جگہ سامنے کھڑی صوفیہ نے جواب دیا اور اپنے بجتے فون کو اٹینڈ کر کے کان سے لگاتے ہوئے بادشاہ نے صوفیہ اور لوئس کو باری باری دیکھتے ہوئے بے نیازی اور احسان فراموشی سے کہا، ایز یو وِش۔۔۔ جس پہ صوفیہ بولی، یہ ہم

خانہ بدوشوں کی طرف سے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے۔۔۔ موت کا۔۔۔ اور اس سے پہلے کہ وہ مسکراتی ہوئی صوفیہ کے آخری دو الفاظ سنتا، وہ فون کو کان کے ساتھ لگائے مطلوبہ کالر کی بات سنتے ہوئے صوفیہ کی بات کو مکمل نظر انداز کرتا پلٹ چکا تھا۔۔۔ ؟؟؟ کچھ کہا تم نے صوفیہ؟ ٹینا نے بھی صوفیہ کی آدھی ادھوری بات سنی کیونکہ اس کا پورا دھیان خیمے سے باہر نکلتے بادشاہ کی گردن پہ بنے تازہ ترین ٹیٹو پہ تھا۔ ہاں! مگر جس کو کہا اس نے سنا نہیں، تو تم سن کر کیا کرو گی؟ صوفیہ نے پراسرار انداز میں جواب دیا۔۔۔ اف بہت مشکل باتیں کرتی ہو تم صوفیہ! اچھا بیش مجھے چھوڑ کے ہی پارٹی میں چلا جائے گا تو میں تمہیں بعد میں فون کروں گی، تھینک یو، بائے۔۔۔ اتنا کہہ کر وہ بھی بادشاہ کے پیچھے تیزی سے باہر نکل گئی۔۔۔ ان کے باہر جاتے ہی لوئس اور صوفیہ نے ایک دوسرے کو پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھا۔۔۔ آر یو ڈن؟ لوئس نے پوچھا۔۔۔ ناٹ یٹ! اٹس جسٹ سٹارٹڈ! صوفیہ نے اسی پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔۔۔

تم مجھے پہلے بتا دیتے کہ تمہارا ارادہ کسی ہیلووین پارٹی میں جانے کا ہے تو میں کوئی گیٹ اپ کر لیتی یا میک ہی کر لیتی کوئی خوفناک سا۔۔۔ اب ہمیں یہاں اینٹر کون ہونے دے گا؟ ٹینا گاڑی سے اترتے ہوئے ایک فارم ہاس کے باہر لوگوں کو خوفناک بھیس بدلے اندر جاتے دیکھ کر مایوسی میں بادشاہ سے بولی۔ بادشاہ کو کسی تھیم پارٹی کے لیے کسی گیٹ اپ کے ضرورت نہیں اور تم اپنی اصل شکل کے ساتھ زیادہ خوفناک ہو۔۔۔ بادشاہ نے ٹینا کا مذاق اڑایا تو وہ مصنوعی ناراضگی سے اسے دیکھنے لگی۔۔۔ اور کس میں اتنی مجال کہ مجھے اندر جانے سے روکے؟ ڈونٹ وری یو آر وِد می۔۔۔ اوہ بیش! تم تو سچ مچ کے بادشاہ ہو۔۔۔ ٹینا یک دم اپنی بیعزتی بھول کے خوشی اور چاپلوسی سے بولی تو وہ بھی خوشی سے آگے بڑھ گیا کہ آج تو اس نے ٹیٹو بنوا کر اپنی ایک پرانی خواہش کو پورا کیا تھا اور ٹیٹو بھی وہ جو نہایت خوفناک اور مشکل ترین تھا وہ بھی ایک سپینش آرٹسٹ کے ہاتھوں بنا ہوا گوتھک آرٹ کا نمونہ۔۔۔

او کے صوفیہ مے آئے گو نا؟ ایک جانب بیٹھے آرٹسٹ نے صوفیہ سے جانے کی اجازت طلب کی تو صوفیہ نے جواب دیا شیور! سی یو۔۔۔ اس کے باہر جاتے ہی لوئس اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا، تم نے کہا تھا جس دن میں پہلی بار یہ ڈیزائن کسی انسان پہ کنندہ کروں گا تم اس دن مجھے بتا گی کہ ہمارے اس خاص اوکلٹ کو کامیاب بنانے کے لیے اس میں موجود ہر نشان کس طرح کام کرے گا؟ لوئس اس ڈیزائن کو بورڈ پہ پن کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ تم جانتے ہو لوئس میری پوری زندگی دنیا گھومتے اور وہاں کے جادو سیکھتے اور انہیں اپنے آرٹ کے ساتھ جوڑتے گزری ہے۔۔۔ جادوگر جو کام اپنے عملیات سے کرتے آئے ہیں، میں وہ کام اپنے آرٹ کے ذریعے کرتی ہوں۔۔۔ آج کی رات میرے اور تمہارے لیے ایک خاص اہمیت کی حامل ہے جس سے اس ملک کے اکثر لوگ ناواقف ہیں اور اسے محض ایک تفریح کی طرح لیتے ہیں۔ کچھ پارٹیز کرتے ہیں اور اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ لیکن ہم کیلٹک لوگوں کا تو ایمان ہے کہ انتیس اکتوبر کی رات اس دنیا اور دوسری دنیا کے درمیان حائل پردہ اپنی کمزور اور ہلکی ترین حالت میں ہوتا ہے اور اسی لیے روحیں بدروحیں سب زمین کا رخ کرتی ہیں اور انہیں کو اپنے گھروں سے دور رکھنے کے لیے ہم آگ کے بڑے بڑے الاؤ روشن کرتے آ رہے ہیں۔ آج بھی ہم اپنے گھروں کو آسیب زدہ عمارتوں کی طرح سجاتے ہیں اور انہی بدروحوں کا بھیس بدل کر باہر نکلتے ہیں تاکہ وہ ہمیں اور ہمارے گھروں کو دیکھ کر ڈر جائیں اور دور بھاگ جائیں۔۔۔ لیکن مجھے ہمیشہ سے ذاتی طور پر بدروحوں کو دور بھگانے کے ان زیادہ تر طریقوں سے اختلاف رہا ہے کہ بدروحیں کسی عمارت کے آسیب زدہ نظر آنے پر اور ہمیں خوفناک بگڑی ہوئی شکلوں اور لباس میں دیکھ کر ہم سے دور ہوں گی یا ہمیں اپنے جیسا دیکھ کہ مزید قریب آئیں

اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ

پریشانیوں سے چھٹکارہ
ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے

آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہو جایا کرتی ہیں

ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو گئی ہو اور ہر عامل ناکام ہو گیا ہو ہم سے مشورہ ایک مرتبہ ضرور لیں عامل وہ جس کا علم سات سمندر پار چلے کالے و سفلی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہو گا اولاد فرمان بردار خاوند سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید تنویر شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی

شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو | جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو
شوہر یا بیوی کی اصلاح | اولاد کا نہ ہونا یا ہو کر مر جانا
گھریلو ناچاقی | کاروباری بندش
جنات کا سایہ | دیگر مسائل

سید تنویر شاہ

کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں
وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کام علم جو بگڑے کام بنائے

سسرال میں بہو سب کی آنکھ کا تارا بن سکتی ہے ہر کام رازداری کے ساتھ کلام الٰہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تعویز سے آپکی اجڑی ہوئی زندگی میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر

خواهش زندگی کی کوئی خواہش ہے یا کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہو گی انشاء اللہ

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملایئے اور آزمالیجئے
ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے
نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہو گی

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو وہ آنکھیں ہی کیا جن میں شرم نہ ہو وہ علم ہی کیا جس میں عمل نہ ہو وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو

فوارہ چوک مین جی ٹی روڈ ملتان

سید تنویر شاہ

0301-6411113

گی؟ کیا یہ سب طریقے تو ان کے لیے مزید پرکشش نہیں؟ صوفیہ نے اپنا نظریہ پیش کیا۔۔۔

ہاں! تمہاری بات سمجھ میں تو آتی ہے صوفی! لیکن ہمارے اس اوکلٹ گروپ جس کی بنیاد تم نے رکھی تھی اس کا مقصد ان چیزوں کو دور بھگانا تو نہیں بلکہ انہیں استعمال کرنا تھا اپنے تجربوں کے لیے۔۔۔ لوئس بولا۔

لوئس! انسان کو نہ جانے یہ غلط فہمی کیوں ہے کہ وہ شیطانی ہستیوں کو جیسے چاہے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرسکتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے خود ان کے شر سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! اصل میں انسان شیطان کو نہیں، شیطان انسان کو استعمال کرتا ہے اور شیطان سے چال چلنا اتنا آسان نہیں۔۔۔ تو میں نے اپنے سالوں کی محنت سے جادوئی دنیا میں ایک ایسا طریقہ متعارف کروایا ہے جس کے ذریعے جادو تو ہوگا لیکن اسے ہم انجام نہیں دیں گے بلکہ ہمارے بنائے ہوئے ڈیزائنز ہمارے مقصد کو پورا کریں گے۔ تم اس سے پہلے کئی بار دیکھ چکے ہو کہ ہم نے لوگوں سے اپنے چھوٹے موٹے کام نکلوانے یا ان کے کام کروانے کے لیے صرف اپنے ٹیٹوز کا سہارا لیا اور بس باقی کام ان انسانوں کے جسم پہ کندہ ان علامات کا تھا جو یہ بیوقوف۔ لوگ فیشن کے نام پہ ہم سے بنواتے تھے۔۔۔ جبکہ یہ صرف تم جانتے ہو کہ میرا ہر ایک ڈیزائن کیا ہوا ٹیٹو کسی نہ کسی خاص جادوئی مقصد کے لیے ہوتا ہے لیکن آج جو میرا یہ ڈیزائن تم نے پہلی بار ایک انسان پر بنایا ہے، اس میں میری برسوں کی محنت اور علم شامل ہے، صوفیہ نے بتایا۔

لیکن اتنے عرصے میں تمہیں آج ہی کی رات یہ ٹیٹو اس ہی اجنبی انسان پہ استعمال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ لوئس نے سوال کیا۔ کیونکہ میں اس کا ماضی اور حال دیکھ چکی تھی۔ یہ ٹیٹو خاص طور پہ بنا ہی ایسے کسی انسان کے لیے ہے اور یہ شخص اس عمل کے لئے بہت موزوں تھا۔ بادشاہ ایک نہایت مغرور، بے حس اور ظالم انسان ہے۔ ہمارے اس خاص اوکلٹ کو انجام دینے کے لیے آج کی اس مخصوص رات میں ہمیں اس سے بہتر کوئی اور شخص نہیں مل سکتا تھا۔ ٹینا نے بادشاہ کو چننے کی وجہ بتائی۔ چلو پھر یہ بھی بتادو کہ ہمارا یہ ٹیٹو کیسے اپنا اثر دکھا سکتا ہے؟ لوئس نے پوچھا۔ چلو وہ بھی بتائے دیتی ہوں، اور پھر صوفیہ نے ٹیٹو میں استعمال کی گئی سبھی جادوئی علامات سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔۔۔

میرے اس پورے ڈیزائن میں میں نے نو الگ الگ علامتیں استعمال کی ہیں۔۔۔ سب سے پہلی علامت جیسا کہ تم جانتے ہو اسے کہتے ہیں ڈے آف ڈیڈ۔۔۔ جس میں انسانی کھوپڑی جسے ساتھ امریکہ میں سالانہ رسم کے طور پہ مرنے والوں کی یاد میں گھروں میں رکھا جاتا ہے اور میکسیکو میں تو اسے موت کی مستقل یادگار کے طور اپنے جسم پہ بنوایا جاتا ہے۔ اس کا اثر باقی علامتوں کے ساتھ ٹیٹو بنوانے والے پر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی موت کو خود بلاتا ہے اور بادشاہ اپنی موت کو یکسر بھلائے بیٹھا ہے جبکہ اس کی موت کا مقررہ دن آن پہنچا ہے اور وہ اپنے انجام کے بہت قریب ہے۔ دوسری میکسیکن علامت جسے ہم ٹیٹو آرٹسٹ شوگر سکل کے نام سے جانتے ہیں۔ اس میں ہم کھوپڑی اور ڈھانچے کی آرائش مختلف رنگوں کی سجاوٹ سے کرتے ہیں لیکن جن رنگوں کا انتخاب میں نے اپنے اس ڈیزائن میں کیا ہے وہ پہلی علامت ڈے آف ڈیڈ میں استعمال کیے جانے والے رنگوں سے لیے گئے ہیں جن کی تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاں گی۔۔۔ اس علامت کا مطلب ہوتا ہے اپنی موت اور انجام کی قبولیت اور اسے بنوانے والا انسان انجانے میں اپنی موت کے دستخط نامے پہ بخوشی خود دستخط کر دیتا ہے جیسا کے بادشاہ نے کیا۔ اس نے پہلے خود سے اس ڈیزائن کو چنا اور پھر بہت شوق سے اسے بنوانے کے لیے تیار ہو گیا یعنی اپنے انجام کی طرف خود سے بڑھا۔ تیسری علامت ہے کوا، جسے بہت سے یورپین کلچر میں بدنصیبی کی علامت سمجھا جاتا ہے جیسے کہ کوئی بری خبر یا کوئی بیماری وغیرہ لیکن اس علامت کا مطلب ان کوں کی تعداد پر منحصر ہے کہ یہ کیا کام انجام دیتے ہیں؟ اور اس ڈیزائن میں میں نے چھ کوں کا

استعمال کیا ہے اور چھ کوے موت کی علامت ہیں۔ اسی لیے اس ڈیزائن میں کہیں الگ الگ جگہوں پہ چھ کوے بنانے پڑے۔۔۔۔ صوفیہ کے کہنے پہ لوئس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، ہاں کوے تو کافی جگہ بنائے لیکن کتنے تھے یہ نہیں گنے۔۔۔ تو اب گن لو، صوفیہ نے بورڈ پہ لگے اس مشکل ترین ٹیسٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔ تو لوئس ڈھونڈ ڈھونڈ کے کوے گننے لگا۔۔۔ دو کندھوں پہ، دو اس کے شاہ لباس کے نیچے زمین کی طرف، دو سر کے اوپر آسمان میں، ہاں! چھ ہیں، اس نے صحیح جواب دیتے ہوئے خوشی سے صوفیہ کو دیکھا۔ تو صوفیہ نے بتایا یہاں کندھوں پہ بھی اس کی موت بیٹھی ہے، نیچے بھی اور اس کے اوپر آسمان پہ بھی موت ہی منڈلا رہی ہے جس کا مطلب ہے وہ کہیں بھی ہو موت اس کے چاروں طرف محوِ پرواز ہے۔۔۔

چوتھی علامت ہے کراکین یعنی ایک دیو قامت آکٹوپس جو ناروے کی قدیم داستانوں میں کافی اہمیت کا حامل تھا جو وہاں کے کشتی رانوں، مچھیروں اور سمندری ڈاکوں میں بہت مشہور تھیں اور ان داستانوں کے مطابق سمندر کی دور دراز گہرائیوں میں بڑے بڑے بحری جہازوں کو یہ سمندری مخلوق ڈبو کر اس پہ سوار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی تھی۔ اس ڈیزائن میں، اس علامت کو میں نے کھوپڑی کے سر پہ ایک ٹوپی کی طرح بٹھا دیا ہے جس کی آٹھ ٹانگیں بالوں کی موٹی لٹوں کی طرح ارد گرد پھیلی ہوئی ہیں۔۔۔ یعنی موت اس کے سر پہ آن بیٹھی ہے۔

پانچویں علامت ہے چمگادڑ جسے مغربی دنیا میں پرسراریت، جادو اور تمام تر منفی روابط کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہاں میں نے ایک اور علامت فالن اینجل یعنی وہ جن جسے فرشتوں کا درجہ دے کر جنت میں رکھا گیا تھا اور اپنی نافرمانی کی وجہ سے اسے جنت سے نکال دیا گیا جسے آج ہم شیطان کہتے ہیں، اسے چمگادڑ کے پروں سے ظاہر کیا ہے کیونکہ وہ کوئی جنت سے نکالا گیا فرشتہ نہیں بلکہ ایک جن تھا اور نافرمانی کی وجہ سے شیطان کہلایا۔۔۔ اب یہاں میں نے چمگادڑ کے پروں کو اس ڈھانچے کے پیچھے فرشتوں کے پروں جتنا وسیع بنایا ہے تاکہ چمگادڑ اور شیطان دونوں کی نمائندگی ہو سکے۔

چھٹی علامت ہے کیلٹک پینٹا گرام یعنی دائرے کے اندر بنا ہوا پانچ کونوں والا الٹا ستارہ جس کا درمیانی کونا اوپر کی طرف نہیں مگر نیچے کی طرف ہوتا ہے۔ ستارے کا ہر ایک کونا پانچ عناصر زمین، پانی، ہوا، روح اور آگ کو ظاہر کرتا ہے اور اسے الٹا بنانے کا مقصد جادوئی دنیا میں شیطانی عمل کو ظاہر کرنا ہے کیونکہ جادو کا ہر کام قدرت کے الٹ ہوتا ہے۔ اس ڈیزائن میں دائرے کے اندر کا پینٹا گرام میں نے اس کھوپڑی کے شاہی لباس پہ دل کی جگہ بنایا ہے یعنی اس کو بنوانے والا سیدھے راستے پہ نہیں بلکہ الٹے راستے پہ چلنے والا انسان ہے۔

ساتویں علامت ہے روک اینڈ رول جس میں ہم یا تو ہاتھ کی انگلیوں کو مختلف تعداد میں بند اور کھولنے کے امتزاج سے کچھ مخصوص علامتیں بنا سکتے ہیں یا پھر اونچی شور کی آواز والے ساز کو بنا سکتے ہیں۔ خاص طور پہ پرانے زمانے کے شیطان کو پوجنے والے روک میوزیشنز کے گٹار، کیونکہ روک اینڈ ہیوی میٹل کی بیشتر شور شرابے والی بے ہنگم موسیقی جو انسانی دنیا میں اضطراب اور بیسکونی پیدا کرتی ہے، وہ شیطان کی نمائندگی بھی کرتی ہے، اسی لیے میں نے اس ڈھانچے کے ہاتھ میں یہ گٹار پکڑایا ہے۔ اس ڈیزائن میں اس علامت کو استعمال کرنے کا مقصد ہے کہ اس شخص کا کوئی نہ کوئی براہ راست یا بلواسطہ تعلق موسیقی سے رہ چکا ہے اور اسی تعلق سے اس کی موت بھی وابستہ ہے۔

آٹھویں ہے قدیم یونانی جادوئی علامت اوروبورس۔۔۔ جو قدیم مصری مجسمہ نگاری میں بھی استعمال ہوتی رہی ہے اور وبورس یعنی ایک ایسا سانپ جو اپنی دم خود کھا رہا ہے۔ یہ زندگی کے پہیے کی نمائندگی کرتا ہے۔ یعنی ہم جو کرتے ہیں وہ ہمارے پاس لوٹ کر آتا ہے اور تبھی زندگی کا چکر مکمل ہوتا ہے اور یہاں اس کے شاہی لباس پہ اس علامت کو استعمال کرنے کا مطلب ہے کہ اگر اس شخص کا تعلق کسی کی موت سے ہے

تو اس کی موت بھی اسی تعلق سے لازمی ہے۔

پھر آتی ہی نویں علامت یگدراسل، ایک ایسا بڑا درخت جو نو دنیاں سے جڑا ہوا ہے اور جس کا تعلق کائنات کی ہر چیز سے ہے۔ یگدراسل راکھ کی طرح دکھنے والا درخت ہے جس پہ کوئی پتہ، کوئی پھل کوئی پھول نہیں، محض شاخیں ہیں۔۔۔اس درخت کا تعلق تصوف کی طاقتور اور ذہین دنیا سے ہے اور یہاں میں نے اسے ٹیٹو میں ڈھانچے کے بیک گرانڈ میں اس طرح سے بنایا ہے کہ اس کے شاہی لباس کی آستینوں اور ٹانگوں تک سے اس کے شاخیں اور یں نکلتی ہوئی دکھائ ے رہی ہیں۔۔۔اس کو اس ڈیز ں میں استعمال کرنے کا مطلب ہے کہ اسے بنوانے والا انسان خود و اس زمین پہ جتنا بھی طاقتور سمجھ لے لیکن اس کا اختیار صرف اسی دنیا میں چلتا ہے، جبکہ تصوف کی وسیع دنیا اسے کسی بھی انجانے، انچاہے، ان دیکھے، نئے اور انوکھے تجربے سے روبرو کروا سکتی ہے اور پھر چاہے وہ تجربہ موت کا ہی کیوں نہ ہو۔۔۔صوفیہ نے ساری تفصیل بیان کی تو لوئس نے انگلش کے گیارہویں ایلفابیٹ کے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا اور یہ سب تاش کے کنگ کے گرد ہی کیوں؟

کے فار کنگ! چونکہ تاش کے پتوں میں کنگ ایک بڑا پتہ ہے تو اس کو بنانے والا اپنے غرور اور تکبر کے زعم میں اسے ہی چنتا ہے لیکن اس سے بھی بڑا پتہ ہے حکم کا اکا۔۔۔اور اصل کھیل تو اب شروع ہوتا ہے، صوفیہ نے جواب دیا تو لوئس پریشان سا ہو گیا۔۔۔ کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ میں نے اپنے اس جادو کی بنیاد تاش کے ایک کھیل پوکر جسے اردو زبان میں تین پتی کہا جاتا ہے، پر رکھی ہے جس میں دونوں طرف تاش کے تین پتے ہوتے ہیں۔ ایک طرف یعنی بادشاہ کے تین پتے ہم دیکھ چکے ہیں جسے میں نے اس ٹیٹو میں انگلش حرف کے یعنی کے فار کنگ سے ظاہر کیا ہے۔ دیکھو! اس ٹیٹو میں تین جگہ کے لکھا ہے یعنی یہ شخص خود کو تین بادشاہوں کے برابر سمجھتا ہے جس کے پاس، دولت کی شکل میں رانی بھی ہے اور چاپلوس دوستوں کی شکل میں غلام بھی۔۔۔ یہ خود کو اپنے آپ میں مکمل گردانتا ہے۔ لیکن مات تو یہ تب کھائے گا جب میرے ٹیٹو کے اثر سے حکم کے تین اکے سامنے آئیں گے۔۔۔اور وہ بھی آج ہی کی رات۔۔۔صوفیہ نے لوئس کو سمجھایا۔

اور تمہیں یقین ہے کہ وہ آئیں گے؟ لوئس نے پوچھا۔۔۔میں نے اپنے اس ٹیٹو کو خاص طور پر تاش کی تین پتی کے اصولوں کے مطابق ہی ڈیزائن کیا ہے اور موت کو نو الگ الگ مختلف طریقوں سے جس جس طرح دعوتیں دی ہیں۔ اس کے مطابق دوسری طرف کے تین پتے بھی آج رات میرے پاس ضرور آئیں گے اس جادوئی کھیل کو کھیلنے کے لیے۔۔۔اور تب اس ٹیٹو سے جڑے تین اور ٹیٹو ہمیں ان کے جسم پہ بھی بنانے ہوں گے یعنی یہ کھیل کھیلنے موت خود چل کر ہمارے پاس آئے گی۔۔۔ اور پھر ہمارا کام ختم اور بادشاہ اور اس کے مخالفین کا کام شروع اور تین پتی کے اس کھیل میں میری ممکن ترین کوشش یہی ہو گی کہ بادشاہ کو مات ہو۔۔۔ اس نے ہاری قوم کو کم علم جانا، ہم خانہ بدوشوں کے کام کی بیعزتی کی، ہمیں حقیر سمجھا اور ہمیں دھوکے باز اور فراڈ آرٹسٹ کہا یعنی ہمارے آرٹسٹ ہونے کو سرے سے ہی جھٹلا دیا۔۔۔تو چلو اب اسے بتاتے ہیں کہ ہم کس حد تک اس جیسوں کے لیے دھوکے باز ہو سکتے ہیں؟ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو ہمیں جیسا سمجھتا ہے، ہم اس کے ساتھ ویسے ہی پیش آتے ہیں۔۔۔ اب بتاتے ہیں اسے کہ ہم کتنے بڑے آرٹسٹ ہیں؟ موت کی تصویر بنا کر اس میں جادو کا رنگ بھرتے ہیں۔ اور کھیل کھیل میں اپنے اوکلٹ گروپ کو پوری دنیا میں پھیلاتے جاتے ہیں۔۔۔صوفیہ اپنے دریافت کیے اس جادوئی کھیل کا پردہ فاش کرتی رہی اور اس کی آنکھوں چمک بھی بڑھتی گئی اور اب وہ دونوں آنے والوں کے انتظار میں تھے۔۔۔

کیا یہ واقعی کام کرے گا؟ لوئس نے یقین دہانی چاہی؟ ہاں لوئس! کیونکہ اس ڈیزائن میں وہ ہر ایک ڈیتھ سمبل شامل ہے جو تمہارے اپنے خود کے قبیلے میں کسی کو سزا کے طور پہ کندہ کیا جاتا ہے تاکہ جتنی جلدی

موت اس کے پاس آئے اسے بچنے کا کوئی موقع نہ ملے اور پھر یہاں تو ایک نہیں میں نے نو ڈیتھ سمبلز کو ایک ساتھ ایک خاص ترتیب سے جوڑا ہے۔۔۔ صوفیہ کو جواب دیتے ہوئے ٹینٹ کے اندرونی حصے کی بات یاد آئی تو وہ بولی، اور جانتے ہو میں نے اس کے فیوچر میں کیا دیکھا؟ وہاں کچھ نہیں تھا سوائے کالے گہرے اندھیرے کے۔۔۔ ایک بالکل کالا گہرا اندھیرا۔۔۔ موت جیسا! تم نے اسے بتایا؟ لوئس نے سوال کیا تو صوفیہ نے کہا، نہیں! کیونکہ وہ جاننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ جب انسان حد سے زیادہ اپنی زیادتیوں سے لاپرواہ اور ہر کسی کے لیے ناقابل برداشت ہوجائے ہوجائے تو اسے بس ایک ہی چیز برداشت کرسکتی ہے۔۔۔ اور وہ ہے موت!

شہر سے باہر پرائیویٹ فارم ہاس کی ہیلوئن پارٹی میں شامل کسی بھی شخص کو ہیلوئن نائٹ کے نظریے پہ یقین تھا نہ ہی ان کے مذہبی، تہذیبی یا ثقافتی ورثہ سے ہیلوئن سیلیبریشن کا کوئی لینا دینا تھا۔ یہ سب تو وہ بگڑے رئیس تھے جن کا ویسے بھی اپنی مذہبی اور ثقافتی روایات سے کوئی لینا دینا نہیں تھا، جو کسی بھی خرافات پہ پیسے اور وقت لٹانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے اور خاص طور پہ ایسی پرائیویٹ پارٹی جہاں پہ کسی بھی مغربی تھیم کو اپنا کر دعوت اڑانے کے بہانے ہر طرح کے غلط کام ہوتے ہوں، بادشاہ کے لیے ان میں شمولیت عام بات تھی۔۔۔ دیگر پرائیویٹ پارٹیز کی طرح یہاں بھی ناچ گانا اور فحاشی سے لے کر ہر طرح کا نشے اس پارٹی کی زینت تھا۔ کچھ لوگ ان ڈور تو کچھ لان اور کچھ سوئمنگ پول کے پاس ناچ گانے، نشے اور فحاشی میں مشغول تھے۔ بادشاہ اور ٹینا جو کے آئے تو ساتھ تھے لیکن اس وقت دو الگ الگ ساتھیوں کے ہمراہ گناہوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لوگوں نے مختلف خوفناک بلاؤں کے حلیے اپنا رکھے تھے۔۔۔ کوئی ویمپائر کے لباس میں تھا، کوئی کسی چڑیل کے روپ میں، کوئی جادوگرنی، کوئی بدروح، تو کوئی مردہ بن کر پھر رہا تھا اور کچھ بنا کسی مخصوص لباس کے صرف خوفناک میک اپ سے اصلی چہرہ ڈھانپے ہوئے تھے۔ ٹینا نے تو پارٹی کی تھیم کا حصہ بننے کے لیے پھر بھی وہاں کسی لڑکی سے اپنے چہرے پہ خوفناک نقش ونگار بنوالیے تھے لیکن بادشاہ کے پاس پارٹی تھیم کو لے کے کچھ نہیں تھا سوائے اس کے تازہ ترین گوتھک ٹیٹو کے۔۔۔ ٹینا فارم ہاس کے لانج میں جبکہ بادشاہ لان میں اپنے اپنے ساتھی کے ہمراہ مگن تھے جب موسم نے اپنا رنگ بدلنا شروع کردیا۔۔۔ اور جاڑوں کی پہلی ٹھنڈی ہوا نے نومبر شروع ہونے کی خبر دی۔۔۔

ویلکم ٹو دا جپسی ورلڈ کا بینر بھی ہوا کے زور سے لہرانا شروع ہوا ہی تھا کہ خیمے میں موجود صوفیہ کو باہر کے بدلتے موسم کا احساس ہوا تو اس کی نظریں خود بخود خیمے کے داخلی راستے کی طرف اٹھ گئیں جہاں وہ اپنے رنگین و ریشمی شلوار قمیض، اجڑے بالوں میں پراندہ اور آنکھوں میں بکھرا سرما لیے ہونق سی کھڑی تھی۔۔۔ آ! صوفیہ نے اسے بغور دیکھا۔۔۔ وہ صوفیہ کے کہنے پہ مزید اندر چلی آئی۔۔۔ اور خیمے کی پراسرار سی سجاوٹ دیکھنے لگی اور پھر اس کی نظر بورڈ پہ لگے ٹیٹوز اور لوگوں کے جسموں پہ بنے ڈیزائنوں کی تصاویر پہ رک گئی۔۔۔ بنوا گی؟ صوفیہ نے اس کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔۔۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ پسند نہیں آئے؟ صوفیہ نے پوچھا۔ نہیں! یہ تو بہت خوبصورت ہیں لیکن مہنگے بھی ہوں گے۔۔۔ اس نے بورڈ پہ لگے مشکل اور بڑے ٹیٹوز کے ڈیزائنز کو دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔۔۔ وہ کچھ مائل ہوتی نظر آئی۔۔۔ اس مسئلے کا ایک حل ہے اور صوفیہ اسے دوسرے بورڈ کے پاس لے آئی جہاں تاش کے پتوں پہ بنی علامات پر مبنی مختصر مگر خوبصورت ٹیٹوز کے ڈیزائنز موجود تھے۔ یہ بالکل مفت ہیں خاص طور پر آج کی رات کے لیے۔۔۔ صوفیہ نے چمکتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ تو اس نے ایک ڈیزائن پہ انگلی رکھ دی اور صوفیہ نے جواب میں مسکرا کر اسے دیکھا اور اس کا دایاں ہاتھ آگے کرتے ہوئے اسے لوئس کے سامنے بٹھا دیا اور خود پردے کے پیچھے چلی گئی۔۔۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ لوئس خوف سے کانپتا ہوا صوفیہ کے پاس آیا آور سپینش میں بولا۔۔۔ کچھ گڑبڑ ہے اس لڑکی کے ساتھ۔۔۔ اس کے ہاتھ پہ مشین ایسے نہیں چل رہی جیسے گوشت پوست اور ہڈیوں سے بنے عام انسانوں کے ہاتھوں پہ چلتی ہے۔۔۔ بلکہ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ وہ مشین ہوا میں پھر رہی ہے یا پانی میں۔۔۔ اور ڈیزائن عام وقت سے بھی کم وقت میں با آسانی بن رہا ہے۔۔۔ میں نے کسی طرح آٹ لائن تو بنا دی ہے لیکن میں اس کے ہاتھ پہ مزید ڈیزائن نہیں بنا سکتا۔۔۔ باقی کا کام تم کرو۔۔۔

بس؟ اتنی سی بات؟ تم اتنا ڈر و گے تو میرے نایاب اوکلٹ گروپ کا حصہ کیسے بنو گے لوئس؟ آج تو میری اس نئی دریافت کا پہلا تجربہ ہے۔۔۔ اور تم ابھی سے گھبرا گئے؟ ابھی تو شروعات ہے۔۔۔ حوصلہ کرو! تمہی میرے ساتھ آگے بہت کام کرنا ہے۔۔۔ فی الحال اسے میں دیکھ لیتی ہوں، صوفیہ باہر چلی گئی اور لوئس وہیں بیٹھ گیا۔۔۔ خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے تھے۔

تمہارا نام کیا ہے؟ صوفیہ نے اس کے پانی اور ہوا کے امتزاج سے بنی ہوئی جلد پہ ٹیٹو مشین چلاتے ہوئے پوچھا۔۔۔ نازو! ابا نے نزیراں بی بی رکھا تھا مگر مجھے یہ نام پسند نہیں تھا تو میں نے شہر آ کے نزیراں سے نازو کر لیا۔۔۔ دیہات میں تو نہیں لیکن شہر میں سب چڑاتے تھے مجھے۔۔۔ وہ کھوئے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔ وہ کچھ دیر رکی اور پھر اچانک بولی۔۔۔ اس کے پرفیوم کی خوشبو ابھی تک یہاں پھیلی ہوئی ہے۔ تم کس کی بات کر رہی ہو، صوفیہ چونکی۔۔۔ وہی جو شاید مجھ سے پہلے یہاں آیا تھا۔۔۔ صوفیہ نازو کے جواب کو بظاہر نظر انداز کر کے کام میں مصروف ہو گئی لیکن اس کے کان اسی کی باتوں پر لگے تھے۔ وہ پھر سے کہنے لگی آج سے چھ مہینے پہلے جب پہلی بار اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہی پرفیوم لگاتا ہے تو میں نے جیسے تیسے کر کے ایک ایک پیسہ جوڑ کے وہی پرفیوم خریدا تھا اور روز رات یہی لگا کے سوتی تھی۔۔۔ وہ بھولے پن سے بتا رہی تھی۔۔۔ تم جینئس پرفیوم لگاتی ہو؟ صوفیہ نے سوال کیا۔ محبت میں تو انسان دوسرے کے سبھی اطوار اپنا لیتا ہے یہ تو بس ایک خوشبو تھی۔۔۔ میں اس سے زندگی میں بس ایک بار ملی ہوں اس شام بھی اس نے یہی پرفیوم لگا رکھا تھا۔۔۔ وہ اس شام کے تصور سے کچھ دکھی نظر آنے لگی۔۔۔ یہ خوشبو میں پہچانتی ہوں۔۔۔ اس نے بات مکمل کی تو صوفیہ بولی، یہ تو محض ایک پرفیوم ہے، کتنے ہی لوگ لگاتے ہوں گے یہاں۔۔۔ نہیں! وہ ان معاملوں میں سب سے الگ ہے وہ کوئی عام اور سستی چیز استعمال نہیں کرتا۔۔۔ یہ پرفیوم بھی یہاں ملنا بہت مشکل ہے میں نے بھی بہت مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔۔۔ اور پھر اس پرفیوم کی خوشبو کے ساتھ اس کے کردار کی ناگوار بو بھی تو شامل ہے جو میں پہچانتی ہوں۔۔۔ اور شاید وہی مجھے اس کے پیچھے یہاں تک لے آئی ہے۔۔۔

ہو گیا! صوفیہ نے اپنا کام مکمل کر کے نازو کو دکھایا تو نازو اپنے ہاتھ پہ بنے خوبصورت سے ڈیزائن کو دیکھ کر کچھ مسکرائی اور پھر کچھ یاد آتے ہی پھر سے افسردہ ہو گئی۔۔۔ مجھے جانا ہے، وہ جلدی سے جانے کے لیے اٹھی۔۔۔ سنو! اردو کا ایک محاورا ہے، دور کے ڈھول سہانے۔۔۔ سننے میں اچھا ہے سمجھ میں آ جائے تو اور بھی اچھا ہے۔۔۔ صوفیہ نے نازو کو پلٹنے پہ مجبور کر دیا۔۔۔ نازو یہ محاورہ اور سکول میں پڑھ چکی تھی اس کا مطلب بھی جانتی تھی لیکن صوفیہ نے اس محاورہ کو جس نصیحت کا لبادہ اوڑھے اس کی طرف اچھالا تھا وہ بہت گہری تھی۔ اس نے صوفیہ کی طرف ایک پل کو خاموش نظروں سے دیکھا اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔۔۔ اور صوفیہ وہیں کھڑی داخلی راستے کا ہلتا پردہ دیکھتی رہی۔۔۔

نازو جیپسی ورلڈ کے خیمے سے نکل کے رونق کی طرف جانے کی بجائے دوسری جانب جانے لگی جہاں نہ تو لوگ تھے اور نہ ہی روشنی۔۔۔ اس کے ایک طرف گم ہوتے ہی وہ اندھیروں سے نکل آیا۔۔۔ نڈھال اور مایوس، دراز قد اور مضبوط جسم کے باوجود اس کی چال میں نزاکت اور کمزوری تھی جیسے وہ بہت بیمار ہو۔۔۔ ہوا

مزید تیز ہوگئی تھی اور اس کے کندھوں تک بکھرے بال ہوا کے زور سے اڑنے لگے تھے۔ اس سے قدم اٹھانے بھی مشکل ہو رہے تھے اور پھر وہ وہیں گر پڑا۔۔۔ نظریں اٹھائیں تو مدھم سے روشنی میں ڈوبا ہوا ایک خیمہ نظر آیا۔۔۔ جہاں سے کسی انجانی زبان میں عجیب سی موسیقی کی آواز آرہی تھی۔۔ وہ وہیں اوندھے مونہہ پڑا اس موسیقی کو سنتا رہا۔۔۔ موسیقی سے اس کا برسوں پرانا ناطہ تھا جسے وہ اپنے لیے شرمناک گردانتا تھا اسی لیے سب چھوڑ چھاڑ کے یہاں آیا تھا۔۔۔ گھنگھرو باندھ کر شادیوں پہ ناچنا ہو یا کسی مزار پہ دھمال ڈالنی ہو۔۔۔ بھاری شور والی موسیقی یا واہیات گانے کے بولوں پہ ناچتے ہوئے اس کا سر چکراتا تھا۔۔۔ لیکن یہ کون سی زبان اور کون سے ساز تھے؟ کیسی موسیقی تھی جس کے بول تو اس کی سمجھ سے بالاتر تھے لیکن وائلن اور پیانو کے پر اسرار سے سر اسے کسی اور ہی دنیا میں کھینچے لیے جا رہے تھے۔۔۔ اور تبھی لوئس سیگرٹ پیتے باہر نکلا اور اپنے سامنے اس عجیب و غریب حلیے کے انسان کو زمین پہ گرا دیکھ اس پہ جھک گیا۔۔۔

آر یو آل رائٹ؟ اس نے سپینش لہجے میں انگلش بولی۔۔۔ لیکن زمین پہ پڑا انسان نہ تو اس کے سپینش لہجے سے واقف تھا اور نہ ہی انگریزی زبان کا مطلب سمجھ سکا تھا۔ سمجھ بھی جاتا تو جواب دینے کی سکت اس میں نہیں تھی۔ صوفیہ! صوفیہ! لوئس کے آوازیں دینے پر صوفیہ تیزی سے باہر آئی اور زمین پہ گرے ہوئے شخص کو اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔۔۔ جیسے ایک بجلی کا ہلکا سا جھٹکا لگا اور وہ ایک لمحے کے لیے چونک گئی لیکن فوری طور پہ اپنے تاثرات پہ قابو پاتے ہوئے اسے لوئس کی مدد سے خیمے میں لے آئی، لوئس نے وہ محسوس نہیں کیا جو صوفیہ نے کیا تھا۔۔۔ صوفیہ نے پانی منگوایا اور اسے پینے کے لیے دیا۔۔۔ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟ صوفیہ نے پوچھا۔۔۔ بخار ہے کچھ روز سے۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ لیکن تم تو برف کی طرح ٹھنڈے پڑے ہوئے ہو؟ صوفیہ! مجھے لگ رہا ہے یہ جھوٹ بول رہا ہے اور کوئی جاسوس یا چور ٹائپ شخص ہے، لوئس نے سپینش میں صوفیہ سے کہا۔۔۔ نہیں لوئس! یہ جھوٹ نہیں بول رہا۔۔۔ بس ابھی اسے سچ کا علم نہیں ہے۔۔۔ صوفیہ نے اس خواجہ سرا کو گہری نظروں سے جانچتے ہوئے لوئس کو سپینش میں ہی جواب دیا۔۔۔ ایک منٹ! وہ اتنا کہتے ہی خیمے کے اندرونی حصے میں گئی اور دو تین رنگ برنگے پانیوں کو ملا کر ایک چھوٹے سے گلاس میں ڈال کر باہر لے آئی۔۔۔ اسے پی لو! بہتر محسوس کرو گے۔۔۔ صوفیہ کے کہنے پہ اس نے اس ہمدرد عورت کی طرف حیرت سے دیکھا اور پھر اس کے ہاتھ سے گلاس لے کے اس میں موجود شربت ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اندر اتار لیا۔۔۔ اب کچھ دیر آنکھیں بند کر کے آرام سے بیٹھ جا۔۔۔ صوفیہ نے اسے کرسی پہ ٹھیک سے بٹھاتے ہوئے لوئس کو اپنے ساتھ خیمے کے اندرونی حصے میں چلنے کا اشارہ کیا۔۔۔

کچھ ہی دیر بعد دونوں پردے کے پیچھے سے نکلے تو لوئس جپسی ورلڈ سے باہر چلا گیا اور صوفیہ اس مایوس سے انسان کے پاس چلی آئی۔۔۔ کچھ اور چاہیئے؟ صوفیہ کی بات پہ راجا کے دل میں پہلے تو آیا کے اس ہمدرد عورت سے کہے کہ اگر اس کے پاس کھانے کو کچھ ہے تو دے دے۔۔۔ لیکن اسے خدا کے سوا کسی سے کچھ مانگنا پسند نہ تھا تبھی تو خواجہ سرا ہ کی زندگی سے بھاگتا آیا تھا۔۔۔ اس نے اپنے چاروں اور نظر دوڑائی اور خیمے میں جلتی موم بتیوں اور مشعلوں کی روشنی میں اسے کچھ بورڈز پہ ٹیٹوز کے پوسٹرز نظر آئے۔۔۔ یہ کون سی جگہ ہے؟ اس نے دھیمے سے پوچھا۔۔ ویلکم ٹو دا جپسی ورلڈ! صوفیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔۔۔ ہم یہاں لوگوں کو ان کے ماضی حال اور مستقبل کے بارے میں وہ بتاتے ہیں جو وہ جاننا چاہتے ہیں۔ اور لوگوں کے جسموں پہ اپنے یہ ڈیزائن بناتے ہیں جہاں بھی وہ بنوانا چاہیں۔۔۔ صوفیہ نے مزید بتایا تو اس نے سوچا کے اسے اپنے ماضی حال یا مستقبل کے متعلق جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔ اس نے اپنی مایوس آنکھیں مزید جھکا لیں اور پھر کچھ سوچتی ہوئے بولا۔۔۔ مجھے یہ کام سکھا دیں۔۔۔ قسمت کا

حال بتانے والا؟ صوفیہ نے پوچھا۔ نہیں! یہ جلد پہ سجاوٹ والا۔۔۔ میرے پاس کوئی کام نہیں ہے۔۔۔ میں بہت جلد سیکھ جاؤں گا، اپنی برادری میں بھی سب کو مہندی میں ہی لگاتا تھا۔ سب مجھ سے ہی ڈیزائنز بنواتے تھے۔ آپ کو مایوس نہیں کروں گا، وہ تقریباً منت پہ اتر آیا تھا۔ ایک مایوس انسان کے مونہہ سے کسی دوسرے کو امید دلانے کی بات پہ صوفیہ مسکرائی۔۔۔ ارے واہ! تم تو پہلے سے آرٹسٹ ہو۔۔۔ اور تبھی لوئس ہاتھ میں ایک پیکٹ پکڑے اندر داخل ہوا اور صوفیہ کو پکڑا دیا۔۔۔ پہلے ہم سب کچھ کھالیں؟ صوفیہ نے پیکٹ سے ایک سینڈوچ نکال کے راجا کے حوالے کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک پڑے۔۔۔

یہ دیکھو اس کہتے ہیں۔۔۔ صوفیہ کھانے کے بعد راجا کو وہاں پڑے سامان کے بارے میں بتانے لگی۔۔۔ ابھی کوئی کسٹمر آتا ہے تو ہم تمہیں پریکٹیکلی بھی بتاتے ہیں، صوفیہ کے کہتے ہی اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا آپ یہاں بنا دیں۔۔۔ تو صوفیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔۔۔ پکا؟ ہاں! اس نے جواب دیا تو صوفیہ نے کچھ ڈیزائنز اسے دکھائے کون سا بنوانا پسند کرو گے؟ کوئی بھی مگر چھوٹا سا۔۔۔ اور پھر اس نے تاش کے پتوں کی علامتوں میں سے ایک علامت کا مختصر سا ڈیزائن چنا۔۔۔ اور اس ڈیزائن کو دیکھ کر صوفیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے سامنے بیٹھے لوئس کو ابرو اٹھا کے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سپینش میں پوچھا۔۔۔ کیوں لوئس؟ تیار ہو؟ لیکن لوئس کے چہرے پہ واضح گھبراہٹ دیکھ کر صوفیہ خود کام شروع کرتے ہوئے سپینش میں بولی، اوہ لوئس! میرے اوکلٹ گروپ میں تمہارے اس خوف کی گنجائش نہیں۔۔۔ چھوٹے موٹے بہت کام کر لیے اب بڑے کاموں کا وقت ہے اور کبھی نہ کبھی تو پہلی بار تمہیں کرنا ہی ہوگا۔۔۔ چلو آج کی تین پتی کا کھیل میں ہی سجائے دیتی ہوں تاکہ تمہارے دل میں کسی قسم کا خوف باقی نہ رہے لیکن اگلے سال کی اسی مخصوص رات یہ کام تم کرو گے۔۔۔ منظور؟ صوفیہ کی بات سمجھتے ہوئے لوئس نے ہاں میں سر ہلایا اور صوفیہ کو بلا کسی جھجھک اور خوف کے اس خواجہ سراہ کا ہاتھ تھامے کام کرتے دیکھنے لگا۔۔۔ راجا کو ان کی زبان کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آیا تھا، اسے ان کی باتوں سے کوئی سروکار تھا بھی نہیں۔ وہ بس اس بات پہ مطمئن تھا کہ اسے کوئی کام سیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔

جب ڈیزائن مکمل ہوا تو صوفیہ بولی، دیکھا! اتنا مشکل نہیں ہے بس ہاتھ کی صفائی چاہیے اور بہت ساری پریکٹس۔۔۔ راجا اس ٹیٹو کو دیکھ کر مسکرایا اور اچانک ہی اٹھ گیا۔۔۔ مجھے جانے ہے۔۔۔ تو لوئس جو ٹھیک سے اردو بول تو نہیں سکتا تھا لیکن صوفیہ کی سنگت میں رہ کر اسے اردو سمجھ ضرور آتی تھی، راجا کے اس طرح اچانک سے جانے کی بات پر چونکا۔۔۔ ٹھیک ہے، اب تم جا! صوفیہ نے جیسے اسے اجازت دی تو وہ بھی مزید بنا کسی سوال و جواب کے فرمانبرداری سے اٹھ کے چل دیا۔۔۔ اس کے نکلتے ہی خیمے کے باہر چلتی ہوا نے مزید زور پکڑ لیا۔۔۔ بس؟ اتنا آسان تھا اسے بھیجنا؟ ابھی ابھی تو تمہارا شاگرد بنا تھا۔۔۔ کل کب کس وقت اور کہاں آنا ہے یہ بھی نہیں پوچھا اس نے؟ یہ تو کام کرنا چاہتا تھا نہ ہمارے ساتھ؟ لوئس نے راجا کے بلا چوں چراں خاموشی سے باہر چلے جانے پہ حیرانی سے پوچھا تو صوفیہ نے مسکرا کر لوئس کی طرف دیکھا اور کہا، یہ ہم سے جو بھی چاہتا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ پہ ٹیٹو بننے سے پہلے کی بات تھی۔ اب ہم یہ تین پتی کا کھیل اس سے جو چاہتا ہے یہ اس کے زیر اثر ہے۔۔۔ صوفیہ نے سنجیدگی سے کہا اور راجا کے باہر جانے والی راستے کی طرف دیکھنے لگی جہاں اب کوئی نہیں تھا۔

بیش! ہمیں اب واپس چلنا چاہیے۔۔۔ دیکھو ایک گھنٹے کی ڈرائیو ہے اور موسم بہت خراب ہو رہا ہے۔ ہمیں راستے میں مزید دیر ہو سکتی ہے سو ہمیں ابھی نکلنا ہو گا۔۔۔ ٹینا فارم ہاس کے لانج کی کھڑکی سے باہر آسمان کے بدلتے رنگ اور تیز ہوتی ہوا کو دیکھ کر سوئمنگ پول کے پاس نشے میں دھت بیٹھے بادشاہ کے

پاس چلی آئی تھی۔ تو جلدی کیا ہے؟ صبح چلے جائیں گے۔۔۔ میرے دوست کی پارٹی ہے، کوئی ہمیں نہیں نکالے گا یہاں سے۔۔۔ بادشاہ نے لاپرواہی سے کہا تو ٹینا پریشانی سے بولی۔۔۔ جلدی ہے بیٹ! میں نے گھر بتایا تھا کہ میں لیٹ ہو جاؤں گی لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ میں آج رات واپس ہی نہیں آؤں گی۔۔۔ اور اب وقت دیکھو! ہم آل ریڈی لیٹ ہو چکے ہیں۔۔۔ پلیز اٹھو۔۔۔ ٹینا نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ بولا، ڈرائیو کروں؟ اس حال میں؟ گھر کی بجائے کہیں اور پہنچ جاؤں گی۔۔۔ وہ ہنسنے لگا۔۔۔ ڈرائیو میں کرتی ہوں۔۔۔ اب چلو اٹھو۔۔۔ اور وہ اسے سہارا دے کر اٹھانے لگی۔۔۔

جپسی ورلڈ کا ہیبتر زور زور سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔۔۔ تیز ہوا نے آندھی کا روپ دھار لیا تھا اور آسمان کے اندھیرے نے لال رنگ کا۔۔۔ ہمیں ہوٹل واپس چلنا چاہیئے صوفی! موسم دیکھو، اب کوئی کسٹمر نہیں آئے گا۔۔۔ لوئس نے صوفیہ سے کہا۔۔۔ مجھے کسٹمر کا انتظار ہے بھی نہیں۔۔۔ اپنے تیسرے اکے کا ہے۔۔۔ اپنی تین پتی ادھوری چھوڑ کے نہیں جا سکتی لوئس! یہ ہمارے اوکلٹ کے بنیادی اصولوں میں سے ہے کہ اگر کوئی کھیل شروع کرو تو اسے پورا کرو۔۔۔ ادھوری بازی سب کے لیے بری ہے اور ویسے بھی اب تو یہ آخری پتہ ہے۔۔۔ صوفیہ کے اتنا کہتے ہی ان کا خیمہ تیز آندھی کے زور سے شاخ کے پتے کی طرح لرزنے لگا۔۔۔ لگتا ہے کوئی آیا ہے! اس نے داخلی راستے کی طرف دیکھا جہاں اسے پائل کی چھم چھم اور چوڑیوں کی چھن چھن تیز آندھی میں بھی محسوس ہو رہی تھی وہ باہر نکلی تو کسی لڑکی کو سر سے پاؤں چاندی کے چمچماتے زیوروں میں لدے، گھونگھٹ نکالے اپنے سامنے پایا۔۔۔ جس کے خوبصورت ہاتھوں میں چاندی کی گڑوی تھی۔ لال سرخی سے رنگے ہونٹوں تک آتی اس کی بھاری سی چاندی کی نتھ گھونگھٹ کے کنارے سے نظر آ رہی تھی۔ اس کے لہنگے اور چنری پہ ہوئے شیشوں کے کام سے اس کا لباس چمچما رہا تھا۔۔۔ اس کی سجاوٹ کو اور بنا سنگھار کو دیکھ کر صوفیہ ایک لمحے کو ٹھہر سی گئی۔۔۔ اندر آ جا باہر بہت مٹی اڑ رہی ہے۔ راستا کہہ کے صوفیہ جلدی سے اندر پلٹ گئی۔۔۔ نووارد کے ہونٹوں پہ یہ سوچ کہ ہلکی سی مسکراہٹ ابھری کہ یہ آندھی مجھے کیا کہے گی؟ یہ آندھی تو خود میرے آنے پہ چلتی ہے۔۔۔ اس نے خیمے کے باہر لگے بینر پر نگاہ ڈالی۔۔۔ ویلکم ٹو دا جپسی ورلڈ اور اس نے خیمے کے اندر قدم بڑھا دیے۔۔۔

لوئس صوفیہ کے پیچھے کسی لڑکی کو جھلمل کرتے کپڑوں اور زیوروں میں سجی سجائی اندر آتے دلچسپی سے دیکھنے لگا جس نے اپنا آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے اندر آتے ہی موم بتیوں کی لو اور مشعلوں کی آگ پھڑ پھڑانے لگی تھی جسے لوئس نے واضح طور پہ محسوس کیا تھا۔۔۔ صوفیہ لوئس کے خوف سے محفوظ ہوتی پھر سے مسکرا رہی تھی۔۔۔ بیٹھو! صوفیہ اسے خیمے کے اندرونی حصے میں لے آئی تھی۔۔۔ کہو کیا چاہتی ہو؟ کیا خدمت کروں تمہاری؟ ٹیرو؟ اوریکل؟۔۔۔ صوفیہ کی بات پوری ہونے پائی تھی کہ وہ بولی۔۔۔ میں تو بس مستقل ٹھکانہ چاہتی ہوں۔۔۔ اس کی گونجتی ہوئی دور سے آتی آواز سنائی دی۔۔۔ صوفیہ کو یہ تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا۔۔۔ وہ جانتی تھی کہ وہ لڑکی بھی ایک پراسرا شخصیت ہے لیکن اس کی آواز میں یہ گونج کیسی تھی؟ تم میں عورتوں والے سارے سنگھار ہیں۔۔۔ مہندی پسند نہیں؟ صوفیہ نے اس کے جواب کو بظاہر قطعی نظر انداز کرتے ہوئے نیا سوال پوچھ ڈالا۔۔۔ لگاتی تھی پر مجھ پہ مہندی کا رنگ کبھی نہیں چڑھا۔۔۔ اس نے پھر سے اپنی گونجتی آواز میں بہت گہری بات کہہ دی جس کی گہرائی صوفیہ نے محسوس کر چکی تھی۔ اگر میں کچھ ایسا بنا دوں تمہارے ہاتھوں پہ جس کا رنگ گہرا بھی ہو اور پکا بھی تو؟ صوفیہ نے پانسہ پھینکا۔۔۔ وہ کیسے؟ اس نے اپنی گونجتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

ان میں سے ایک ڈیزائن چنو! صوفیہ اسے اپنے سٹال کے بیرونی حصے کی طرف لے آئی اور اب اس نے اسے لوئس کی ورکنگ ٹیبل کے پاس لگے بورڈ پہ

موجود تاش کے پتوں کے علامتی ٹیٹوز کے ڈیزائنز میں سے کسی ایک کو چننے کو کہا تو اس نے ایک مختصر مگر خوبصورت ڈیزائن پر انگلی رکھ دی۔۔۔صوفیہ نے پلٹ کر لوئس کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور لوئس کو حیران دیکھ کر پھر سے ایک معنی خیز مگر پراسرار مسکراہٹ صوفیہ کے چہرے پہ ابھر آئی۔۔۔کام کے دوران وہ گھونگھٹ کے اندر سے ہی صوفیہ کے چمپئی حلیے کا جائزہ لیتی رہی۔۔۔ لمبے بالوں کی باریک باریک بے شمار چٹیائیں جن میں رنگ برنگے موتی پروئے ہوئے تھے۔اس کے گلے میں پڑے رنگین پتھروں اور پرندوں کے رنگین پروں سے بنے ہوئے لمبے لمبے ہار۔۔۔کلائیوں میں لکڑی، پتھروں اور ڈوریوں سے بنے ہوئے بیشمار بریسلیٹس۔۔۔ہاتھوں کی لمبی مخروطی انگلیوں میں رنگ برنگی نگینے جڑی انگوٹھیاں، کانوں میں لٹکتے کسی پرندے کے چھوٹے سے مجسمے کی شکل کے آویزے۔۔۔ہونٹوں پہ ہلکے ترین رنگ کی شبنمی چمک۔۔۔آنکھوں کے اوپر لگے کالے نیلے آئی شیڈز۔۔۔اور آنکھوں کے اندر کالے سرمے کی جگہ کھلتے نیلے رنگ کی لکیریں۔۔۔ بائیں آنکھ کی ابرو میں پروئی ایک چھوٹی اور باریک سی نتھ جیسی تار۔۔۔لیکن یہ تو ناک میں پہنی جاتی ہے۔۔۔اس نے پہلی بار کسی کے ابرو کی جلد میں پروئی ہوئی نتھنی دیکھی تھی۔سجاوٹ تو صوفیہ کی بھی قابل دید تھی لیکن اس کا لباس اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔کالے رنگ کا جمپ سوٹ جس سے وہ ناواقف تھی، اس کے لیے انوکھا تھا کہ جس کا اوپری حصہ کسی تھیلے کی مانند ڈھیلا ڈھالا تھا جس میں صوفیہ اپنی کھلی آستینوں میں چھپے بازو آرام سے ہلا جلا رہی تھی۔۔۔اور لباس کا باقی کا آدھا نچلا حصہ کسی عربی طرز کی بہت ساری سلوٹوں سے بنی کھلی سی شلوار کے جیسا تھا جس کے پائنچے نیچے سے کسی الاسٹک کی طرح بند تھے۔اس کے پورے ڈھیلے ڈھالے لباس میں محض ایک ہی جگہ فٹنگ کی گئی تھی اور وہ تھی اس کی کمر۔۔۔جہاں رنگ برنگی ڈوریوں اور موتیوں سے مزین ایک بیلٹ اس کے سادے مگر منفرد طرز کے کالے لباس پہ کمر کی جگہ بندھی ہوئی تھی۔۔۔

آپ بہت خوبصورت ہیں۔۔۔اس کی گونجتی ہوئی آواز لوئس نے پہلی بار سنی تو وہ بھی چونک گیا۔۔۔تم بھی بہت خوبصورت ہو! تمہاری رنگت، ہاتھوں پیروں، ہونٹوں اور ناک کی بناوٹ۔۔۔تمہارا حسن کسی بناسنگھار کا محتاج نہیں۔۔۔تو پھر اپنے آدھے چہرے کو کیوں چھپا رکھا ہے؟ نقش اچھے ہیں تمہارے تو نین بھی قابل دید ہوں گے، صوفیہ نے بھی جواباً کھلے دل سے سچائی کے ساتھ اس کی تعریف کی اور گھونگھٹ پہ سوال بھی اٹھایا۔۔۔میرا یہ پردہ لوگوں سے شرم کا نہیں! لوگوں کا خوف سے شرمندہ نہ ہو جانے کے لیے ہے۔۔۔بہادر بنے اکڑتے ہیں۔۔۔شرمندگی سے تو مرتے نہیں، کہیں خوف سے نہ مر جائیں۔۔۔اس نے اپنی گونجتی آواز میں جواب دیا۔۔۔ایسا کیا ہے؟ میں دیکھنا چاہتی ہوں، مجھے دکھا گی؟ صوفیہ نے خود اعتمادی سے پوچھا تو اس نے اپنی گردن دائیں طرف بیٹھے لوئس کی طرف موڑی تو صوفیہ سمجھ گئی کہ وہ لوئس کے ڈر جانے کا اشارہ دے رہی ہے تو صوفیہ نے لوئس سے پوچھا۔۔۔یہ اپنا پورا چہرہ دکھانے لگی ہے تم دیکھ پاؤ گے؟ لوئس جو پہلے سے ہی خوفزدہ تھا مگر صوفیہ کی بےخوفی دیکھ کر اسے بھی کچھ حوصلہ ہوا تو اس نے گھبراتے ہوئے ہاں میں سر ہلا دیا۔ہم تیار ہیں! صوفیہ کے کہتے ہی اس نے اپنا گھونگھٹ پلٹ دیا۔صوفیہ کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے پھیل گئیں لیکن لوئس تو اس کا چہرہ دیکھتے ہی خیمے سے باہر بھاگ گیا۔۔۔کہا تھا نہ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔۔۔اس نے اداسی سے کہا اور اپنا گھونگھٹ دوبارہ اپنے آدھے چہرے پہ واپس ڈال دیا۔۔۔صوفیہ نے بہت حوصلے سے اپنا کام پورا کیا اور اسے دکھایا تو اس کے تیکھے پتلے ناک میں پڑی موٹی سے نتھنی سے چھوتے خوبصورت لال رنگ کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی جیسے اسے صوفیہ کا کام بہت اچھا لگا ہو۔۔۔اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے پانچ سو کا اکلوتا نوٹ نکال کر صوفیہ کی طرف بڑھایا اور گونجتی آواز میں بولی میرے پاس ابھی

اتنے ہی ہیں۔۔۔اس کی قیمت بتادو! ان سے زیادہ ہے تو تمہیں جلد ادا کردوں گی۔۔۔صوفیہ نے اسے مسکراتے ہوئے کہا، اس کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔یہ ایک خوبصورت عورت کا دوسری خوبصورت عورت کو دیا ایک تحفہ سمجھ کے رکھ لو۔۔۔ٹھیک ہے! میں تمہارا تحفہ سمجھ کے رکھ لیتی ہوں اور تم یہ نوٹ میری نشانی سمجھ کے رکھ لو۔۔۔ ویسے بھی پیسے میرے کسی کام کے نہیں لیکن تمہارے کام تو آسکتے ہیں۔۔۔ وہ گونجتی آواز میں بولی۔۔۔کام میں لے آئی تو تمہاری نشانی چلی جائے گی۔۔۔میں اس اپنے پاس رکھوں گی، صوفیہ کو اسے یہ بات بتانے میں قطعاً دلچسپی نہ تھی کہ یہاں بنایا جانے والا ہر ٹیٹو ہزاروں روپے قیمت کا ہے اور یہ پانچ سو روپے اس چھوٹے سے ڈیزائن کی ایک چوتھائی قیمت بھی نہیں لیکن آج کی رات کے یہ آخری گاہک اس نے پیسے کمانے کے لیے نہیں چنے تھے بلکہ اس کا مقصد تو اپنے نئے پراسرار تجربے کی تکمیل تھا۔۔۔صوفیہ نے وہ پانچ سو کا نوٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا لیکن اسے چھوتے ہی صوفیہ ایک لمحے کو آنکھیں جھپکنا بھول گئی۔۔۔اس کی آنکھوں کے سامنے اس نوٹ سے جڑے گزشتہ دنوں کے مناظر سیکنڈز میں گھوم گئے اور آخری منظر میں وہ یہ نوٹ بادشاہ کے ہاتھوں سے زمین پہ پھینکے جانے سے اس گھونگھٹ والی کے ہاتھوں میں منتقل ہوتا دیکھ رہی تھی۔۔۔وہ حقیقی دنیا میں واپس آ گئی اور اب مطمئن سی اس نوٹ کو تھامے کھڑی اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔۔۔

سنو! حادثوں سے زندگی نہیں رکتی۔۔۔دلبرداشتہ مت ہونا، صوفیہ کی بات پہ وہ پلٹی اور جواب دیا۔۔۔زندگی تو نہیں رکتی لیکن کچھ حادثوں سے موت رک جاتی ہے۔۔۔ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کی بجائے ہمارے ساتھ یہیں ٹھہر جاتی ہے۔۔۔اور یہ احساس سمجھ پانا یا سمجھا پانا آسان نہیں! وہ اپنی گونجتی آواز میں جواب دے کے باہر نکل گئی۔۔۔اور باہر چلتی تیز ہوا نے پھر سے آندھی کا رخ لے لیا اور مونہہ زور آندھی سے لہراتے خیمے میں صوفیہ کی نظریں داخلی راستے پر جمی رہیں۔۔۔ جہاں سے اب لوئس ڈرا سہما اندر آ رہا تھا۔۔۔آر وی ڈن؟ اس نے پھر سے سپینش لہجے میں انگریزی بولی۔۔۔یس! کارڈز آر ڈسٹریبیوٹڈ، بیٹس آر میڈ، اینڈ ناؤ اٹس شوٹائم! وی آر ڈن! صوفیہ نے اسی پراسرار مسکراہٹ اور اطمینان سے لوئس کو جواب دیا۔

ٹینا نے گاڑی بادشاہ کے محل نما گھر کے پورچ میں داخل کی، اور گارڈ کی مدد سے اسے اس کے بیڈروم تک پہنچانا کر تیزی سے اس کے گھر سے باہر نکل آئی اور وہاں پہلے سے بلائی ایک کیب میں بیٹھ کر چل گئی۔ گارڈ گیٹ بند کر کے گھر کے پچھلی طرف موجود اپنے کوارٹر میں سونے جا چکا تھا۔ کچھ دیر سے تھم چکی ہوا نے پھر سے تیزی اختیار کر لی تھی۔ بادشاہ کا گھر رات کے آخری پہر کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ گھر کے بڑے سے لان میں لگے درخت یہاں وہاں جھول رہے تھے۔ شروعاتی خزاں کے پتے گھر کے باہر سنسان سڑک پر اڑتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ سب لوگ آندھی کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لیے اپنے اپنے گھروں کی کھڑکیاں دروازے بند کیے بستروں میں گھسے ہوئے یا تو سو رہے تھے یا سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور رات کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے بادشاہ کے گھر کے اطراف آندھی پھر سے آسمان لال کرنے لگی تھی۔

لال ہوتے اس خوفناک موسم میں وہ تینوں تین الگ الگ سمت سے بادشاہ کے گھر کو گھورتے ہوئے سنسان سڑک پار کر رہے تھے۔ ایک وہ تھی جسے بادشاہ نے جھوٹی محبت میں بیوقوف بنا کر شادی کا وعدہ کر کے ٹھکرا دیا تھا۔ دوسرا وہ جو اپنے اکلوتے بھائی کی محبت میں سب چھوڑ کے اپنے آبائی شہر واپس چلا آیا تھا اور یہاں آ کر دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا تھا ایک باعزت روزگار کی تلاش میں تاکہ اس کا بھائی اسے اپنا لے لیکن بادشاہ نے اس نفرت اور حقارت سے دھتکار دیا تھا۔ اور تیسری وہ تھی جو اس رات بادشاہ کے پھینکے ہوئے نوٹ پہ اسے گانا سنانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ اب ان دونوں کی طرح وہ بھی بادشاہ کے گھر کی طرف گردن موڑے گزر

رہی تھی۔ وہ تینوں ایک دوسرے سے انجان اپنے اپنے راستے چلتے آرہے تھے۔ ایک خواجہ سراہ دائیں جانب والی سڑک سے، ایک دیہاتن بائیں جانب جاتی سڑک سے اور ایک گڑوی والی سامنے سے آتی سڑک سے ایک ساتھ بیچ چوک میں ایک دوسرے سے بیخبر بنا ٹکرائے گزر گئے اور اس ایک لمحے میں ان تینوں کے ہاتھوں پہ بنے تاش کے پتوں کے علامتی ٹیٹو ایک ساتھ چمکے جن پہ اے لکھا ہوا تھا اور ان کی چمک سے فضا میں بجلی کی ایک تکون سی بن کے تحلیل ہوگئی۔۔۔

وہ بائیں جانب کروٹ لیے کچی پکی نیند میں تھا جب کمرے میں چل رہی سائیں سائیں کی آوازوں سے اس کی آنکھ کھلی تو اپنے سامنے نازو کو کھڑے پایا لیکن اس کی شکل بہت بگڑی ہوئی اور خوفناک تھی۔ اس نے اپنا وہم جان کر دائیں طرف کروٹ لی تو سامنے راجا کھڑا تھا مگر اس کی نقوش بھی بگڑے ہوئے تھے۔ وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔۔۔ پہلے تو اسے لگا کہ اس کا دماغ نشے کے زیر اثر اسے ایسا دکھا رہا ہے، یہ سب ایک فریب نظر ہے۔۔۔ اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے سامنے دیکھا تو چاندی اس کے سامنے موجود تھی۔ اس نے پھر سے اپنے دائیں بائیں اور سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔۔۔ وہ تینوں وہیں اس کے کمرے میں موجود تھے لیکن بگڑے چہروں کے ساتھ اور پھر چاندی نے اپنا گھونگھٹ ہٹایا تو اس کی شکل دیکھ کر وہ چیخ پڑا۔۔۔ تم؟؟؟ یہ تم نہیں ہو سکتی۔۔۔ وہ تینوں اس کے تینوں اطراف کھڑے بس اسے خاموشی سے دیکھ رہے تھے اور وہ چلائے جا رہا تھا۔۔۔ لیکن باہر آندھی طوفان اور موسلا دھار دھار بارش کا اتنا شور تھا کے اس کے محل نما بڑے سے گھر کے ایک بند کمرے کی آوازیں گھر کے پچھلی جانب

پچھلے لان کے دوسری جانب موجود سرونٹ کوارٹر تک نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔ ایک دو بار گھر کے گارڈ کو لگا کے جیسے اس نے کسی چیخ کی آواز سنی ہے۔۔۔ لیکن پھر آندھی، گرج چمک اور طوفانی بارش کے شور کے باعث وہ اسے اپنا وہم سمجھ کے مونہہ پہ چادر تان کے سو گیا۔۔۔ اس کی چیخیں رک چکی تھیں اور دل کی دھڑکن بھی۔۔۔ اور جیسے ہی اس کی سانسیں بند ہوئیں تو ان تینوں نے بھی اس کمرے میں اپنے علاوہ کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی پہلی بار حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر سامنے مردہ حال میں پڑے بادشاہ کو۔۔۔

پولیس اسٹیشن کے انکوائری کاؤنٹر سے نکل کر وہ اور لوئس باہر نکلے ہی تھے کہ ٹینا ٹکرا گئی۔۔۔ اوہ! صوفیہ! آئے ایم سوری یار! پولیس نے مجھ سے پوچھا کہ کل بادشاہ میرے ساتھ تھا تو ہم کہاں کہاں گئے؟ کیا کیا؟ کس کس سے ملے؟ تو تمہارا نام بھی آیا پر مجھے نہیں پتہ تھا کہ یہ تمہیں بھی پولیس اسٹیشن بلا لیں گے لیکن امید ہے کہ انہوں نے تمہیں زیادہ تنگ نہیں کیا ہوگا، آخر تم نے تو بس ایک ٹیٹو ہی بنایا تھا اس کی گردن پہ۔۔۔ ٹینا نے معذرت اور سوال ایک ساتھ کیا تو صوفیہ بولی، ہاں! زیادہ تنگ تو نہیں کیا، بس اتنا کہا ہے کہ جب تک پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں آ جاتی، ہم لوگ پاکستان سے واپس نہیں جا سکتے۔۔۔ واٹ نانسنس؟ ایسا کیوں؟ ٹینا نے حیرانی سے پوچھا۔ کیونکہ انہیں شک ہے کہ ٹیٹو بنانے کے آلات یا رنگوں سے کوئی زہریلا مواد بادشاہ کے جسم میں نہ اتر گیا ہو۔۔۔ اور ایسا ہوا تو ہم مجرم ہوں گے۔ صوفیہ نے بتایا۔ اف! ایک تو یہ پولیس والوں کو بھی پتہ نہیں کیا کیا سوجھتا ہے؟ خیر، ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ نشے کی اوورڈوز سے مرا ہوگا۔ تمہیں بتا نہیں سکتی کہ وہ نشے میں کس قدر دھت تھا جب میں اسے گھر تک لے کر آئی لیکن اتنا نشہ کے اس کی جان ہی چلی گئی؟ بٹ آئے ایم ناٹ شور! پورٹس آنے پر ہی پتہ چلے گا۔۔۔ ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت؟ اس کی موت سے بھلا ہمارا کیا تعلق؟ ہے نا؟ ٹینا نے صوفیہ سے کہا تو صوفیہ نے اپنی اسی پراسرار مسکراہٹ سے ٹینا کو جواب دیا، ہاں صحیح کہا۔۔۔ تمہیں یا مجھے پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔۔۔ اس کی موت سے صرف اسی کا تعلق ہے۔۔۔

اپنے جدید پینٹ ہاس اپارٹمنٹ میں داخل ہو کے اس نے ہاتھ میں پکڑے گروزری بیگز کچن کاؤنٹر پہ

رکھے اور پاس میں پڑے فون کی آنسرنگ مشین پلے کر دی۔۔۔صوفیہ! کہاں ہو تم دو ہفتے سے ٹرائے کر رہی ہوں نہ تمہارا سیل فون لگ رہا ہے نہ ہی تم کسی سوشل میسنجر پہ ریپلائے کر رہی ہو۔۔۔ اسی لیے تمہیں اپارٹمنٹ کے لینڈ لائن پہ کال کرنی پڑی۔۔۔بیش کی رپورٹ میں ہارٹ اٹیک ثابت ہونے پہ تم تو رومانیہ واپس چلی گئی لیکن جانتی ہو بیش کے بارے میں پولیس کو کیسی کیسی باتیں پتہ چلی ہیں؟ پولیس بیش کے فون کال ریکارڈز سے جب نازو کے گھر پہنچی تو پتہ چلا کہ بیش کی موت سے ایک رات پہلے اس لڑکی نے بھی بیش کے کہنے پہ اپنی جان دے دی تھی۔۔۔ پولیس کو یہ بات ان کے میسیجز سے پتہ چلی جس میں بیش نے اسے آخری میسج کے جواب میں کہا تھا کہ تم مرجا! اور اس جذباتی اور بیوقوف لڑکی نے ایسا ہی کیا۔۔۔ پہلے تو خود بیش جیسے فلرٹ کی محبت اور باتوں کا یقین کر کے اس کے گھر تک پہنچ گئی، اور پھر اس کے کہنے پہ اپنی جان بھی دے دی۔۔۔

اور سنو! بیش کے رشتہ داروں سے پتہ چلا کے بیش اکلوتی اولاد نہیں تھا بلکہ اس سے پانچ سال بڑا اس کا ایک خواجہ سرا بھائی بھی تھا، راجا! جسے پندرہ سال کی عمر میں بیش ہی کی ضد پہ اس کے والدین نے اسے دوسرے شہر کے خواجہ سراں کے حوالے کر کے اسے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا کیونکہ اس کے بھائی کی تیسری جنس کی وجہ سے اس کے دوست احباب، اور رشتہ داران کا مذاق اڑاتے تھے۔اس کی فیملی نے خود بھی اپنا شہر چھوڑ دیا تھا اور یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔لیکن پندرہ سال کے بعد اس کا وہ بھائی بیش کو تلاش کرتے کرتے یہاں تک آن پہنچا تھا اور اپنے عزت دار بھائی کے ساتھ رہنے کے لیے اپنا ناچ گانے کا پیشہ بھی چھوڑ آیا تھا اور یہاں سب سے عزت دار روزگار مانگتا پھرتا تھا۔ نازو کا باپ علاقے کا چوکیدار تھا۔ اسی نے راجا کو رہنے کے لیے وقتی طور پر ایک زیرِ تعمیر گھر دے رکھا تھا۔ یہ سب باتیں پولیس کو راجا کے گرو سے پتہ چلیں جس نے اس کی لاش کی تصدیق کی۔۔۔صوفیہ! بیش کا بڑا بھائی راجا بھی ٹھیک ایک رات پہلے بیماری اور بھوک سے مر چکا تھا۔۔۔نہ جانے کب سے بھوکا اور بیمار تھا؟ کچھ دن پہلے کوئی خواجہ سراہ ایک فوڈ پوائنٹ پہ بیش کو اپنا بھائی کہتے ہوئے اس کے گلے بھی لگ رہا تھا اور اس بات کے گواہ ہمارے بہت سے دوست ہیں جو اس رات بیش کے ساتھ تھے۔اور اب سنو بیش کے بارے میں سب سے بڑا اور ہولناک انکشاف۔۔۔ ٹینا کے پاس ابھی بھی کچھ باقی تھا۔۔۔

پچھلے کچھ دنوں کی طوفانی بارشوں اور آندھیوں سے ہمارے علاقے کے ایک بڑے اور پرانے پارک میں کچھ درخت گر گئے تھے۔ جب ان کا ملبہ اٹھایا گیا تو ایک درخت کے نیچے ایک گہرا گڑھا تھا جس میں کاف پانی بھر چکا تھا۔ایک مالی نے اسے خالی کرنے کی غرض سے جب اس گڑھے سے پانی نکال کر باہر پھینکنا شروع کیا تا کہ اسے دوبارہ سے مٹی ڈال کر پر کر کے زمین کو لیول کیا جا سکے، تو وہاں سے لوہے کا ایک صندوق ملا جس میں کسی لڑکی کی لاش تھی۔اس کی صندوق سے سلور کی ایک گڑوی بھی ملی جو ایک مخصوص قسم کی گانے والیاں اپنے لوک گیتوں میں ایک ساز کی طرح استعمال کرتی ہیں۔ پولیس انکوائری کرتے ہوئے جب گڑوی بجانے والے ان مخصوص لباس زیب تن کرنے والے گائیکوں کے علاقے میں پہنچی تو پتہ چلا کہ اس لڑکی کا نام چاندی تھا۔ اس کی برادری کے لوگوں نے بتایا کہ ایک سال پہلے فلاں علاقے کے زمیندار کا کوئی شہری سیٹھ دوست چاندی کو اس کے مرتے ہوئے باپ سے ملوانے کے لیے اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا گیا اور جب کچھ دن تک چاندی واپس نہیں لوٹی تو وہ لوگ اس زمیندار کے گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ زمیندار جو چاندی کا باپ تھا اب مر چکا ہے اور اس کا وہی شہری دوست چاندی کو اپنی بہو بنا کے اپنے ساتھ شہر لے جا چکا تھا۔ جانتی ہو وہ لڑکی چاندی کون تھی؟ بیش کی بیوی! جسے کچھ سال پہلے بیش کے باپ نے بیش کو اپنے پرانے شہر لے جا کر اپنے بیٹے کو جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دے کر اس کا نکاح

چاندی سے کروا دیا تھا۔ دراصل بیش کا ایک زمیندار عیاش دوست اپنی جوانی کے زمانے میں کسی غیر معروف لوک گائیکہ سے جعلی نکاح کر کے بعد ازاں اسے چھوڑ کے بھاگ آیا تھا اور بستر مرگ پہ اپنے گناہ سے توبہ کر کے اس کے کفارے کے طور پہ اس نے بیش کے باپ کو اس گائیکہ کو لانے کو کہا تا کہ وہ اس سے معافی مانگ کر اپنی موت سہل کر سکے۔۔۔ لیکن جب بیش کا باپ مقررہ جگہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ لوک گائیکہ تو مر چکی ہے لیکن اس کے دوست کی جوان بیٹی بے آسرا ہے، وہ اسے لیے نے اپنے مرتے دوست کے پاس چلا آیا۔۔۔ بیش کے دوست نے اپنی اس بیٹی کی ذمہ داری بیش کے باپ کو سونپ دی۔۔۔ بیش کا باپ جو پہلے ہی اپنی بیوی کے مرنے کے بعد اپنی زندگی سے بیزار تھا، وہ اس نئی ذمہ داری کے اچانک گلے پڑ جانے سے گھبرا گیا۔ اسے اس کے سوا کچھ نہ سوجھا کہ وہ اس لڑکی کی شادی اپنے بیٹے سے کر دے، پھر بھلے وہ بعد میں اپنی پسند سے شادی کرتا پھرے۔۔۔ اس نے فوری طور پہ بیش کو وہاں بلوایا اور بس اس کے مرتے دوست کے سامنے اس کی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے اسے اس نکاح کے لیے کسی نہ کسی طور راضی کر لیا۔۔۔ جس شام نکاح تھا، اسی رات چاندی کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی تدفین کے بعد بیش کا باپ اپنے بیٹے اور بہو کو لے کر اپنے شہر واپس آ رہا تھا جب راستے میں دل کا دورہ پڑنے سے وہ بھی جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

شہر پہنچ کر بیش کو چاندی سے کوئی سروکار نہ رہا۔۔۔ چاندی کو اپنے کمرے سے نکلنے اور کسی کے سامنے آنے کی شدید ممانعت تھی کہ بیش کسی پہ اپنی شادی آشکار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دن رات اس سے لڑتا اور اسے واپس اپنے گاؤں لوٹ جانے کو کہتا مگر چاندی اسے بیش کا وقتی غصہ سمجھ کے سب سہہ جاتی۔۔۔ لیکن بیش کی بے اعتنائی جوں کی توں برقرار رہی۔۔۔ جب بیش گھر سے باہر ہوتا تو چاندی اپنا دل بہلانے کے لیے کبھی کبھار اپنے گاؤں سے لائے لوہے کے صندوق سے اپنی ماں کے کپڑوں کو نکال کر پہنتی اور اسی کی طرح تیار ہو کر اسی کی طرح گڑوی بجاتی اور ویسے ہی گانا گاتی جیسا وہ اپنی ماں کو کرتے دیکھتی آئی تھی۔ نوکر چاندی کے گیت اور گڑوی کی آواز سنتے اور آپس میں ہی سن گن لے کر خاموش ہو جاتے تھے۔ بیش کو بتانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ اور پھر ایک دن جب وہ اپنے کینسل ہو چکے ایک ٹرپ کی وجہ سے گھر واپس لوٹا تو اسے ختم ہوتے گیت کا آخری ساز سنائی دیا۔۔۔ آواز کے تعقب میں جب تک وہ اوپر چاندی کے کمرے تک پہنچا، وہ اپنی ماں کا لباس تبدیل کر کے صندوق میں رکھ رہی تھی۔۔۔ بیش کے پوچھنے پہ اس نے اعتراف کیا کہ یہ اس کا پیشہ ہے۔۔۔ بیش کا یہ سننا تھا کہ گھر میں ایک ہنگامہ شروع ہو گیا۔ نوکر اپنی شامت کے ڈر سے اپنے اپنے کوارٹرز میں جا چھپے۔۔۔ اس سے پہلے بیش کو چاندی کی حقیقت کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا لیکن چاندی کو آج اپنے مونہہ سے اعتراف کرتا دیکھ وہ اس پہ برس پڑا اور غصے کی حالت میں اسی کی چاندی کی گڑوی اس کے سر پہ دے ماری جس سے اس کا سر پھٹ گیا اور وہ موقع پہ ہی مر گئی۔۔۔ بیش نے اس کی لاش اسی کے پاس پڑے لوہے کے ایک صندوق میں بند کی جو وہ اپنے ساتھ گاؤں سے لائی تھی اور جس میں اس کی ماں کا وہی جوڑا تھا جو اس نے کچھ دیر پہلے تک پہن رکھا تھا۔ بادشاہ نے وہ خون آلود گڑوی بھی اسی صندوق میں پھینک کر صندوق کے کنڈے کے ساتھ لٹکتا ہوا کھلا تالا واپس لگا کر صندوق لاک کر دیا اور کسی نہ کسی طرح وہ بھاری صندوق اکیلا گاڑی کی ڈگی میں رکھنے میں کامیاب ہو گیا اور وہیں بیٹھ کر ہانپنے لگا۔۔۔ گھر کا گارڈ جب اسے یوں گاڑی کے پاس بیٹھا دیکھ بھاگتا آیا تو بیش نے اسے گیٹ کھولنے کا حکم دیا اور ہانپتا کانپتا گاڑی لے کر باہر نکل گیا۔۔۔ ان دنوں ہمارے علاقے کے پرانے پارک کو نئی طرز میں ڈھالنے کا کام چل رہا تھا اور پارک میں کئی جگہ کھدائی ہو رکھی تھی۔ اس نے وہاں موجود ایک مالی کو جو ان دنوں رات کے وقت وہاں پہرہ داری بھی

کرتا تھا پیسوں کا لالچ دے کر ایک گڑھے میں وہ صندوق دفن کروا کے راتوں رات وہ گڑھا بھروا کے اس پہ ایک چھوٹا سا درخت لگوا دیا تاکہ پارک کے اس مخصوص حصے میں زمین پہ اور کسی کام کی گنجائش باقی نہ رہے۔ وہ درخت ایک سال میں بڑا تو ہوتا گیا لیکن اس کے عین نیچے لوہے کے صندوق کی وجہ سے وہ زمین کے اندر اپنی جڑیں مضبوطی سے نہ گاڑھ سکا اور پچھلے دنوں کی مسلسل آندھیوں سے گر گیا اور یوں بیش کے ہاتھوں ہوا قتل سامنے آ گیا۔ اور اس سب کا خلاصہ بیش کے گھر کے ایک گارڈ نے کیا جو بیش کی موت کے بعد گھر سے آتی خوفناک آوازوں سے ڈر کے گھر سے بھاگ گیا تھا اور جب پولیس چاندی کی انکوائری کے لیے بیش کے گھر تک پہنچی تو اس گارڈ کے لاپتہ ہونے پر اس کی تلاش شروع ہو گئی۔۔۔ پولیس کو شک تھا کہ وہ بھی بیش کے ساتھ چاندی کے قتل میں ملوث تھا اسی لیے کہیں جا چھپا ہے لیکن وہ تو چند دنوں سے گھر سے رات کے اندھیروں میں آتی گھنگھروں تو کبھی پائلوں کی آوازوں سے ڈر کے اپنے گاؤں چلا آیا تھا۔ باقی ملازموں نے بھی اس کے بے گناہ ہونے کے ثبوت دیے، اسے بھی باقی ملازموں کی طرح یہی بتایا گیا تھا کہ چاندی ہمیشہ کے لیے جہاں سے آئی تھی وہیں جا چکی ہے بیش نے اس کمرے سے چاندی کے قتل کے تمام نشانات اکیلے ہی صاف کیے تھے اور یوں کسی کو بادشاہ کے اس گناہ کی خبر تک نہیں ہوئی۔۔۔

لوئس جو صوفیہ کے ساتھ اتنے سالوں رہنے کی وجہ سے اردو سے واقف تو تھا لیکن سپینش یا انگلش بولنے کو ہی ترجیح دیا تھا۔۔۔ ٹینا کی آواز میں بادشاہ کی کہانی حیرت سے سننے کے بعد انگلش میں بولا، تو ہم اب قاتل بھی ہو گئے اور لوگوں کو اپنے جادو سے مارنا بھی شروع کر دیا؟ لوئس تمہیں میں نے یہی سب سنوانے کے لیے یہاں بلایا ہے کہ تمہیں بتا سکوں کے ہم نے بادشاہ کو نہیں مارا۔۔۔ وہ اپنی موت کا ذمہ دار خود ہے۔ وہ ہمیشہ سے بلائنڈ کھیلتا رہا، پہلے اس نے اپنے ماں باپ کو اکلوتا لڑکا ہونے کی وجہ سے اموشنلی بلیک میل کر کے اپنے خواجہ سراہ بھائی کو گھر سے نکلوا دیا بنا یہ سوچے سمجھے کے اس کا بھائی پندرہ سولہ سال کا ہے جو اپنا گھر، ماں باپ یا بھائی اتنی آسانی سے نہیں بھول پائے گا اور کبھی نہ کبھی واپس لوٹ کے ضرور آئے گا۔۔۔ پھر اس نے چاندی کے بارے میں بنا جانے محض جائیداد سے عاق ہو جانے کے ڈر سے اس سے نکاح کر لیا اور بعد ازاں اسے قتل بھی کر دیا اور تیسری بار سوشل میڈیا پہ ملی ایک لڑکی کو بنا دیکھے صرف اس کی آواز اور کسی اور کی تصویروں پہ فدا ہو کے محبت کے دعوے اور شادی کے وعدے کر کے اسے اپنی جھوٹی محبت میں گرفتار کیا اور جب اس لڑکی کی حقیقت بھی سامنے آئی تو اسے بھی ٹھکرا دیا۔۔۔ میں نے اپنا یہ میجک ڈیزائن ہی ایسے کیا ہے کہ اصل زندگی میں بلائنڈ کھیل کے خود کو ونر سمجھنے والا کھلاڑی اگر دوسروں کے ساتھ کبھی نہ کبھی زیادتی کر چکا ہے تو اس کے کوئی سے ایسے تین سب سے بڑے وکٹمز ہیلووین کی رات اس کے پاس ضرور لوٹیں گے لیکن اس کے لیے ہمیں ہیلووین کی ہی رات بلائنڈ کھیلنے والے کے ہاتھ پہ موت کا وہ مخصوص ٹیٹو بنانا ہوگا جس پہ کے یعنی کنگ بنا ہوا ہے اور پھر اس کے بنتے ہی اس کے ہاتھوں ظلم کا شکار ہوئے کوئی سے تین لوگ ہمارے پاس خود چل کے آئیں گے جو اپنے ہاتھوں پہ وہ ٹیٹو بنوائیں گے جو اس بادشاہ کی نارمل ٹریل کو مات دے سکے۔۔۔ یعنی تین اکے۔۔۔ اور ایسا ہی ہوا۔۔۔

پہلے ہمارے پاس نازو آئی اور اس نے ایک اکے کا ٹیٹو چنا، ایس آف کلب جسے اردو میں چڑیا کا اکا کہتے ہیں، پھر راجا آیا جس نے ایک اور اکا چنا، ایس آف ہارٹ یعنی پان کا اکا اور پھر آئی چاندی جس نے ایک تیسرا اکا چنا اور وہ تھا ایس آف سپیڈ یعنی حکم کا اکا۔۔۔ اور ان تینوں نے میرے ڈیزائن کیے ہوئے وہ الگ الگ اکے اپنے ہاتھوں پہ بنوائے۔۔۔ ان ایک جیسی علامات نے ان تینوں کو ایک ساتھ ایک ہی وقت جمع کیا، اس کنگ کے سامنے جو سمجھتا تھا کہ اسے کوئی

مات نہیں دے سکتا۔ اس کے پاس دولت کی رانی ہے اور دنیا اس کی غلام اور وہ ایک بادشاہ سب پہ بھاری ہے۔۔۔ اس کے پاس پیور سیکوئینس تھا لیکن وہ خود کو ٹریل سمجھتا تھا اور اسے لگتا تھا کہ وہ بہت طاقتور اور بااختیار ہے، ہر جگہ بس وہی ہے، بادشاہ، بادشاہ، بادشاہ۔۔۔ تین بادشاہوں کے برابر وہ اکیلا خود۔۔۔ بلائنڈ کھیل رہا تھا نا اس لیے خوش تھا کہ وہ دوسروں کے پورے نقصان کا مزہ لے سکتا ہے لیکن وہ بھول گیا کہ بلائنڈ کھیلنے والے کی بھی آدھی قیمت دا پہ لگی ہوتی ہے۔۔۔ اپنے بہترین ہونے کے گھمنڈ میں اپنے ہاتھ پہ کنگ آف سپیڈ کا ٹیٹو تو بنوالیا مگر جب اس جادوئی ٹیٹو کے کھیل میں اس کا مخالف سامنے آیا یعنی اس کا کرم یا کرما جو کے لوٹ کے آپ کے پاس آتا ہے تو وہ کوئی ایک نہیں تین الگ الگ لوگ تھے اور ان تینوں نے اپنے لیے ایک اکے کا ٹیٹو بنوایا جو تھی سب سے بڑی ٹریل یعنی تین اکے اور یوں بادشاہ کے مخالف کھلاڑی یعنی اس کے اپنے کرما نے اسے اس سے بھی بڑی ٹریل سے مات دے دی۔۔۔ صوفیہ نے وضاحت شروع کی۔

اب بتاتی ہوں ان تین اکوں کے ڈیزائن میں استعمال ہوئی علامتوں کا مطلب۔۔۔ تینوں میں، کلب، ہارٹ اور سپیڈ کی مرکزی علامت تو ہونی ہی تھی لیکن انہیں کے اندر میں نے تین موت کی گوتھک علامتوں کو یکجا کر کے تین پتی کے اصولوں پہ بنا سب سے بڑا ٹریل تیار کیا، موت کی ان علامتوں میں سے پہلی علامت ہے اسٹیچ پنچ ٹیٹو، جس میں ہر وہ علامت آ جاتی جس کا تعلق سائنسی بنیاد پر بنی مشینری یا ایجادات پر بنی ہو اور ہم جانتے ہیں کہ سائنس مفروضوں پر نہیں تجربات مشاہدات اور شواہدات پہ چلتی ہے اور قدرت سے بڑی حیرت انگیز اور دلچسپ سائنس کوئی ہے جو قدرت کی سچائیوں اور طاقتوں کو آشکار کرتی ہے، ماضی حال مستقبل، وقت، سمت، موسم، اور ایسا کچھ بھی جسے ہم کسی آلے کی مدد سے ماپ سکیں سٹیم پنک ٹیٹو کے اندر آتے ہیں یہ آلات فرضی بھی ہو سکتے ہیں اور پہلے سے موجود بھی اور اس کے لیے میں نے ایک ایسی گھڑی کا ڈیزائن بنایا جو وقت کے ساتھ سمت کا تعین بھی کرتی ہے۔۔۔ یعنی قدرت کے انتقام کا وقت، جس کی سمت بادشاہ کی طرف تھی کیونکہ وہ اپنے ہاتھ پہ ڈیتھ ٹیٹو بنوا چکا تھا۔۔۔

دوسری علامت تھی کالا گلاب جو بظاہر دیکھنے میں تو بہت خوبصورت لگتا ہے لیکن اصل میں موت، غم اور دکھ کو ظاہر کرتا ہے اور اسے بنانے والے تینوں مظلومین ان جذباتوں سے جڑے ہوئے تھے اس لیے بادشاہ کے ڈیتھ ٹیٹو سے بھی جڑ چکے تھے۔ اور تیسری گوتھک علامت ہے میگپی۔۔۔ یہ کوے کی ہی طرح کا ایک سفید اور کالا لیور پین پرندہ ہے جو خوش قسمتی اور اچھے مستقبل کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کا شمار دنیا کے ذہین ترین پرندوں میں ہوتا ہے۔ اس کی ایک نسل میں سفید اور کالے کے ساتھ نیلا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔۔۔ ہم اس علامت سے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہ اس کی تعداد پہ منحصر ہے۔۔۔ سات میگپیز کسی چھپے راز کو ظاہر کرتے ہیں اور آٹھ کسی دیرینہ خواہش کو اور اس ڈیزائن کے اندر میں نے انہیں ساتھ اور پھر ایک بار الگ، کل ملا کے آٹھ بار استعمال کیا ہے یعنی بادشاہ اور ان تینوں کے بیچ موت کے رشتے کا راز ان کے ہاتھوں پہ بنی علامات میں چھپا ہے جسے ہمارے علاوہ کوئی اور نہیں پڑھ سکتا۔۔۔ اور آٹھ میگپیز اس بات کی علامت ہیں کہ ڈیتھ ٹیٹو بنوانے والے سے، اس سب سے بڑی ٹریل کے ٹیٹو بنوانے والوں کی کوئی نہ کوئی ادھوری خواہش وابستہ تھی جو پوری نہ ہو سکی۔۔۔

اب بات کرتی ہوں ان ٹیٹوز میں استعمال کیے جان والے رنگوں کی۔۔۔ تو ڈیتھ ٹیٹو کے شوگر سکل میں استعمال ہونے والا گلابی رنگ کسی دشمن کی موت کے جشن کو اور خوشی کو ظاہر کرتا ہے جیسے ان تینوں کی موت اور اب بادشاہ کی موت سے جڑے ان کے اطمینان کی باری تھی کیونکہ یہ رنگ میں نے کنگ اور اکے دونوں کے ڈیزائن میں استعمال کیا تھا۔ جامنی رنگ غم اور اپنے کسی پیارے کو کھو دینے کے دکھ کو ظاہر کرتا ہے جو میں نے

صرف اکے کے تینوں ڈیزائنز میں استعمال کیا تھا کیونکہ تینوں ہی بادشاہ کو چاہتے تھے مگر بادشاہ انہیں گنوا چکا تھا اور اب وہ تینوں بادشاہ کو ہمیشہ کے لیے کھونے جا رہے تھے۔۔۔ سفید رنگ عام طور پر کسی ایسے رشتے کی امید اور روح کی پاکیزگی کو ظاہر کرتا ہے، ہو جو اب اس دنیا میں نہ رہا ہو اور یہ بھی اکے کے ٹریل ٹیٹو میں ہی استعمال کیا گیا ہے کیونکہ وہ تینوں پہلے سے مر چکے تھے مگر پھر بھی ان کی روح بادشاہ سے محبت کی امید رکھتی تھی کیونکہ وہ تینوں ارواح نیک تھیں۔ نارنجی رنگ اگتے سورج اور غم کے بعد کی زندگی کو ظاہر کرتا ہے اور اس رنگ کا استعمال بھی میں نے صرف اکوں کی ٹریل میں کیا ہے۔۔۔ کیونکہ ان تینوں نے بادشاہ کے ہاتھوں اٹھائے دکھ سے اپنی جانیں تو گنوا دیں لیکن اب ان کی موت کے بعد کی زندگی شروع ہونے کا وقت تھا۔۔۔ صوفیہ نے ساری تفصیل لوئس کو سمجھائی۔۔۔

لیکن اگر وہ تینوں بادشاہ سے اتنے مخلص تھے تو اسے مار کیوں دیا؟ لوئس نے سوال کیا۔ ان تینوں نے اسے نہیں مارا! ان تینوں کے ہاتھ پہ بنے ٹیٹوز نے بادشاہ کے ہاتھ پہ بنے ٹیٹوز کو اپنی سمت کھینچا اور وہ تینوں اس بات سے بیخبر بادشاہ کے پاس پہنچ گئے کہ وہ کسی جادو کے زیر اثر ہیں اور بادشاہ کے ہاتھ پہ بنے ڈیتھ ٹیٹو نے اسے دماغی طور پہ جکڑ کے ان تینوں کی شکل میں اسے اس کی موت دکھائی جبکہ وہ تینوں تو ہونقوں کی طرح بس اسے دیکھ رہے تھے کہ وہ وہاں کب اور کیسے پہنچے؟ تب تک وہ اس بات سے بھی انجان تھے کہ وہ مر چکے ہیں، ماسوائے چاندی کے۔۔۔ اب وہ ٹھہری حکم کا اکا! سب سے بڑا پتہ اور اس کے لیے اسے بادشاہ کو بس اپنا چہرہ دکھانا ہی کافی تھا۔ اس نے اپنا وہی چہرہ بادشاہ کو دکھایا ہوگا جو بادشاہ کے ہاتھوں قتل ہو جانے پر مسخ ہوا تھا۔۔۔ یعنی پھٹا ہوا سر اور زخمی پیشانی اور اس سے بہتا آنکھوں میں اترتا خون، جس سے چاندی کی آنکھیں کس قدر خوفناک نظر آتی ہیں، اس کا نظارہ چاندی ہمیں کروا چکی ہے۔۔۔ بس بادشاہ جیسے بزدل کے لیے جو لڑکپن میں اپنے خواجہ سراہ بھائی کے ساتھ رہنے پہ دنیا کے ہاتھوں مذاق بننے سے ڈرا، چاندی کے پیشے کی وجہ سے بدنام ہونے سے ڈرا، نازو کے ساتھ کیے اپنے وعدے پورا کرنے سے پیچھے ہٹا، اس جیسا بزدل ان تینوں کو ایک ساتھ ان کی مری ہوئی اور بھیانک حالت میں دیکھ کے خوف سے مرا اور اس کی موت سے ہی ان تینوں کی ارواح کے ہاتھوں پہ بنا اور بادشاہ کی گردن پہ بنے ٹیٹو کا کام ختم ہو گیا۔۔۔ اور اس جادو کے اثر کے ختم ہوتے ہی وہ تینوں بھی ایک دوسرے کے سامنے آ شکار ہو گئے۔۔۔ صوفیہ نے تین پتی ٹیٹوز کے اس جادوئی کھیل کا خلاصہ کیا۔

مجھے تمہارے اس نئے طرز کے جادوئی تجربے کو دیکھ کر بہت مزہ آیا ہے۔۔۔ اب تم دیکھنا اگلے سال جب ہماری اور دوسری دنیا کے بیچ پردے کی تہہ بارک ترین ہوگی اور ارواح آسمان سے زمین کا رخ کریں گی یا زمین، خلاؤں یا سمندروں میں بسنے والی ارواح اپنے پیاروں سے ملنے کے لیے ہماری زندہ دنیا کا رخ کریں گی تو اس رات یہ تین پتی کا جادوئی ٹیٹو میں دونوں جانب کے کھلاڑیوں کے ہاتھوں پہ بناں گا۔۔۔ اب میرا خوف زائل ہو چکا ہے۔۔۔ لوئس نے بڑے اعتماد سے صوفیہ کو کہا تو وہ بولی۔۔۔ لیکن دھیان رکھنا یہاں اکے کی ٹریل مظلوم تھی، معصوم اور بے گناہ یعنی نیک ارواح تھیں۔ اگلی بار ایسا نہ ہو کہ اکے کی ٹریل، بھلے ہی چھوٹی ٹریل کے ہاتھوں کسی ناانصافی یا زیادتی کا شکار ہوئی ہو، لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ خود بھی راجا، نازو اور چاندی کی طرح بیضرر رہوں، وہ بدروحیں بھی ہو سکتیں ہیں اور ایسی صورت میں تم اپنی حفاظت کے خود ذمہ دار ہو گے۔۔۔ صوفیہ نے اسے ایک اور پہلو کے بارے میں بتایا تو لوئس نے پاس پڑا کشن زمین پہ مارتے ہوئے کہا۔۔۔ رئیلی صوفیہ؟ تم چاہتی ہی نہیں نہ کہ میں بھی تمہاری طرح ایک ماہر جادوگر بنوں؟ اور وہ ہنستے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی۔۔۔ کافی پیو گے؟ نہیں زہر پیوں گا، لوئس غصے سے بولا۔۔۔ اتنی جلدی کیا ہے مرنے کی؟

اگلی ہیلووین تک تو ٹھہر جا! صوفیہ نے اسے پھر سے چڑایا اور وہ شٹ اپ صوفیہ کہہ کے ٹی وہ آن کر کے دیکھنے لگا۔

بیش کے گھر سے اس کے سارے ملازم بھاگ چکے تھے۔ کچھ رشتہ داروں نے وہاں آ کر رہنے کی کوشش کی تو وہ بھی ڈر کے بھاگ گئے۔ قبضہ مافیا بھی اس گھر پہ قبضہ نہ کر سکا۔ محلے والوں کا کہنا تھا کہ دن میں بھی جہاں اس گھر پہ ویرانی ٹپکتی ہے وہیں رات کے وقت اس گھر سے قہقہوں کی آوازیں گونجتی ہیں۔ راہگیروں کو گھر کے اندر سے گھنگھروں اور پائلوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور کبھی کبھار رات کے سناٹے میں وہاں سے گانے بجانے کی آوازیں ابھرتی ہیں۔۔۔ بہت سے لوگوں نے تو اپنے گھروں کی چھت سے اس گھر کے لان میں پڑے بڑے سے جھولے میں تین لوگوں کو جھولتے بھی دیکھا ہے۔

میرے ماں باپ اور بھائی تو اب اس گھر میں نہیں رہتے، نہ جانے ان کے لیے کون ساٹھکانہ مختص کیا گیا ہے؟ لیکن میں یہاں آ کر بہت خوش ہوں، اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے، راجا کہہ رہا تھا۔ میں نے بھی اس گھر کو اپنا سمجھ کے یہاں قدم رکھا تھا پر مجھے اسے اپنا کہنے کا اختیار نہیں ملا اور دیکھو آج مجھے یہ گھر نصیب ہو ہی گیا، چاندی جس کے چہرے پہ اب نہ تو گھونگھٹ تھا نہ ماتھے اور سر پہ زخم کا نشان اور نہ ہی آنکھوں میں اترتا خون۔۔۔ بہت اطمینان سے بتا رہی تھی۔۔۔ اس کی آواز میں اب وہ گونج باقی نہیں رہی تھی کہ اب وہ اس لوہے کی صندوق سے آزاد ہو چکی تھی۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ بادشاہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا مجھے خوبصورت سمجھ کے لیکن میں اس کے معیار پہ پوری نہیں اتری تو اس نے مجھے چھوڑ دیا لیکن میری نظر کبھی بھی اس کی دولت اور اس گھر پہ نہیں تھی۔ میں نے تو یہ گھر اس رات سے پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ نازو نے کہا تو چاندی بولی، ایک میں ہوں جو اس کی بیوی تھی لیکن اس نے مجھے کبھی اپنی بیوی سمجھا نہیں، ایک تم ہو جو اس کی بیوی بننا چاہتی تھی لیکن اس نے بنایا نہیں تو ہم دونوں ایک ہی جیسے ٹھہرے۔۔۔ اصل حق تو راجا کا ہے اس گھر پہ، چاندی نے راجا کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔۔۔ کون سا حق چاندی؟ جو کبھی مجھے جیتے جی نہیں ملا؟ بادشاہ کی موت کی رات اگر تم ہمیں یقین نہ دلاتی کے ہم زندہ نہیں ہیں تو میں تو آج بھی نہ جانے کہاں بھٹکتا پھرتا؟ تم ہی نے تو ہمیں یہاں آنے والے لوگوں کے رویوں کو دیکھنے کے لیے یہاں رکنے کو کہا اور تب جا کہ ہمیں یقین ہوا کہ ہمیں نہ کوئی دیکھ پا رہا ہے اور نہ سن پا رہا ہے، ہم مر چکے ہیں۔۔۔ لیکن ہماری روحیں زندہ ہیں اور ہم تینوں ہی ایک جیسے ہیں اس لیے ہم تینوں اس گھر میں ایک ہی ساتھ رہیں گے۔۔۔ یہاں کوئی میرا مذاق اڑانے والا نہیں۔۔۔ وہ اچانک اٹھ کر دھمال ڈالنے لگا اسے دیکھ کے نازو بھی اس کے ساتھ گھومنے لگی۔۔۔ اور چاندی نے اپنی چاندی کی گڑوی سنبھال لی۔۔۔ آسمان لال ہونے لگا تھا۔۔۔ ہوا تیز تر ہوتی ہوئی آندھی کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ تبھی ساتھ والے گھر کی ایک ملازمہ چھت پہ سوکھنے کے لیے لٹکائے گئے دھلے کپڑے لیجانے آئی تو آندھی اور ہوا کے شور میں گھلی ملی، گھنگروں اور گڑوی بجائے جانے کی آواز نے اسے اس ویران گھر کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا جہاں اسے تین دھندلے سے وجود اس دھول اڑاتی تیز ہوا میں لہراتے سے نظر آئے اور وہ وہیں گر کر بیہوش ہو گئی۔۔۔ مگر اس اجاڑ اور ویران گھر کے پچھلے لان میں وہ تینوں اپنی ہی دھن میں گانے بجانے اور ناچنے میں مگن تھے۔۔۔ ان کے ہاتھوں پہ بنے ٹیٹوز کے آکوں میں بھرا گلابی رنگ اور میکپ کے پروں پہ لگا نیلا رنگ چمک رہا تھا۔۔۔ لال آندھی تیز ترین ہوتی گئی اور تین پتی کی سب سے بڑی ٹریل کا جشن دیر رات تک جاری رہا۔۔۔